قرآن مجید پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات کا مُسکت اور مُدلل جواب

بُرھَانُ التّفَاسِیر

لاِصلاح سلطان التفاسیر





تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

پبلیکیشنز
GUJRANWALA

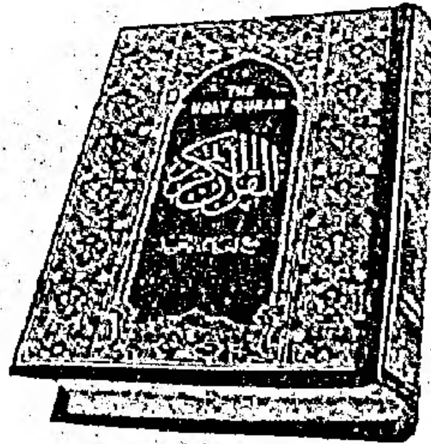
قرآن مجید پر عیسائیوں کے اعتراضات کا دندان شکن جواب

برھان التفاسیر

لإصلاح سلطان التفاسیر

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ



نام کتاب

برهان التفاسير

لإصلاح سلطان التفاسير

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

اشاعت اول .... جون 2011ء

قیمت ....

ام القریٰ پبلی کیشنز

سیالکوٹ روڈ فتومنڈ گوجرانوالہ 0321-6466422 0333-8110896

hasanshahid85@hotmail.com
www.umm-ul-qura.org


بسم الله الرحمن الرحيم

فہرس

حرفِ آغاز

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی صورت میں ایک کامل و اکمل اور عالمگیر دستور حیات اور ہر زمان و مکان کے لیے یکساں طور پر مفید نظام زندگی اور قدیم و جدید دور کے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے جامع اصول وضوابط نازل کر کے ان اصول و قواعد کی تشریح وتوضیح بھی حدیث پاک کی شکل میں خود نازل فرمائی ہے کیونکہ صاحب کلام ہی درحقیقت اس کے تقاضوں اور مفاہیم اور اس کے مصداق اصلی سے کماحقہ واقف ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ [القيامة: ١٧ تا ١٩]

''اس (قرآن کریم) کو آپ کے (قلب اطہر میں) جمع کرنا، اور آپ کو پڑھانا ہمارا کام ہے، اس لیے جب ہم پڑھ رہے ہوں تو آپ اسے غور سے سنتے رہیے، پھر اس کا بیان وتفسیر بھی یقیناً ہمارے ہی ذمہ ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن و حدیث کی شکل میں اسلامی شریعت کو نازل کر کے تاقیامت اس میں ہر قسم کی تحریف وتبدیلی سے اسے مامون ومحفوظ رکھنے کی ذمہ داری بھی خود ہی لے رکھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر: ٩]

''بے شک ہم نے اس ذکر (مبارک) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے

محافظ ہیں۔‘‘

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں ﴿الذِّكْرَ﴾ سے مراد ’’قرآن اور حدیث‘‘ دونوں ہیں۔ یعنی شریعت اسلامی (قرآن و حدیث) بکمالہ منزل من اللہ اور قیامت تک کے لیے مامون و محفوظ ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بہر نوع یعنی حفظ کتاب، ضبط صدر اور بذریعہ تعامل اور تعلیم و تعلّم اس کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا بندوبست اور انتظام کیا ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنة

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

جب سے یہ سرچشمہ نور (دین اسلام) دنیا میں آیا ہے اسی وقت سے گمراہ فکریں اور اسلام دشمن قوتیں اس نور ہدایت کو بجھانے اور اس کی عظمت کو گہنا کرنے کی سعی ناتمام میں ہمہ وقت مشغول و مصروف ہیں، مختلف اسالیب اور حربے بروئے کار لانے کے لیے اپنی صلاحیتیں، وقت اور مال کا ضیاع کر رہے ہیں اور دنیا و آخرت کی نامرادیاں اور ناکامیاں اپنے سر لے کر ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ کا مصداق بن رہے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [الصف: ٨]

’’کفار اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اپنے نور کو تمام کرے گا، گرچہ یہ چیز کفار کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔‘‘

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

جب بھی کسی نے قرآن کریم یا حدیثِ رسول مقبول ﷺ پر اعتراض یا تنقید کی اور لوگوں کو وحی الٰہی کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کرنا چاہا تو اس کی یہ مذموم حرکت ؂

تُف بسوئے فلک بروئے تو است [1]

کے مترادف ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے دین حق کی حفاظت کے لیے ہر دور میں ایسی نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیات کو پیدا کیا ہے جنھوں نے دفاعِ کتاب وسنت کے عظیم جہاد کو اپنا مقصدِ حیات بنا کر اس راہ میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور حفاظتِ دین حق کے لیے اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ گروہِ سعید اور بلند اقبال جماعت میں شامل ہونے کی ابدی سعادت حاصل کی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ [الفاطر: ٣٢]

''پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا۔''

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ماضی قریب میں خدامِ دین حنیف کی اس سعادت مند جماعت کی نامور شخصیت کہ جنھوں نے مخالفینِ اسلام اور گمراہ فرقوں کا ہر محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تقریر وتحریر اور بحث ومناظرہ کے ذریعہ احقاق حق اور ابطال باطل کی ذمہ داری کو بڑی حسن وخوبی اور عمدگی کے ساتھ سرانجام دیا۔ اور ان کے معاصرین نے انھیں ''شیخ الاسلام، شیر پنجاب اور فاتح قادیان'' جیسے القاب سے نوازا، شیخ الاسلام ابو الوفاء، امام المناظرین مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں بے پناہ

[1] یعنی آفتاب پر تھوکنے والے کی تھوک اسی کے منحوس چہرے پر گرتی ہے۔

صلاحیتوں اور گوناگوں خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنے دور کے ”فرید العصر“ اور ”وحید الدہر“ شخصیت تھے۔

ان کے بارے میں اس دور کی بلند پایۂ علمی شخصیت حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اگر رات کو دنیا میں کوئی نیا فرقہ پیدا ہوجائے تو ثناء اللہ صبح اٹھ کر اس کا جواب دے سکتا ہے۔“ (بزم ارجمنداں، ص: ۱۶۶)

انھوں نے قرآن کریم پر وارد شدہ آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے اعتراضات کے منہ توڑ اور دندان شکن جوابات دیے۔ اس سلسلے میں ان کے عیسائیوں اور آریاؤں اور دیگر اسلام دشمن نظریات کے ساتھ مناظرے اور ان کی تصانیف حق پرکاش بجواب ستیارتھ پرکاش، تقابل ثلاثہ، بطش قدیر بر قادیانی تفسیر اور برہان التفاسیر اور ان کے جاری کردہ اخبارات میں ان کے مضامین آج بھی ریکارڈ پر ہیں جو کتاب اللہ کے دفاع میں اس عظیم مجاہد کی مساعی جمیلہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اسی طرح حدیثِ رسول مقبول ﷺ کے دفاع میں ان کے مناظرہ جات، ان کی تحریریں اور تصانیف مثلاً دلیل الفرقان بجواب اہل القرآن اور اس سلسلے میں ان کی دیگر تحریریں اور مضامین جو کہ رسائل اور کتب کی صورت میں شائع ہوچکے ہیں۔

علاوہ ازیں دین اسلام پر وارد شدہ عمومی اعتراضات کے جواب میں ”ترک اسلام“ ”جوابات نصاریٰ“ ”اسلام اور مسیحیت“ اور دیگر تصانیف، اور اسی طرح پیغمبر اسلام رحمت عالم ﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں یاوہ گوئی کرنے والے ملعون ہندو کی بدنام زمانہ کتاب ”رنگیلا رسول“ کا جواب رسول اللہ کے اس شیدائی اور محبت صادق نے جس عقیدت و محبت کے ساتھ تحریر کیا اور ”مقدس رسول“ کے نام پر اپنے پیارے حبیب اور نبی مکرم ﷺ کی ذات اقدس کا بھرپور دفاع کیا اس دور میں اس کی

نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی مرحوم لکھتے ہیں:

’’مولانا ثناء اللہ صاحب نے یہ رسالہ (مقدس رسول) لکھ کر مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے۔‘‘ (تذکرۂ ابو الوفا، ص: ۸۹)

اور شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ اسی رسالہ کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ (تذکرہ ابو الوفاء، ص: ۸۹)

شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ کی جملہ تصانیف تقریباً یک صد تینتیس (۱۳۳) ہیں۔ شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ کی اسلام اور پیغمبر اسلام کے دفاع کے لیے عظیم الشان خدمات اور قابل قدر مساعی جمیلہ پر تمام مکاتب فکر کے علما اور دانشور حضرات نے انھیں زبردست تحسین پیش کیا ہے۔ چنانچہ مصر کے ممتاز مذہبی سکالر علامہ رشید رضا مصری فرماتے ہیں:

’’مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ برصغیر ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔‘‘

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے زبان کھولی اور قلم اٹھایا، ان کے حملے کو روکنے کے لیے ان کا قلم، شمشیر بے نیام ہوتا تھا، اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انھوں نے عمر بسر کر دی۔ مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد تھے۔ زبان اور قلم سے جس نے بھی حملہ کیا اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا وہ آپ ہی ہوتے۔‘‘

(یاد رفتگان بحوالہ سیرت ثنائی، ص: ۴۱۸)

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’آپ بڑے ذہین اور روشن دماغ تھے۔‘‘

علامہ شورش کاشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپ فاتح قادیان تھے۔''

مولانا ظفر علی خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپ پر حاضر جوابی ختم تھی۔''

(سیرت ثنائی، ص: ۱۸)

اور مولانا ابو علی اثری (رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ) شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان (مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ) کا کوئی حریف ہی نہیں تھا۔ انھوں نے آریوں سے بڑے معرکے، مناظرے کیے اور ہمیشہ کامیابی کا سہرا ان کے سر رہا، آریوں کے پیہم مقابلہ و مناظرہ ہی کی وجہ سے وہ ''شیر پنجاب'' کے پر ہیبت نام سے مشہور ہو چکے تھے اور واحد مناظر اسلام کی حیثیت سے ملک کے ہر حصے میں جاتے تھے اور آریوں کے اپدیشکوں کا نہتا مقابلہ کرتے تھے اور کامیاب لوٹتے تھے۔''

(تذکرہ ابو الوفاء، ص: ۸)

مؤرخ اہلحدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''وہ (مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ) بہترین مقرر بھی تھا اور بلند پایۂ مناظر بھی، دینی علوم کے ماہر بھی اور غیر اسلامی ادیان سے باخبر بھی، مصنف بھی تھے اور محقق بھی، مفسر بھی تھے اور ماہر حدیث بھی، اصولی بھی تھے اور عالم فقہ بھی، کلامی بھی تھے اور فلسفی و منطقی بھی، اور اپنے خاص انداز میں سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے اور ملکی مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔''

(بزم ارجمنداں، ص: ۱۴۳)

اور یہ حقیقت ہے کہ ایسی یکتائے روزگار اور عبقری شخصیات صدیوں بعد ہی پیدا ہوتی ہیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدۂ ور پیدا

شیخ الاسلام، فاتح قادیان حضرت امرتسری رحمہ اللہ نے قادیانی متنبّی کا مرتے دم تک تعاقب کیا، جھوٹی نبوت کے دعویدار اور اس کے متبعین سے بے شمار مناظرے کیے اور قادیانیت کے رد میں چھتیس (۳۶) کتب و رسائل تصنیف کیے، حتی کہ آپ ہی کے ساتھ مباہلہ کے نتیجہ میں وہ اپنے انجام کو پہنچا۔

قادیانی متنبّی مرزا غلام احمد نے ۱۵/اپریل ۱۹۰۷ء کو مباہلہ کا اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا: ''مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ'' اور اس میں لکھا تھا: ''مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت بدنام کیا، میرے قلعے کو گرانا چاہا...وغیرہ، اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں مرجائے۔''

(تذکرہ ابوالوفا، ص: ۹۶)

چنانچہ مرزا صاحب ۲۶/مئی ۱۹۰۷ء کو چل بسے (یعنی اس مباہلہ کے ایک ماہ اور دس یا گیارہ دن بعد) اس موقع پر مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے لکھا تھا:

لکھا تھا کاذب مرے گا پیشتر
کذب میں پکا تھا پہلے مر گیا

لیکن ''شیر پنجاب'' ''فاتح قادیان'' شیخ الاسلام مولانا امرتسری اس مباہلہ کے بعد چالیس برس تک بقید حیات رہے اور دین اسلام کی بھرپور خدمت میں مصروف رہے، حتی کہ اسّی (۸۰) سال کی عمر میں ۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ کو سرگودھا میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ رحمه الله رحمة واسعة وأدخله في فسيح جناته.

مولانا کا صدقۂ جاریہ ان کے پوتے گرامی قدر جناب عرفان اللہ ثنائی صاحب آج بھی سرگودھا میں سکونت پذیر اور مرکزی جمعیت اہلحدیث سرگودھا کے ضلعی امیر ہیں۔

زیر نظر کتاب ''برہان التفاسیر'' بھی کتاب اللہ کے دفاع میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی ایک بہترین کاوش اور سعی جمیل ہے۔

استاذ المناظرین مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ کا تبصرہ:

شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ کے قابل اعتماد شاگرد اور جانشین کہ جن کی پُر جوش اور مدلل تقریر سن کر ''شیر پنجاب رحمہ اللہ'' نے انھیں تھپکی دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''میرے بعد مخالفین اسلام سے نپٹنے کے لیے اور میدانِ مناظرہ میں انھیں زیر کرنے کے لیے بحمد اللہ احمد دین موجود ہوگا۔''

(مولانا احمد دین گکھڑوی، مصنفہ مولانا محمد اسحاق بھٹی، ص: ۱۷۹)

استاذ المناظرین مولانا احمد دین رحمہ اللہ ''برہان التفاسیر'' کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''علاوہ ازیں پادری صاحب (سلطان محمد) نے عیسائیوں میں عالی مرتبہ حاصل کرنے کے لیے اپنے اخبار میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی اور اس کا نام ''سلطان التفاسیر'' رکھا۔ شیر پنجاب مولانا ثناء اللہ نے اخبار اہل حدیث میں اس کا جواب دینا شروع کیا اور اس کا نام ''برہان التفاسیر'' رکھا۔ پہلے پارے کے چوتھے حصے تک پہنچ کر پادری صاحب نے اپنے قلم کو نیچے ڈال دیا اور تفسیر کے سلسلے کو بند کرتے ہوئے عذر کیا کہ مجھے ''بواسیر'' کا عارضہ ہوگیا ہے، اس لیے میں تفسیر کو بند کرتا ہوں، چنانچہ مولانا موصوف نے اخبار میں شائع کیا کہ ''ناظرین ''اخبار اہل حدیث'' میں جو مسلسل طور پر ''برہان التفاسیر'' بجواب ''سلطان التفاسیر'' پڑھا کرتے تھے وہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے کیونکہ پادری صاحب کو بواسیر ہوگئی ہے۔ الخ'' (مولانا احمد دین گکھڑوی، ص: ۱۶۶)

''سلطان التفاسیر'' عیسائیوں کے ماہانہ رسالہ ''المائدۃ'' میں شائع ہوتی تھی بلکہ وہ اسی غرض سے جاری کیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ نے بڑے خوبصورت انداز میں سلطان محمد پادری صاحب کی علمی حیثیت بھی واضح کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:

''سلطان محمد پادری ایک افغان عربی دان ہیں۔'' (برہان، ص:۷۳)

اور تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہے:

''سلطان التفاسیر میں حل لغات بھی ہے، ترجمہ بھی، اقوال مفسرین بھی ہیں، بظاہر قرآن کی تعریف بھی ہے، لیکن مقصد ان سب باتوں سے وہی ہے کہ یہ قرآن کوئی الہامی کتاب نہیں، جو کچھ اس میں خوبی ہے وہ بائبل سے ماخوذ ہے، ساتھ ہی اس کی سندِ روایت کے لحاظ سے قرآن کوئی مستند کتاب بھی نہیں۔'' (برہان، ص:۷۷)

چنانچہ شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ نے ''برہان التفاسیر'' میں انھیں امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ''سلطان التفاسیر'' کا انتہائی مدلل اور دندان شکن جواب دیا ہے۔ موصوف پہلے پادری صاحب کا اعتراض نقل کرتے اور پھر ''برہان'' کے نام سے اس کے اعتراضات کا منصفانہ اور نہایت ہی شائستہ انداز میں محاکمہ کرتے اور دلائل کی قوت سے اس کا رد کرتے ہیں، اور پادری صاحب کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کی تارِ عنکبوت کو خاک میں ملا دیتے ہیں، جسے دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ؎

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

مولانا کی یہ عظیم علمی کاوش کے انمول موتی اکیاسی (۸۱) قسطوں میں اخبار اہل حدیث کے اوراق میں بکھرے پڑے تھے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد مستقیم سلفی صاحب جو کہ ایک جید عالمِ دین، کہنہ مشق مدرس اور ممتاز صاحبِ قلم ہیں اور مرکز دعوۃ الجالیات (جماعت اہل حدیث) کویت کے رئیس محترم جناب عارف جاوید محمدی

صاحب سے ان کے دیرینہ، گہرے اور دوستانہ مراسم ہیں، مولانا مستقیم صاحب نے جناب محمدی صاحب کو بتایا کہ انھوں نے ''اہل حدیث امرتسر'' کی پرانی فائلوں سے تلاش کر کے شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی تفسیر ''برہان التفاسیر بجواب سلطان التفاسیر'' کی اکیاسی (۸۱) اقساط جمع کر لی ہیں، محترم عارف جاوید صاحب چونکہ سلف صالحین کے علمی جواہر پارے جمع کرنے کے بے حد مشتاق اور اسلاف کی علمی کاوشوں کی سراغرسانی اور ٹوہ میں لگے رہتے ہیں، مولانا مستقیم صاحب کی اس کاوش پر عش عش کر اٹھے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی سی ڈی (C.D) انھیں ارسال کریں تو مولانا نے وہ سی ڈی ان کو ارسال کی۔

محترم عارف صاحب نے جب اس کی اطلاع اہل علم کے انتہائی قدردان اور خدمت انسانی کے علمبردار اور سلف صالحین کی علمی تراث کے احیاء کے لیے غایت درجہ حریص ذی وقار شخصیت جناب ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ (رئیس لجنۃ القارۃ الھندیۃ۔کویت) کو دی تو انھوں نے فوراً اس کی طباعت واشاعت پر موافقت فرمائی تو محترم عارف جاوید صاحب نے مولانا محمد مستقیم صاحب سے اس کی کمپوزنگ کے لیے درخواست کی۔ اس طرح مولانا مستقیم صاحب نے مؤقر جریدہ اہل حدیث امرتسر کے تابندہ صفحات میں بکھرے ہوئے علمی گلہائے رنگارنگ کا ایک شاندار گلدستہ سجا کر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل علم اور متلاشیانِ حق کو اس سے استفادہ کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس کار خیر میں کسی طرح سے بھی حصہ ڈالنے اور تعاون کرنے والوں کو بہترین جزا سے نوازے اور مؤلف رحمہ اللہ سمیت سبھی کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم العلم والعلما

عبدالخالق محمد صادق۔کویت۔

۱۱/۴/۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

برصغیر ہند میں گزشتہ صدی میں جن شخصیتوں نے ہمہ جہت اسلامی خدمات انجام دیں ان میں شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ (۱۸۶۸ - ۱۹۴۸ء) کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تقریر ومناظرہ، صحافت، انجمنوں اور تنظیموں کی تشکیل اور دیگر رائج الوقت وسائل واسالیب کے ذریعہ اسلام اور اسلامی شریعت کی ایسی خدمت کی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہ محض عقیدت یا جذبات کی بات نہیں ہے بلکہ مولانا کی حیات وخدمات پر نظر رکھنے والے اور ان کے چھوڑے ہوئے علمی ورثہ کی جانکاری رکھنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔

آپ نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں وہ مغربی استعمار کا عہد تھا۔ مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی اور حکومتی زوال وانحطاط کا زمانہ تھا بلکہ دینی ومذہبی اعتبار سے بھی مسلمان خطرات سے گھرے ہوئے تھے۔ عیسائیوں، آریوں، قادیانیوں، نیچریوں، حدیث کے انکاریوں اور دیگر تحریکات باطلہ سے وابستہ اشخاص نے اسلام اور مسلمانوں کو ہدف تنقید بنا رکھا تھا۔ ایسے نازک وقت میں اسلام کے سپاہی بن کر مولانا میدان میں اترے، اور جملہ اعدائے اسلام کے لیے شمشیر بے نیام ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب وسنت کے ٹھوس علم کے ساتھ حکمت وبصیرت اور ایسی فراست سے نوازا تھا کہ مخالفین اسلام وسنت کے مشکل سے مشکل سوالات واعتراضات کا فی الفور معقول ومؤثر جواب دیتے کہ مخالف بغلیں جھانکنے لگتا۔

زیر نظر کتاب مولانا کے دفاع عن القرآن کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو اصل میں مولانا کے مجلّہ ''اہل حدیث'' امرتسر میں شائع اکیاسی (۸۱) قسطوں پر مشتمل

تحریر ہے۔ یہ تحریر سلطان محمد (پال) عیسائی پادری کی تحریر کا جواب ہے۔ سلطان صاحب نے اسلام ترک کر کے عیسائیت کے دامن میں پناہ لی تھی، انھوں نے حالت اسلام میں عربی اسلامی تعلیم حاصل کی تھی اور اسلامی مآخذ پر ان کی نظر تھی، اس علم دانی کے زعم میں انھوں نے قرآن کی ایک تفسیر بنام ''سلطان التفاسیر'' لکھنے کا پروگرام بنایا۔ ایک مرتد عن الاسلام قرآن کی تفسیر کیوں کر لکھے گا؟ قرآن کی خدمت اور قرآنی تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے، یا اس کی آڑ میں قرآن کو نشانہ بنانے اور اس میں شکوک و شبہات تلاش کرنے کے لیے؟ اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ جنھوں نے ہر باطل کی تردید اور بیخ کنی گویا اپنا مشن بنا لیا تھا وہ کلام الٰہی پر ہونے والے اس منصوبہ بند حملے پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ فوراً انھوں نے اس نام نہاد تفسیر کے تعاقب کا پروگرام بنا لیا۔

آپ ۶ رمئی ۱۹۳۲ء کے ''اہل حدیث'' کے شمارے میں لکھتے ہیں:

''سلطان التفاسیر بصورت رسالہ المائدہ جنوری ۳۲ء سے جاری ہے، ہمارے دل میں اسی وقت سے جواب دینے کا القا ہوا تھا، لیکن اتنے دنوں تک ہم نے انتظار کیا کہ رسالہ مذکورہ کے چند نمبر نکل لیں تو توجہ کی جاوے گی، چنانچہ آج سلسلہ ہذا کا نمبر اول ہے، آئندہ حسب تجویز ایک صفحہ اخبار (اہل حدیث) اس سلسلہ کے لیے وقف کیا جائے گا، اس کا نام یہی ہوگا:

''برہان التفاسیر برائے اصلاح سلطان التفاسیر''۔ (برہان، ص:۷۶)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''چونکہ پادری صاحب نے ایک ماہوار عیسائی رسالہ ''المائدہ'' کی معرفت تھوڑا تھوڑا حصہ تفسیر کا شائع کرنا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے خیال ہوا کہ اگر اس تفسیر کے خاتمہ تک جنبش قلم کو بند رکھا جائے تو اتنے عرصہ تک زندگی کا کیا اعتبار؟ نیز اتنا بڑا کام دفعتاً کرنا محال ہوگا، اس

لیے ۶؍مئی ۳۲ء سے ہم نے پادری صاحب کے پیچھے اشہب قلم دوڑا دیا۔ مسلم قلم اتنے زور سے دوڑا کہ پادری صاحب کے برابر جاملا، یہاں تک کہ پادری صاحب نے کسی خاص مانع کی وجہ سے ''المائدہ'' میں مضمون شائع کرنا ترک کر کے اعلان کر دیا کہ.........''۔ (برہان، ص: ۲۹۰)

پادری صاحب کی تفسیر کا سلسلہ بیچ میں رک گیا تو اس اثناء میں مولانا نے کچھ جدید فرقوں کی تفسیروں کی طرف توجہ فرمائی اور ان کا جائزہ لیتے رہے تا آنکہ سلطان التفاسیر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا، بیچ میں اس تفسیر کا سلسلہ جب بھی موقوف ہوتا مولانا بے چینی سے اس کے دوبارہ جاری ہونے کا انتظار کرتے اور جاری ہونے پر فوراً اس کا محاسبہ شروع کر دیتے تا آنکہ اس سلسلہ کی اکیاسی (۸۱) قسطیں اخبار اہل حدیث میں شائع ہوئیں، جس کے آخر میں مولانا لکھتے ہیں:

''(نوٹ) اطلاع: چونکہ پادری سلطان محمد خاں صاحب کی طرف سے تفسیر القرآن کا مضمون تین مہینوں سے نہیں آیا اس لیے سردست دونوں صفحات (جو برہان التفاسیر کے لیے وقف تھے) اکمل البیان کو دیے جاتے ہیں تاکہ یہ جلد ختم ہو''۔ (اہل حدیث امرتسر: ۲۷ رصفر ۱۳۵۴ھ مطابق ۳۱ رمئی ۱۹۳۵ء، ص: ۱۱) [کتاب ہذا کا آخری صفحہ]

اور لگتا ہے کہ سلطان صاحب یہ سلسلہ اس کے بعد جاری نہ رکھ سکے، اس لیے برہان التفاسیر بھی اسی قسط پر موقوف ہوگئی، اتنے حصے میں مولانا نے قرآن کے پہلے پارے کی مکمل تفسیر پیش کی اور سلطان التفاسیر کا جائزہ لیا۔

اس تفسیر میں مولانا کا طرز یہ رہا کہ پہلے ایک رکوع کا ترجمہ مع مختصر توضیح تحریر فرماتے، اس کے بعد کبھی کبھی حل لغات اور نحوی ترکیب بھی رقم فرماتے، بعد ازاں سلطان التفاسیر اور دیگر کتابوں میں اس رکوع کے ترجمہ وتفسیر سے متعلق جو تسامحات واغلاط ہوتے ان کی اصلاح فرماتے، کبھی کبھی مولانا کا ترجمہ وتوضیح ہی اعتراضات

کے جواب کو متضمن ہوتا، اس لیے اسی پر اکتفا کرتے۔

کتاب کے قارئین دیکھیں گے کہ مولانا نے جواب نویسی میں تفسیر، اصول تفسیر، علوم القرآن، حدیث، اصول حدیث، ادب، بلاغت، نحو وصرف اور دیگر فنون کی کتابوں سے جابجا استناد کیا ہے، اس کے علاوہ مختلف فرق ضالہ جدیدہ کے لٹریچر اور مروجہ توریت وانجیل کے مشتملات پر مولانا کی گہری نظر کا بھی یہ کتاب منہ بولتا ثبوت ہے۔ اردو کے ساتھ عربی وفارسی اشعار وامثال کے برمحل استعمال پر بھی مولانا کو خوب قدرت حاصل ہے، چونکہ مقابل میں ایک عیسائی مصنف ہے اور اس نے جابجا انجیل کو درست وبرتر اور قرآن کو غلط اور کم تر ثابت کرنے کی ناروا کوشش کی ہے اس لیے مولانا معترض کے اعتراض کے قرآن پر عدم انطباق کو ثابت کرتے ہوئے اسے انجیل پر منطبق کردیتے ہیں اور انجیل کے مختلف مقامات کی عبارتیں نقل کرکے وہی اعتراض اس پر چسپاں کرتے ہوئے گنگناتے ہیں کہ ''ایں گناہیست کہ درشہر شما خاص کنند''۔

ابطال وتردید کے موضوع میں عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جواب دہندہ سے متانت وسنجیدگی اور وقار کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور وہ معترض کے لب ولہجے اور تیز وتند حملے سے مشتعل ہوکر بسا اوقات غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ واسالیب کا استعمال شروع کردیتا ہے، اور کبھی کبھی تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش میں حد درجہ سطحیت پر اتر جاتا ہے، لیکن مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی طویل دفاعی خدمات میں ایسی کوئی چیز نہیں نظر آتی، چاہے ان کی تحریر ہو یا تقریر، مناظرہ ہو یا مباحثہ، اسلامی فرقوں سے ہو یا اعدائے اسلام سے، ہر جگہ وہ پوری متانت، وقار اور شائستگی کا پیکر نظر آتے ہیں۔ فریق مخالف کی سخت سے سخت گفتگو سننے کا حوصلہ اور برداشت کرنے کا سلیقہ آپ کے خصوصی اوصاف میں سے ہے۔

زیر مطالعہ کتاب کے صفحہ (۲۴۸) پر مولانا کی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''ناظرین! پادری صاحب کو سوامی دیانند کی طرح قرآن مجید پر نکتہ چینی کا شوق نہیں شغف ہے، اس لیے آپ بے دردی سے اعتراض کر دیتے ہیں، ہم بھی ان کو اس میں معذور جانتے ہیں، بلکہ درخواست کرتے ہیں ؎

تیر پر تیر چلاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے''

ایک مقام پر پادری صاحب کے کچھ اعتراضات اور اغلاط کی اصلاح کے بعد فرماتے ہیں:

''نوٹ: ہم پادری صاحب کی طرح زود رنج نہیں کہ مخاطب کی ذرا سی لغزش پر آپے سے باہر ہو جائیں اور کہہ دیں کہ ہمارے قابل التفات نہیں۔ (النجات: ۱۵ ر اکتوبر ۳۴ء، ص: ۲) نہ ہم قادیانیوں کی طرح ہیں کہ پادری سلطان محمد صاحب کی غلطیوں پر ان کو مرتد، جاہل جیسے مکروہ الفاظ سے یاد کریں۔ (الفضل: ۱۵ ر اگست ۳۱ء) بلکہ ہمارا وہی اصول ہے جو ہر اہل علم کا ہے: "لکل جواد کبوۃ، ولکل عالم هفوۃ" (ہر گھوڑا گرتا ہے اور ہر عالم بھولتا ہے)۔'' (برہان، ص: ۳۶۷)

مولانا کی یہ روش برہان التفاسیر کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ آپ کی تمام تحریریں اسی وقار و شائستگی اور اعتدال و توازن کا آئینہ ہیں۔ افسوس کہ آج یہ روش نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، بحث و مباحثہ تحریری ہو یا تقریری، اپنوں سے ہو یا غیروں سے، ارباب زبان و قلم بڑی جلدی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور غیر شریفانہ لب و لہجہ اختیار کر بیٹھتے ہیں، نوجوان نسل کی رگ حمیت خاص طور سے ذرا جلدی پھڑکتی ہے اور اگر خاطر خواہ تربیت سے آراستہ نہ ہو تو اشتعال میں آکر اس سے گفتار و کردار کے ایسے نمونے سامنے آتے ہیں جن میں اسلام اور اہل اسلام کی بدنامی

اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، امید ہے کہ علامہ امرتسری کی اس کتاب اور ان کی دیگر تحریروں سے نئی نسل اس باب میں بھی استفادہ کرے گی۔

واضح رہے کہ مولانا امرتسری کی یہ عظیم الشان تصنیف جو آپ کے ہفتہ وار رسالہ ''اہل حدیث'' امرتسر میں تقریباً تین سال کے وقفے میں اکیاسی قسطوں میں شائع ہوئی، اب تک کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آسکی تھی۔ اللہ تعالی جزائے خیر دے لجنۃ القارۃ الہندیۃ، احیاء التراث الاسلامی، کویت کے ذمہ داران کو، جنہوں نے اس جانب توجہ فرمائی۔ ان حضرات کے مشورے سے محترم مولانا عبد اللہ سعود صاحب سلفی، ناظم اعلی جامعہ سلفیہ، بنارس، الہند نے مولانا محمد مستقیم صاحب سلفی، استاذ جامعہ سلفیہ ومؤلف کتاب ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' کو یہ کام سپرد کیا۔ موصوف نے ''اہل حدیث'' کی پرانی فائلوں سے ان تمام قسطوں کو اکٹھا کیا، جو تصفیف وتصحیح کے مراحل سے گزر کر طباعت واشاعت کے مرحلے کی منتظر ہیں۔ امید ہے کہ یہ انتظار بہت جلد ختم ہوجائے گا اور مولانا امرتسری کی مساعی جمیلہ کا یہ بیش بہا مجموعہ اسلامی کتب خانوں کی زینت بنے گا۔

اللہ رب العزت مؤلف کی اس خدمت کو شرف قبول بخشے اور اسے ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اور کتاب کی اشاعت کے محرک، اس کے مرتب، مصحح، طابع وناشر اور مستفیدین کو اجر جزیل سے نوازے۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

اسعد اعظمی

جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس، الہند

۲۷/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ/۳/مارچ ۲۰۱۱ء

مقدمہ

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ (۱۸٦۸ـ ۱۹۴۸ء) اعاظم رجال میں سے تھے جو پوری نصف صدی تک ہر اس قوت کے سامنے سینہ سپر رہے جس نے دین اسلام اور پیغمبر اسلام پر حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اسلامی علوم وفنون میں ژرف نگاہی اور جولانی قلم کی بے پناہ خوبیوں سے نوازا تھا جس کی بدولت آپ نے ہر سطح پر دفاعِ دین کے میدان میں لازوال خدمات سرانجام دیں۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی خدمات جلیلہ اور مساعی جمیلہ کا دائرہ تو بہت وسیع ہے لیکن سردست زیرِ نظر کتاب کی مناسبت سے دو موضوعات پر بعض گزارشات پیش کی جائیں گی: ① قرآنی خدمات۔ ② تردید عیسائیت۔

① قرآنی خدمات:

مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے تمام عمر قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور اگر کبھی کسی طرف سے اس کتاب مقدس پر کوئی نازیبا حملہ ہوا تو خداداد صلاحیتوں کی بدولت اس کا بھرپور تعاقب کیا۔

چنانچہ اس ضمن میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے قرآن مجید کی مستقل تفاسیر بھی رقم فرمائیں اور غیر مسلم حضرات کی جانب سے قرآن کریم پر وارد کردہ اعتراضات اور شکوک وشبہات کی بیخ کنی کی خاطر بھی کئی کتب تصنیف کیں۔

خود مولانا امرتسری رحمہ اللہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''چوتھی شاخ میری تصنیفات کی تفسیر نویسی ہے۔ یوں تو میری سب

تصنیفات قرآن ہی کی خدمت میں ہیں، مگر خاص تفسیر نویسی سے بھی غافل نہیں رہا۔ روزانہ درس قرآن کے علاوہ پہلے میں نے ''تفسیر ثنائی'' غیر مسبوق طرز پر اردو میں لکھی جو آٹھ جلدوں میں ختم ہو کر ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد بلکہ ساتھ ساتھ ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' خاص طرز پر عربی میں لکھی، جس کی ملک میں خاص شہرت ہے۔'' (فتنۂ قادیانیت اور مولانا امرتسری، ص: ۴۰)

مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود قرآن حکیم کی چار تفسیریں لکھی ہیں، جن میں سے دو عربی زبان میں اور دو اردو زبان میں ہیں۔

ذیل میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی تفاسیر اور دیگر کتب متعلقہ قرآن مجید کا مختصر تعارف درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ تفسیر ثنائی:

یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں متعدد بار طبع ہو کر کافی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کے مجموعی صفحات پندرہ سو (۱۵۰۰) سے زائد ہیں۔ اس تفسیر کی پہلی جلد ۱۳۱۴ھ = ۱۸۰۵ء میں منظر عام پر آئی اور ۲۹ر رمضان ۱۳۴۹ھ = ۱۸ر فروری ۱۹۳۱ء کو اس تفسیر کی آٹھویں جلد شائع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

اس تفسیر کے سببِ تالیف میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''میں نے یہ اس لیے لکھی ہے کہ اردو تفاسیر اس سے پہلے کسی قدر طویل ہیں کہ ان سے لوگ مستفید نہیں ہو سکتے، اس لیے ایک مختصر تفسیر لکھ دی جائے تا کہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔''

(تفسیر ثنائی: ۱/۳، طبع ثالث، ۱۳۵۲=۱۹۳۳ء)

اس تفسیر کی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عوام و خواص میں اسے بے حد مقبولیت

حاصل ہوئی۔

تفسیر شروع کرنے سے قبل مولانا نے ایک طویل اور پرمغز مقدمہ رقم فرمایا ہے جس میں صاحبِ قرآن حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور اس کے دلائل کا بڑی وضاحت سے بیان ہے۔

تفسیر میں مولانا کا طریقہ یہ ہے کہ ایک کالم میں قرآن مجید کا متن نقل کر کے دوسرے کالم میں اس کا با محاورہ ترجمہ اور ساتھ ہی اسی کے درمیان مختصر اور مناسب تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ مولانا کے ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ربط آیات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ترجمہ نہایت سلیس، شگفتہ، رواں، مطلب خیز اور عام فہم بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''چونکہ میری غرض اصلی اس تحریر سے صرف یہ ہے کہ عوام اہل اسلام قرآن کریم کے مطالب سے واقف اور آگاہ ہوں، اس لیے میں نے ترجمہ کرتے ہوئے الفاظ عربیہ کی پابندی نہیں کی ہے، یعنی یہ نہیں کہ جو لفظ پیچھے ہو اس کا ترجمہ بھی پیچھے کروں بلکہ عربی محاورہ کو ہندی محاورہ میں لایا ہوں۔ اس امر کی بھی پابندی نہیں کی کہ جملہ اسمیہ کا ترجمہ اسمیہ ہی میں ادا کروں، بلکہ مطلب اس کا جس جملہ میں باعتبار محاورہ اردو کے پایا ادا کر دیا ہے۔ بعض جگہ ''واؤ'' کو سرِ کلام سمجھ کر اس کا ترجمہ نہیں کیا۔ غرض جو کچھ کیا وہ اسی غرض سے کیا کہ اردو میں با محاورہ کلام ہو۔'' (تفسیر ثنائی: ۱/ ۱۶)

یہی وجہ ہے کہ تفسیر کے علاوہ صرف ترجمہ کو بھی بڑا قبولِ عام حاصل ہوا۔ مولانا کی وفات کے بعد مولانا محمد داود صاحب راز دہلوی رحمہ اللہ اسے تفسیر سے علیحدہ کر کے قلیل عرصہ میں تقریباً دس بار طبع کرا چکے ہیں۔

ترجمہ کے ساتھ مولانا نے آیات کی جو تفسیر لکھی ہے اس میں بھی ربط آیات

پر کافی توجہ کی ہے۔ مولانا نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

''میرا یہ طرز بیان پہلے اردو تفاسیر میں نہیں آیا جس نے اختیار کیا وہ میرے بعد غالبًا دیکھ کر کیا ہے۔''

ترجمہ اور تفسیر کے نیچے مولانا نے بہت سے قیمتی حواشی اور نوٹس بھی لکھے ہیں جن میں قرآنی تعلیمات کی تشریح کی گئی ہے۔ آیات کے شان نزول کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بہت سے طویل طویل حاشیوں میں مخالفینِ اسلام کے اعتراضات بھی رفع کیے گئے ہیں۔ ایک بہت بڑی خصوصیت ان حواشی کی یہ بھی ہے کہ ان میں جگہ جگہ سرسید کی ''تفسیر القرآن'' پر منظّم انداز میں تفصیل سے تنقید اور ان کی ''نیچریت'' پر گرفت کی گئی ہے۔ دور حاضر کے بعض مفسرین کے ہفوات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تفسیر منفرد طرز کی مالک بن گئی ہے۔

آخر میں اس تفسیر کی بابت یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مباحث میں مولانا نے اپنے اجتہاد سے کام لیا ہے، جس سے سب کا اتفاق کرنا ضروری نہیں جیسا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے بھی ثنائی ترجمہ والے قرآن مجید کے مقدمہ میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: حیات ثنائی، ص: ۵۴۸)

۲۔تفسیر بالرائے:

مولانا امرتسری رحمہ اللہ خود لکھتے ہیں:

''تفسیر کے متعلق چوتھی کتاب موسومہ ''تفسیر بالرائے'' لکھی۔ اس میں تفسیر بالرائے کے معنی بتا کر مروجہ تفاسیر و تراجم قرآن (قادیانی، چکڑالوی، بریلوی اور شیعہ وغیرہ) کی اغلاط پیش کر کے ان کی اصلاح کی گئی۔ اس کا بھی ایک حصہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ باقی زیر غور ہے۔''

افسوس کہ مولانا کی یہ تفسیر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۸ء

میں مطبع ثنائی امرتسر میں ہوئی جو ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے لکھنے کا منشا وہی ہے جو مولانا نے خود سطورِ بالا میں واضح کر دیا ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کے وقت اسلام کے خلاف خود مسلمانوں میں نت نئی جو تحریکیں جنم لے رہی تھیں وہ قرآن مجید کو خصوصیت کے ساتھ نشانہ بنا رہی تھیں، اپنے باطل نظریات و خیالات کے لیے قرآنِ کریم ہی سے مواد فراہم کر کے عامۃ المسلمین کو اپنے دامِ تزویر میں پھانس رہی تھیں، جن میں قادیانیت، شیعیت، بریلویت بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر مولانا نے آئندہ نسلوں کو ان تفاسیر کی گمراہیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ''تفسیر بالرائے'' لکھی، جس میں حسبِ ذیل تفاسیر کا جائزہ لیا ہے:

۱۔ تفسیر القرآن از جناب سر سید احمد خاں مرحوم۔

۲۔ تفسیر بیان للناس از مولوی احمد الدین امرتسری۔

۳۔ ترجمہ وحواشی قرآن مجید از مولوی عبداللہ چکڑالوی۔

۴۔ تفسیر القرآن بآیات الفرقان، مولوی حشمت علی لاہوری۔

۵۔ ترجمہ وتفسیر قرآن از ڈپٹی عبداللہ خاں لاہوری۔

۶۔ تفسیر خزینۃ العرفان از مرزا غلام احمد قادیانی۔

۷۔ متفرق تفسیری نوٹ از مرزا بشیر الدین محمود۔

۸۔ تفسیر بیان القرآن، مولوی محمد علی لاہوری۔

۹۔ تفسیر ایقان، شیخ بہاء اللہ ایرانی۔

۱۰۔ ترجمہ وحواشی قرآن مجید، مولوی مقبول احمد شیعی۔

۱۱۔ تذکرہ علامہ عنایت اللہ مشرقی۔

۱۲۔ عام فہم تفسیرِ قرآنی خواجہ حسن نظامی دہلوی۔

۱۳۔ تفسیر کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، مولوی احمد رضا خاں بریلوی۔

۱۴۔ خزائن العرفان فی تفسیر الفرقان مولوی نعیم الدین مراد آبادی۔
۱۵۔ تفسیر آیات، مفتی محمد الدین وکیل گجراتی۔

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد عزیر شمس حفظہ اللہ اپنے مقالہ ''مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی تفسیری خدمات'' میں لکھتے ہیں:

''چونکہ یہ کتابیں اس زمانہ میں عام طور پر متداول تھیں اور ان کے ذریعے لوگوں کے ذہن میں غلط نظریات راہ پا رہے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ ان کا تنقیدی جائزہ لے کر حق و باطل کو واضح کیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہترین صلاحیت، وسیع مطالعہ، نیز اسرارِ شریعت سے مکمل واقفیت اور مخالفین کے دلائل پر کامل اطلاع ضروری تھی، یہی وجہ ہے کہ چند ہی لوگ اس میدان میں آئے اور انھوں نے بھی صرف بعض ہی کتابوں کی غلطیاں واضح کیں، ہمہ گیر انداز میں تنقید کے لیے کسی نے قلم نہیں اٹھایا، مگر مولانا امرتسری رحمہ اللہ چونکہ تمام شرائط سے بہرہ ور تھے، اس لیے انھوں نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لیا اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی حد تک اسے نباہ لے گئے۔''

(حیات ثنائی، ص: ۵۴۶، نیز دیکھیں: مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ، مختصر حالات اور تفسیری خدمات از مولانا عبدالمبین ندوی، ص: ۵۸)

۳۔ تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن:

یہ مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی عربی تفسیر ہے، جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اس میں آپ نے قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید کی آیات سے کی ہے۔ یہ غالباً اسلام میں پہلی تفسیر ہے جو اس اصول پر استوار کی گئی ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے، حالانکہ یہ اصول ''القرآن یفسر بعضہ بعضاً'' نظری حیثیت سے علمائے

کرام میں مدتوں سے مسلم ہے، مگر تحریری صورت میں کسی نے یہ انداز اختیار نہیں کیا تھا، اس بنا پر یہ تفسیر بہت سی خصوصیات کی حامل ہے، سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تفسیر جلالین کی طرح اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مولانا اس تفسیر کی وجہ تالیف میں فرماتے ہیں:

''علمائے کرام نے قرآن مجید کی مختلف انداز پر تفسیریں لکھی ہیں، بعضوں نے احادیث و آثار سے استفادہ کیا ہے اور کچھ حضرات نے اپنی عقل کا سہارا لیا ہے، حالانکہ تمام حضرات اس پر متفق ہیں کہ سب سے بہتر کلام اللہ کی تفسیر خود آیاتِ ربانی سے کرنا ہے، چنانچہ میں نے اسی طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔'' (تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، طبع اول، ص: ۸، طبع دوم، ص: ۱۰)

اصل تفسیر شروع کرنے سے پہلے مولانا نے طبع اول میں مختصر اور طبع دوم میں قدرے مفصل مقدمہ لکھا ہے، جس میں امام رازی (م ۶۰۶ھ) امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) اور امام شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) وغیرہم کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے تفسیر بالرائے، تفسیر کی صحت کے معیار اور شان نزول پر اظہار خیال کیا ہے اور اپنے طریقہ تفسیر کی وضاحت کی ہے۔ آیات کی مکمل توضیح آیات سے کی ہے۔ بعض مسائل کی تشریح حواشی میں احادیث نبویہ سے کی ہے، اور بعض مقامات پر اپنی تفسیر کی تائید دوسری تفاسیر اور کتب سے کی ہے اور اس کا حوالہ حواشی میں دیا ہے۔ نیز اختلافی مسائل کی بھی حواشی میں نشاندہی کی ہے۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: حیات ثنائی، ص: ۵۵۰، تذکرہ ابو الوفاء، ص: ۵۹)

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن جب شائع ہوئی تو مصر کے رسائل ''الاہرام'' اور ''المنار'' نے اس پر جامع تبصرہ لکھا۔ (ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات، ص: ۲۴)

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) نے لکھا:

"تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن اس قابل ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر لیا جائے۔" (معارف، جلد:۲۴، نمبر:۴، ص:۲۱۶)

چنانچہ مولانا محمد ابو القاسم بنارسی (م ۱۳۶۸ھ) نے اپنے مدرسہ سعیدیہ بنارس میں اسے داخل نصاب کر لیا تھا۔ (حیات ثنائی، طبع دہلی، ص:۵۵۱)

اس کتاب کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۳۲۱ھ = ۱۹۰۳ء میں مطبع اہلحدیث امرتسر سے پانچ سو آٹھ (صفحات) میں شائع ہوا، جبکہ دوسرا ایڈیشن بعض اضافہ جات کے ساتھ ۱۳۴۸ھ = ۱۹۲۹ء میں آفتاب برقی پریس سے چارسو دو (۴۰۲) صفحات میں شائع ہوا۔ بعد ازاں اس کی تصویری طباعت ایک بار ادارہ احیاء السنہ گرجاکھ گوجرانوالہ کی طرف سے بھی عمل میں آئی۔

اس تفسیر کے چند مقامات پر بعض علمائے اہلحدیث کی طرف سے کچھ (۴۰) اعتراضات سامنے آئے جس نے ایک طویل نزاع کی صورت اختیار کر لی۔ بالآخر جلسہ آرہ (۱۹۰۴ء) میں علمائے اہلحدیث کی ایک کمیٹی نے بعض (۱۴) اعتراضات کو صحیح قرار دیا اور اکثر اعتراضات کو بیجا اور غلط قرار دیا۔

اسی سلسلے کی ایک مصالحتی مجلس میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اپنی اس کتاب کی بعض غلطیوں کو تسلیم کیا اور فرمایا:

> "بمقام آرہ میرے حق میں میری "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" کے بعض مضامین کی وجہ سے علمائے اہلحدیث ہندوستان نے جو فیصلہ صادر فرمایا ہے، میں اس کو مانتا ہوں اور میرا عمل درآمد اس پر رہے گا۔ اگر اس کے علاوہ میری کوئی غلطی، خلاف اصول محدثین اہلسنت والجماعت ہو، ثابت کی جاوے گی تو مجھ کو اس کے مان لینے میں اور رجوع کرنے میں بھی تأمل وعذر نہ ہوگا۔" (حیات ثنائی، ص:۲۱۶)

مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی وسعتِ ظرفی کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے:

''کسی مصنف کا اپنی تصنیف کو اغلاط سے پاک جاننا ضمناً گویا دعوائے نبوت کرنا ہے جو کسی طرح جائز نہیں، اسی لیے میں تو ہمہ تن گوش رہا کرتا ہوں کہ کسی طرف سے میری غلطی پر مجھے تنبیہ آئے تو میں اصلاح کروں۔''

(ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر، ۲۹/ مئی ۱۹۳۱ء، حیات ثنائی، ص: ۱۹۴)

خصوصاً ان کی ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے متعلق ایک سائل نے انھیں لکھا:

''جناب مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ صاحب۔زاد عنایتکم۔ السلام علیکم۔ گزارش ہے کہ امرتسری نزاع کی وجہ سے جو جماعت اہلحدیث میں تفرقہ پیدا ہو، آپ کو اس کا علم ہے۔ الحمدللہ کہ اصحابِ مدراس کی توجہ سے وہ نزاع مدراس ہی میں دفن ہوگئی۔ تاہم بعض اصحاب کا آپ کی نسبت یہ سوال باقی ہے کہ تفسیر عربی میں جو اغلاط رہ گئے ہیں، خواہ وہ حسبِ رائے منصفانِ آرہ چودہ ہی ہوں، ان کی بابت آپ کی کیا رائے ہے اور آپ ان کو کیا کرنا چاہتے ہیں؟ جواب تسلی بخش عنایت کریں تاکہ بقیہ تفرقہ بھی دور ہو جائے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔ (خاکسار عبدالکریم سفیر مدرسہ سلفیہ غزنویہ شاگرد مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ امرتسر)

الجواب:

''وعلیکم السلام۔ جیسا کہ آپ نے امرتسری نزاع کے خاتمہ پر الحمدللہ لکھا ہے، میں بھی شکراً وحمداً کہتا ہوں، اور ساتھ ہی اس کے اصحابِ مدراس کے حق میں، جن کی توجہ ہی سے یہ فساد ختم ہوا، دعائے خیر کرتا ہوں۔ جزاہم اللہ۔

''مولوی صاحب! آپ کو معلوم ہوگا کہ اصل جھگڑا اغلاط کے وجود پر نہ تھا، کیونکہ غلطی کا محض وجود اس قابل نہیں کہ کوئی مصنف اس سے انکار

کرے۔ عربی کے مشہور مقولہ ”لکل جواد کبوۃ ولکل عالم هفوۃ“ کے موافق غلطی سے کون خالی ہے؟ ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ پس اغلاط کی بابت تو میرا یہی عقیدہ ہے کہ میں غلطی سے مبرا نہیں۔ میری تفسیر کیا کوئی تفسیر بھی غلطی بلکہ اغلاط سے خالی نہیں۔ ہاں فریق ثانی نے ان اغلاط پر جو فتویٰ اخراج میرے متعلق لگایا، میں نے اس کا جواب دیا تھا۔ چنانچہ منصفان آرہ نے بحمد اللہ اس فتویٰ کو غلط ثابت کیا اور صاف لکھا کہ تفسیر کی یہ اغلاط ہرگز اس قابل نہیں کہ مصنف کو خارج از اہل حدیث سمجھا جائے۔ مدراس میں بھی اسی فیصلہ پر رضا مندی ہوگئی تھی۔ رہی میری تفسیر کی مذکورہ اغلاط سو میں طبع ثانی کے وقت غور کر کے ان کی تصحیح یا اصلاح کر دوں گا۔ ان شاء اللہ۔ بلکہ ان کے سوا اور بھی کوئی غلطی از خود مجھے یا کسی صاحب کے بتانے سے معلوم ہوگئی تو اس کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

''چنانچہ میں فیصلہ مطبوعہ کے صفحہ (۵۱) پر بھی لکھ چکا ہوں کہ قبل میری تصحیح کرنے کے جو صاحب مقامات متنازعہ میں فریق ثانی کے معنی کو صحیح جانتے ہیں وہ ابھی سے میری عربی تفسیر کے حاشیہ پر اس کو لکھ لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اللہ الموفق (ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسری)

[اہلحدیث ۲۸/شعبان ۱۳۲۰ھ]

اسی بنا پر جب مذکورہ بالا کتاب کا چوتھا ایڈیشن نہایت آب و تاب کے ساتھ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی زیر نگرانی مکتبہ دارالسلام الریاض کی طرف سے ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تو اس سے وہ تمام اغلاط نکال دی گئیں جن کو نکالنے کا مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اظہار کیا تھا۔

دیکھیں: تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، طبع دارالسلام ریاض (کلمہ تنبیہ از مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ، ص: ۱۷۔۲۱)

۴۔تفسیر بیان الفرقان علی علم البیان:

یہ تفسیر ۱۳۵۳ھ= ۱۹۳۴ء میں ثنائی پریس امرتسر میں طبع ہوئی۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اسے پہلے دو جلدوں میں لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر دوسری جلد بوجوہ نہ لکھ سکے اور صرف پہلا ہی حصہ چھپ کر رہ گیا، جو سورۂ بقرہ کی اخیر تک کی تفسیر پر مشتمل اور ۶۰ رصفحات لمبی تقطیع پر محیط ہے۔

تفسیر کے آخر میں مولانا نے لکھا ہے: ”والجلد الثاني يأتي إن شاء الله“ یعنی دوسری جلد بھی ان شاء اللہ (آئندہ) شائع ہوگی۔

(بیان الفرقان علی علم البیان: ۱/ ۶۰)

مگر شاید حالات نے انھیں اس طرف دوبارہ توجہ کرنے کا موقع نہ دیا۔ اور اس طرح یہ ایک مفید سلسلہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ تاہم یہ تفسیر بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا نے اس کے شروع میں ایک علمی و تحقیقی مقدمہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

”تفسیر کے عموماً چار طریقے ہیں:

اول: یہ کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے، اس کی مثال میری کتاب ”تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن“ ہے۔

دوم: یہ کہ احادیث مرفوعہ اور آثار موقوفہ کی روشنی میں تفسیر کی جائے، اس کی مثال ”تفسیر ابن کثیر“ ہے۔

سوم: یہ کہ متکلمین کا اندازِ بیان اختیار کیا جائے، اس طریقہ کی ایک مثال میری ”تفسیر ثنائی“ (اردو) ہے۔

چہارم: یہ کہ عربی ادب اور علومِ لسانیہ، لغت، صرف ونحو، معانی و بیان وغیرہ کو پیشِ نظر

رکھ کر تفسیر کی جائے۔ میری یہ تفسیر ''بیان الفرقان علی علم البیان'' اسی طریقۂ کار کا نمونہ ہے۔'' (بیان الفرقان علی علم البیان: ۱/۲)

مولانا نے اس میں علومِ عربیہ صرف، لغت، معانی و بیان کو ملحوظ رکھتے ہوئے تفسیر کی ہے۔ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت اور معجز بیانی کے لیے یہی زبان سب سے زیادہ مناسب و موزوں تھی، تاکہ لوگوں کے دلوں پر اس کی عظمت و اعجاز کا نقش قائم ہو، جس کی طرف عام مفسرین نے کم توجہ کی تھی، اس لیے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو اس میں زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں علم معانی و بیان کے ۱۷۲ اصول و قواعد کا ذکر کیا ہے، حواشی میں ان سب کی مثالیں قرآن مجید سے پیش کی ہیں، تفسیر کے اندر انھیں قواعد کی طرف نمبروں کے ذریعہ اشارہ کر دیا ہے، جیسا کہ ''بیان الفرقان علی علم البیان'' کے متعلق جناب فضیلۃ الشیخ مولانا محمد عزیز شمس حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''مولانا کا یہ طریقہ ہے کہ سورۃ کے شروع میں اس کے تمام مضامین کا بالاجمال ذکر کر دیتے ہیں، تاکہ قاری ان تمام باتوں پر مطلع ہوجائے جن کی طرف سورت میں اشارہ کیا گیا ہے، بعض مقامات پر عربی و فارسی کے اشعار بھی بطور استشہاد نقل کر دیتے ہیں، جو پہلی جلد (صفحہ: ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۶، ۲۴، ۳۵، ۴۱، ۴۵، ۴۹، ۵۷) پر دیکھے جا سکتے ہیں۔''

(حیات ثنائی، ص: ۵۵۴، حاشیہ نمبر ۳۸)

ضرورت کے وقت احادیث و آثار حتی کہ تورات سے بھی استفادہ کیا ہے، گو کہ تفسیر کی عبارت بہت مختصر ہے، جو ''ما قل و دل'' کی مثال ہے، تاہم توضیح کی خاطر کہیں کہیں حواشی میں بھی بعض مسائل پر گفتگو کی ہے، اس لیے مطالعہ کرنے والے کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ مولانا نے یہ تفسیر فنی نقطۂ نگاہ سے لکھی ہے، تمام تفسیری مباحث سمیٹنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

مولانا نے اس میں [illegible] تفسیر بھی فرمائی ہے۔ مشہور و
اور مفسر حافظ [illegible] صاحب تفسیر آیات متشابہات نے قرآن
اللہ [illegible] کی تفسیر و ترجمہ [illegible] کی ہے۔
آیات متشابہات [illegible]

اس پر مولانا [illegible] تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"يا للعجب! من أين أخذ هذا المعنى الذي لا يساعده لغة ولا سياق، وأمثاله منه كثيرة، عفا الله عنه."

(بیان القرآن: [illegible])

یعنی تعجب ہے کہ (حافظ صاحب نے) کہاں سے یہ معنی لیا ہے جس کا ساتھ نہ لغت دیتی ہے نہ سیاق و سباق۔ اس طرح کی مثالیں اس تفسیر میں بہت ہیں۔ اللہ انھیں معاف کرے۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ، مختصر حالات اور تفسیری خدمات از مولانا عبدالمتین ندوی، ص:۴۸)

اب ذیل میں مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی ان کتب کا ذکر کیا جاتا ہے جو آپ نے عمومی طور پر تعلیم قرآن کے سلسلے میں لکھی تھیں۔

۵۔ آیات متشابہات:

اپنی عربی و اردو دونوں تفسیروں کے لیے بطور مقدمہ انھوں نے "آیات متشابہات" لکھی۔ یہ کتاب گویا اصول تفسیر کے متعلق مولانا کے خیالات کا خلاصہ ہے، جس سے قطع نظر کر کے کوئی شخص ان کے اصل نظریات سے واقف نہیں ہوسکتا۔ اسی سلسلہ میں ہم "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" اور "تفسیر ثنائی" کے دونوں مقدموں کا ذکر کر سکتے ہیں، جنھیں اگرچہ مستقل حیثیت حاصل نہیں مگر اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔
(حیات ثنائی، ص: ۵۴۲۔۵۴۳)

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی۔ (تذکرہ ابوالوفاء، ص: ۶۱)

۶۔ تعلیم القرآن:

یہ رسالہ ایک ملازمت پیشہ مسلمان کے سوال ''قرآن مجید ہم سے کیا چاہتا ہے؟'' پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مذہب کے اختلاف سے الگ ہو کر صرف قرآن مجید کی تعلیم کا نمونہ، خاص کر عقائد سے متعلق، بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب چوبیس (۲۴) صفحات پر مطبع آفتاب برقی امرتسر سے ۱۳۴۹ھ میں دوسری بار طبع ہوئی۔ (جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۹۵، ۹۶، حیات ثنائی، ص: ۵۷۲)

۷۔ الفوز العظیم:

قرآن مجید میں جو مختلف چیزوں کی قسمیں اٹھائی گئی ہیں، ان کی حکمتوں کے بیان اور ان کی عظمت و موعظت پر ایک نہایت ہی بیش قیمت کتاب ہے۔
(حیات ثنائی، ص: ۵۷۳)

۸۔ ثنائیہ قرآنی قاعدہ:

قرآن حکیم کی تعلیم میں ابتدائی قاعدوں کا بچوں کے ذہن کے موافق نہ ہونے سے ان کو بہت مشکل پیش آتی تھی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے یہ قاعدہ علامہ مرحوم نے تصنیف فرمایا جو بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے بہت ہی مفید ہے۔
(حیات ثنائی، ص: ۵۷۴)

اب ذیل میں ان کتب کا ذکر کیا جاتا ہے جو مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے قرآن مجید پر آریہ سماج کے اعتراضات کے جواب میں لکھی تھیں۔

۹۔ حق پرکاش بجواب ستیارتھ پرکاش:

۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی (بانی آریہ سماج) نے اپنی مشہور کتاب

''ستیارتھ پرکاش'' شائع کی۔ اس کے چودھویں باب میں قرآن کریم پر ایک سوانسٹھ (۱۵۹) اعتراضات کیے گئے۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''۱۸۹۹ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کا اردو ترجمہ شائع ہوا، جس کے ۱۴ویں باب میں سوامی جی نے قرآن کریم پر ۱۵۹ اعتراضات کیے۔ کتاب ستیارتھ پرکاش کے شائع ہونے پر مسلمانوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا جواب دیا جائے۔ حسب قول حافظ شیرازی ؎

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

''میں نے اس کے جواب میں کتاب ''حق پرکاش'' لکھی جو بفضلہ تعالیٰ ایسی مقبول ہوئی کہ اس کے بعد کسی فرقہ کے عالم نے ستیارتھ پرکاش کے جواب میں قلم نہیں اٹھایا۔ ذلك من فضل اللہ''

(ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر ۲۳ر جنوری ۱۹۴۳ء)

حق پرکاش کی اشاعت پر آریہ حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں آریہ کی طرف سے اس کا جواب دینے کی متعدد کوششیں کی گئیں مگر کوئی جواب بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے آریہ کے اعتراضات کا جواب رسالہ ''انوار الاسلام'' سیالکوٹ، میں شائع کرایا، اور اصل کتاب ''حق پرکاش'' میں بھی بعض اعتراضات کو ''مؤید'' کے عنوان سے نقل کر کے ان کا جواب دیا۔

علاوہ ازیں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''سوامی دیانند کا علم و عقل'' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی، جس میں ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب سے ان چند مقامات کی نشان دہی کی جن میں سوامی جی نے زبردست ٹھوکر کھائی ہے جس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ سوامی جی دوسرے مذاہب پر اعتراضات کرتے وقت زیادہ تحقیق و علم سے کام نہیں لیتے تھے۔ (حیات ثنائی، ص: ۵۹۴)

نیز سوامی دیانند کی تردید میں ''ہندوستان کے دو ریفارمر'' اور ''مرقع دیانندی'' کے نام سے بھی مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے دو کتابیں لکھیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں: جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۹۶، ۶۹۸)

حق پرکاش پہلی بار ۱۹۰۰ء میں دو سو چالیس (۲۴۰) صفحات میں شائع ہوئی، اور اب تک اس کے تقریباً دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۰۔ تُرکِ اسلام بجواب تَرکِ اسلام:

ایک شخص عبدالغفور بی۔ اے نے آریہ مذہب قبول کرنے کے بعد دھرم پال نام اختیار کر کے ۱۴/ جون ۱۹۰۳ء کو گوجرانوالہ میں ایک تقریر کی جس میں تفصیل کے ساتھ تبدیلیٔ مذہب کے وجوہات بیان کرتے ہوئے اس نے ایک سو پندرہ (۱۱۵) اعتراضات قرآن مجید پر کیے تھے۔ جو بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب انھیں اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب پہلی بار دو سو چالیس (۲۴۰) صفحات میں مطبع اہلحدیث امرتسر سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

(حیات ثنائی، ص: ۵۸۴، جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۹۳)

۱۱۔ رجم الشیاطین بجواب اساطیر الأولین:

مہاشہ دھرمپال نے ایک کتاب بنام ''اساطیر الأولین'' لکھی جس میں قرآن مجید کی چند آیات کا مذاق اڑایا۔ مولانا نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا، جس میں مہاشہ جی کے اعتراضات کا بھرپور جواب ہے۔

یہ کتاب پہلی بار مطبع ثنائی برقی امرتسر سے سولہ (۱۶) صفحات پر ۱۹۰۹ء میں طبع ہوئی۔ (جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۹۹)

۱۲۔تغلیب الاسلام بجواب تہذیب الاسلام:

یہ کتاب قرآن مجید پر ان اکیاسی (۸۱) اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہے جو مہاشے دھرمپال نے بذریعہ اپنی کتاب ''تہذیب الاسلام'' (جو چار جلدوں میں ہے) کیے تھے۔

یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸ر نومبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد مئی ۱۹۰۵ء میں، تیسری جلد اکتوبر ۱۹۰۵ء میں اور چوتھی جلد ۱۹۰۶ء کے ابتدا میں طبع ہوئی۔ (حیات ثنائی، ص: ۵۸۶)

علاوہ ازیں اسی دھرمپال کی کتاب ''نخلِ اسلام'' کے جواب میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''تبرِ اسلام'' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی۔ جس نے دھرمپال کے سارے شکوک وشبہات زائل کر دیے اور بقولِ دھرمپال ''ترکِ اسلام'' سے اپنی آخری تصنیف تک جس قدر کتابیں تھیں ان سب کو میں نے ۱۴ر جون ۱۹۱۱ء کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔'' (حیات ثنائی، ص: ۵۸۷)

اور بالآخر دھرمپال مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی پیشین گوئی کے مطابق دوبارہ مسلمان ہوگیا اور غازی محمود کے نام سے معروف ہوا۔

۱۳۔کتاب الرحمٰن بجواب کتاب اللہ وید ہے یا قرآن:

آریوں کے رد میں بڑی زبردست کتاب ہے۔ پنڈت دھرم بھکشو آریہ نے ''کتاب اللہ وید ہے یا قرآن؟'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو بد زبانی میں دھرمپال، سوامی دیانند وغیرہ سے کوسوں آگے تھے۔ اسی دلآزار انداز میں قرآنی تعلیمات پر وید کو ترجیح دی گئی تھی، آریہ سماج میں اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بقول مولانا ''ہر جگہ اور ہر مناظرہ میں اس کتاب کے مضامین پیش کیے جانے لگے۔''

(مقدمہ کتاب الرحمٰن، ص: ۳)

چنانچہ اس کے جواب میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''کتاب الرحمٰن'' تصنیف فرمائی، جس میں آریوں کے مزعومات کی زبردست تردید کی اور وید کی تعلیمات پر قرآنی تعلیمات کو قابل ترجیح قرار دے کر ویدک تعلیمات کو ناقابل عمل قرار دیا۔ اس رسالے میں آپ نے کلامِ الٰہی جانچنے کے لیے آریوں کے دس خانہ ساز اصولوں کا جائزہ لیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مولانا موصوف مناظرات کے استاذ ہیں اور اس رسالے کو بھی اپنے دلآویز مناظرانہ رنگ میں تالیف کیا ہے۔'' (معارف، اعظم گڈھ بحوالہ اہلحدیث ۱۰ر جولائی ۱۹۳۱ء)

یہ کتاب پہلی بر ۱۹۳۰ء میں ایک سو چوالیس (۱۴۴) صفحات پر شائع ہوئی۔
(دیکھیں: حیات ثنائی، ص: ۵۸۸۔ ۵۸۹)

۱۴۔ الہام:

اس رسالہ میں الہام کی تعریف کرتے ہوئے ''وید'' اور ''قرآن'' کے الہام کی تفسیر کی گئی ہے، اور ساتھ ہی دونوں کا فرق واضح کر کے قرآن مجید کی افضلیت ثابت کی گئی ہے۔ (جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۹۳، حیاتِ ثنائی، ص: ۵۹۲)

۱۵۔ الہامی کتاب:

یہ ایک مباحثہ کی روئیداد ہے جو ماسٹر آتما رام امرتسری مترجم ستیارتھ پرکاش و ایڈیٹر آریہ مسافر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے درمیان ''وید اور قرآن'' کے موضوع پر ہوا۔ یہ مباحثہ ۹۷۔ ۱۸۹۸ء میں آریوں کے ماہواری رسالہ ''آریہ مسافر'' جالندھر میں چھپتا رہا، یہ تحریری مباحثہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس میں ماسٹر آتما رام نے وید کو الہامی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی اور قرآن مجید کو الہامی کتاب ثابت کیا۔ (تذکرہ ابو الوفاء، ص: ۸۸، حیات ثنائی، ص: ۵۹۲)

۱۶۔ القرآن العظیم:

دسمبر ۱۹۰۷ء میں آریہ سماج کا سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد ہوا، جس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ مولانا نے ''القرآن العظیم'' کے نام سے ایک مقالہ تیار کیا مگر آریہ لیڈروں کی بدعہدی کی وجہ سے شریک جلسہ نہ ہوسکے تو آپ نے اس مقالہ کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس مقالہ میں قرآنِ کریم کا الہامی ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۷ء میں چوبیس (۲۴) صفحات پر شائع ہوئی۔

(تذکرہ ابوالوفاء، ص: ۸۱، حیاتِ ثنائی، ص: ۵۹۳)

۱۷۔ قرآن اور دیگر کتب:

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے ''قرآن اور دیگر کتب'' کے عنوان سے ایک لیکچر دیا تھا جس میں آپ نے وید، انجیل اور قرآن کا موازنہ کرتے ہوئے قرآن مجید کی برتری ثابت کی تھی۔ بعد میں یہ لیکچر کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

(تذکرہ ابوالوفا، ص: ۸۴)

۱۸۔ مجموعہ رسائل متعلقہ بوید وقرآن:

اس رسالے کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے سوانح نگاروں نے اسے بھی آپ کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔

(دیکھیں: حیاتِ ثنائی، ص: ۵۹۴، تذکرہ ابوالوفا، ص: ۹۲)

۱۹۔ مناظرہ دیوریا:

یہ کتاب اس مناظرہ کی روداد ہے جو مولانا امرتسری رحمہ اللہ اور پنڈت درشنانند عرف کرپا رام جگرانوی کے مابین مورخہ ۱۶ سے ۲۱/اگست ۱۹۰۳ء تک ہوتا رہا۔

موضوعِ مناظرہ یہ تھا کہ وید اور قرآن میں کون الہامی اور سچا ہے؟

یہ رسالہ پہلی بار ۱۹۰۳ء میں دوسو چوراسی (۲۸۴) صفحات میں طبع ہوا۔

(حیاتِ ثنائی، ص: ۵۹۵، تذکرہ ابوالوفاء، ص: ۷۶، جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۹۷)

۲۰۔ مباحثہ ناہن:

یہ رسالہ اس مباحثہ پر مشتمل ہے جو مقام ناہن میں مابین مولانا امرتسری رحمہ اللہ اور پنڈت بھوجدت آریہ مسافر ہوا تھا۔ موضوعِ مناظرہ یہ تھا کہ قرآن مجید الہامی کتاب ہے یا وید؟ اس رسالہ میں سوال و جواب کے عنوان سے فریقین کے دلائل موجود ہیں۔ (جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۹۸)

اب ذیل میں ان کتب کا ذکر کیا جاتا ہے جو مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے قرآن مجید کے متعلق مرزائیت کی تردید میں لکھیں۔

۲۱۔ بطش قدیر بر قادیانی تفسیر کبیر:

خلیفہ قادیان مرزا محمود احمد نے تفسیر قرآن کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ''تفسیر کبیر'' رکھا۔ اس کی ایک جلد (از سورۂ یونس تا سورۂ کہف) شائع ہوئی تو مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ مرحوم نے اس کے دس مقامات پر تعاقب کیا۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ اس رسالہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس تفسیر میں ایسی اغلاط ہیں کہ ان کو دیکھ کر میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ تفسیر بالرائے کی جلد ثانی طبع ہونے سے پہلے ہی میں اس دارِ فانی کو چھوڑ گیا تو خدا کے ہاں مجھے سوال ہوگا کہ یہ ضروری کام تم نے کیوں نہ کیا کیونکہ اس تفسیر میں اغلوطات اور تحریفات اس حد تک بھری ہیں جن کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر یہ شعر آجاتا ہے ؎

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر تیرے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

''قادیانی تفسیر کو دیکھ کر مؤلف اور اس کے اعوان و انصار کی نسبت صحیح رائے قائم ہوسکتی ہے۔ اس لیے میرے دل میں ڈالا گیا کہ تفسیر بالرائے کی جلد ثانی کا انتظار نہ کیا جائے، بلکہ بطور نمونہ چند اغلاط کا ایک رسالہ لکھا جائے۔''

اس تفسیر کے ساتھ میاں محمود کا یہ چیلنج تھا کہ ''میں قرآنی علوم کا ایسا ماہر ہوں کہ ہر مخالف کو ساکت کرسکتا ہوں۔'' (قادیانی تفسیر کبیر، ص: ۵۱۶)

مولانا امرتسری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان کے اس دعویٰ کی تنقید کے لیے یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔''

(بطش قدیر، ص: ۱۶)

یہ رسالہ پہلی بار مطبع ثنائی امرتسر سے ۱۹۴۱ء میں چونتیس (۳۴) صفحات میں شائع ہوا۔ حصہ دوم کا اعلان ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر (۲۰ ربیع الاخریٰ ۱۳۶۶ھ) میں شائع ہوا تھا لیکن افسوس کہ وہ کتاب منظر عام پر نہ آسکی اور ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ کا کتب خانہ نذر آتش ہوگیا۔

۲۲۔ تفسیر نویسی کا چیلنج اور فرار:

۱۹۲۵ء میں خلیفۂ قادیان مرزا محمود نے علمائے دیوبند کو تفسیر نویسی کا چیلنج دیا تھا، لیکن علمائے دیوبند میں سے کسی نے چیلنج قبول نہیں کیا، جب مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے حلقۂ دیوبند میں خاموشی دیکھی تو چیلنج کو قبول کرلیا لیکن آپ کا نام سن کر مرزا محمود قادیانی نے راہ فرار اختیار کی۔ اس رسالہ میں یہی تفصیلات جمع کی گئی ہیں۔

(جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۲۳۷، ۲۴۷، تذکرۂ ابوالوفا، ص: ۱۲۲)

اب ذیل میں اُن کتب کا ذکر کیا جاتا ہے جو مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے قرآن مجید کے متعلق عیسائیت کی تردید میں لکھیں۔

۲۳۔ تقابل ثلاثہ:

تقابل ثلاثہ کا شمار مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی مشہور تصانیف میں ہوتا ہے۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی یہ بلند پایہ تصنیف پادری ٹھاکر دت کی کتاب ''عدم ضرورتِ قرآن'' کے جواب میں ہے۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اس کتاب میں قرآن مجید کا تقابل تورات و انجیل کے ساتھ آیت بہ آیت (جدول میں) کیا ہے۔ اور تینوں کتابوں کے الہامی مضامین اصل الفاظ میں دکھا کر قرآن شریف کی برتری اور فضیلت ثابت کی ہے۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ہر صفحہ پر قرآن، تورات اور انجیل کے تحت جو احکامات آئے ہیں، ان کو پیش کیا ہے اور حاشیہ میں قرآن مجید کی آیات مع حوالہ درج کی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی یہ بہترین کتاب ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۱ء میں مطبع ثنائی امرتسر سے ایک سو اکاون (۱۵۱) صفحات میں شائع ہوئی۔ (تذکرہ ابوالوفا، ص: ٦٦)

۲۴۔ معارفِ قرآن بجواب حقائق قرآن:

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عرصہ ہوا عیسائیوں نے ایک ٹریکٹ شائع کیا تھا جس کا نام تھا: ''حقائق قرآن''۔ اس کا جواب اخبارِ اہلحدیث (مورخہ ۱۰ر صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۱۸ء) میں دیا گیا تھا۔ بعد ازاں اطراف و اکناف میں جہاں جہاں عیسائی ''حقائق'' کو بانٹتے، جواب کی مانگ آتی۔ اخباری مضمون

سب جگہ نہیں پہنچتا۔ اس لیے اس کو کتاب کی صورت میں کیا گیا۔‘‘

(جوابات نصاریٰ، ص:۲)

اس کتاب ’’حقائق قرآن‘‘ کے مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ از روئے قرآن ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام حضرت سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف نے ۱۴ دلائل ذکر کیے۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے انھیں دلائل کا جواب ’’معارف قرآن‘‘ کے نام سے دیا۔

۲۵۔ تشریح القرآن بجواب توضیح البیان فی اصول القرآن:

مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے یہ کتاب پادری برکت اللہ مسیحی کی کتاب ’’توضیح البیان فی اصول القرآن‘‘ کے جواب میں لکھی۔

۲۶۔ تفسیر سورۂ یوسف اور تحریفاتِ بائبل:

اس کتاب میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ عیسائی پادریوں نے ہر زمانہ میں بائبل میں تحریف کی ہے اور اس کا ثبوت بائبل کے مختلف ایڈیشنوں سے فراہم کیا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۴ء میں نوّے (۹۰) صفحات میں شائع ہوئی۔

(تذکرہ ابو الوفا، ص:۱۷)

۲۷۔ برہان التفاسیر لاصلاح سلطان التفاسیر:

اس کتاب کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں آ رہا ہے۔

علاوہ ازیں مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی ایک کتاب ’’قرآن اور دیگر کتب‘‘ کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے جس میں انجیل کے بالمقابل قرآنِ مجید کی برتری ثابت کی گئی ہے۔

اب ذیل میں اُن کتب کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے قرآن مجید کے متعلق دیگر حضرات کے جواب میں لکھیں۔

۲۸۔ دلیل الفرقان بجواب اہل القرآن:

اس رسالہ میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کے رسالہ ''برہان الفرقان'' کا جواب ہے۔ ''برہان الفرقان'' میں چکڑالوی صاحب نے نمازِ پنجگانہ قرآن شریف سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا نے اس رسالہ میں چکڑالوی صاحب کے خرافات کا جواب دیا ہے۔

یہ رسالہ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں چالیس (۴۰) صفحات میں شائع ہوا۔

۲۹۔ خاکساری تحریک اور اس کا بانی:

اس رسالہ میں خاکساری تحریک اور اس کے بانی علامہ عنایت اللہ المشرقی (م۱۳۸۴ء) کے مذہبی عقائد اور ان کی قرآنی تحریفات پر بحث کی گئی ہے اور ان کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

یہ علمی مضمون پہلے اخبار اہلحدیث امرتسر میں ۳ جون ۱۹۳۹ء تا ۶ / اکتوبر ۱۹۳۹ء چھپتا رہا۔ بعد ازاں اس کو ۱۹۳۹ء میں ایک سو دس (۱۱۰) صفحات میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ (تذکرہ ابوالوفا، ص: ۱۵۵)

۳۰۔ الکلام المبین فی جواب الأربعین:

آپ کی مایہ ناز تفسیر قرآن بزبان عربی ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے نام سے شائع ہوئی تو حضرت الامام مولانا سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ (م۱۳۳۱ھ) نے اس پر تعاقب کیا اور تفسیر میں چالیس (۴۰) اغلاط کی نشاندہی کی، اور اس کا نام ''الأربعين في أن ثناء الله ليس على مذهب المحدثين'' رکھا۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم نے ''الأربعین'' کے جواب میں ''الکلام المبین'' لکھی اور اس میں اپنا دفاع کیا۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی بہت سے تفسیری مباحث آگئے ہیں۔

علاوہ ازیں اسی سلسلے میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''فیصلہ آرہ'' اور ''فصل قضية الإخوان بذكر تفسير القرآن بكلام الرحمن'' کے نام سے بھی دو کتابیں لکھیں۔

۳۱۔فقہ دراصل قرآن ہے:

یہ کتاب مولوی ابو یوسف محمد شریف کوٹلی کے رسالہ ''فقہ دراصل حدیث ہے'' کے جواب میں ہے۔

(اہلحدیث امرتسر ۱۸ردسمبر ۱۹۳۱ء بحوالہ جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۹۵۷)

مذکورہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''اہلحدیث'' امرتسر میں بھی تعلیم قرآن اور دفاع قرآن کے ضمن میں بے شمار تحریرات رقم فرمائیں۔ضرورت ہے کہ ان کی ان تحریرات کو بھی منظر عام پر لایا جائے تاکہ فہم قرآن اور دفاع قرآن کے باب میں اہل علم ان سے استفادہ کرسکیں۔

② تردید عیسائیت:

۱۸۵۷ء میں عیسائیوں (انگریزوں) نے برصغیر میں مکمل سیاسی غلبہ حاصل کر لینے کے بعد اسلامی افکار وعقائد کے خلاف انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا، ان کے پادری پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دندناتے پھرتے تھے، اور ان کی تحریری وتقریری جارحیت سے پوری مسلم قوم بلبلا رہی تھی۔ چنانچہ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے اس طرف توجہ کی اور عیسائی پادری جو کہ ان پڑھ مسلمانوں کو ورغلا رہے تھے، ان کے سدّ باب کے لیے قدم اٹھایا، عیسائیت کی تردید میں مولانا مرحوم کی خدمات ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

''دورانِ تلاش سب سے پہلی قابل توجہ کتاب پادری ٹھاکردت کی تصنیف

''عدمِ ضرورتِ قرآن'' نظر آئی، جس کے جواب میں مَیں نے ''تقابل ثلاثہ'' (تورات، انجیل، قرآن) لکھی۔

''عیسائیوں کی کتاب ''عدمِ ضرورت قرآن'' کے جواب کے علاوہ میں نے متعدد کتابیں،ان کے جواب میں لکھیں جن کے مجموعے کا نام ''جواباتِ نصاریٰ'' ہے۔سب سے آخر میں عیسائیوں کے جواب میں وہ کتاب ہے جس کا نام ''اسلام اور مسیحیت'' ہے۔عیسائیوں کی طرف سے تین کتابیں بطرزِ جدید شائع ہوئی تھیں۔جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ عالمگیر مذہب اسلام ہے یا مسیحیت؟

۲۔ دین فطرت اسلام ہے یا مسیحیت؟

۳۔ توضیح البیان فی اصول القرآن۔

''ان تینوں کے جواب میں ''اسلام اور مسیحیت'' لکھی گئی، جو شائع شدہ ہے، جس نے شائع ہونے کے بعد اسلامی جرائد سے خراجِ تحسین وصول کیا۔''

(ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر ۲۳ر جنوری ۱۹۴۲ء، بحوالہ تذکرۂ ابو الوفا، ص: ۶۵، ۶۶)

اب ذیل میں ان کتب کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے عیسائیت کی تردید میں لکھیں۔

۱۔کلمہ طیبہ:

اس کتاب میں کلمۂ طیبہ ''لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ'' کی تشریح کرتے ہوئے بدلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی بشارتیں عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۱۴ء میں مطبع روز بازار امرتسر سے بیالیس (۴۲) صفحات میں شائع ہوئی۔ (جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۸۴)

۲۔تقابل ثلاثہ:

اس کتاب کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

۳۔توحید، تثلیث اور راہِ نجات:

عیسائیوں کی طرف سے عام طور پر جو مضامین شائع ہوتے وہ تین عناوین توحید، نجات اور کفارۂ مسیح پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان تینوں کی اصل حقیقت کو اس رسالے میں واضح کیا گیا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۱۴ء میں مطبع وزیر ہند امرتسر سے چالیس (۴۰) صفحات میں شائع ہوئی۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۸۵، تذکرہ ابوالوفا، ص: ۶۷)

۴۔حقائق قرآن:

اس کتاب کا تعارف گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔اثبات التوحید بجواب اثبات التثلیث:

یہ کتاب پادری عبدالحق کی تصنیف ''اثبات التثلیث'' کے جواب میں ہے۔

۶۔تم عیسائی کیوں ہوئے؟

یہ رسالہ پادری سلطان محمد پال، جو مسلم سے عیسائی ہوئے تھے، کی تصنیف کردہ کتاب ''میں مسیحی کیوں ہوا؟'' کے جواب میں ہے۔

پادری سلطان محمد سے مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کا ایک مناظرہ ۳/ستمبر ۱۹۲۸ء بمقام حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ ہوا تھا، جس میں پادری سلطان محمد نے چیلنج کیا کہ آپ میرے رسالہ کا جواب لکھیں۔ اگر آپ جواب لکھیں گے تو میں ''جواب الجواب'' لکھوں گا، مولانا نے جواب تو لکھ دیا، مگر پادری صاحب اس کا جواب نہ لکھ سکے۔ مولانا کی طرف سے کئی بار یاد دہانی بھی کرائی گئی، مگر پادری سلطان محمد نے

اپنے قول کی پاسداری نہ کی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: جواباتِ نصاریٰ، ص: ۴۷)

سابق الذکر تینوں کتابوں کے مجموعے کو مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''جواباتِ نصاریٰ'' کے نام سے شائع کیا۔

۷۔ اسلام اور پالی ٹکس:

اس مختصر رسالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آج دنیا میں انسانوں کو مختلف مذاہب والے خصوصاً عیسائی حضرات اپنے مذہب کی طرف بلا رہے ہیں لیکن ان کی نجات کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا، مگر اسلام جامع ہونے کی حیثیت سے سب کی نجات کی ذمہ داری لیتا ہے۔

یہ رسالہ پہلی بار ۱۹۳۰ء میں آٹھ (۸) صفحات میں شائع ہوا۔

۸۔ اسلام اور برٹش لا:

یہ رسالہ تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس میں انگریزی قوانین کے مدمقابل اسلامی قوانین کو ہر شعبہ میں افضل اور بہتر ثابت کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ مطبع اہلحدیث امرتسر سے ۱۹۰۵ء میں چھپن (۵۶) صفحات میں شائع ہوا۔

(جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۸۵، ۶۸۶)

۹۔ مناظرۂ الٰہ آباد:

یہ ایک تحریری مناظرہ کی روداد ہے جو مولانا امرتسری رحمہ اللہ اور پادری عبدالحق کے درمیان مسئلہ توحید و تثلیث کے موضوع پر ہوا تھا۔ اس مناظرہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عیسائی مناظر منطقی اصطلاحات بیان کرتے تھے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ اس کی وضاحت طلب کرتے تھے جو پادری صاحب پیش نہ کر سکتے، تو مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ خود ہی ان منطقی اصطلاحات کی تشریح عام فہم پیرایہ میں بیان کرتے۔ پھر

اس کا جواب دیتے۔ اس مناظرہ کا تعلیم یافتہ حضرات پر بہت اثر ہوا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس مناظرہ میں پادری عبدالحق کو اتنا زچ کیا کہ اس نے تنگ آ کر برملا کہہ دیا کہ ''کون کمبخت الوہیتِ مسیح کا قائل ہے؟''

پس اس کا یہ کہنا تھا کہ عیسائیوں میں کھلبلی مچ گئی کہ پادری صاحب نے کیا کہہ دیا ہے،؟ اس پر مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے پادری صاحب کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اور آخر یہ مناظرہ بڑی کامیابی سے اختتام پذیر ہوا۔ اس کتاب میں اسی مناظرہ کی مفصل روداد ہے۔

یہ رسالہ پہلی بار مطبع ثنائی امرتسر سے چوبیس (۲۴) صفحات میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ (تذکرہ ابو الوفا، ص: ۶۹، ۷۰، جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، ص: ۶۸۶)

۱۰۔ تشریح القرآن بجواب توضیح البیان:

اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

۱۱۔ مسیحیت کی عالمگیری پر ایک نظر:

یہ پادری برکت اللہ مسیحی کی کتاب ''مسیحیت کی عالمگیری'' کا جواب ہے۔

۱۲۔ دینِ فطرت اسلام ہے:

یہ کتاب بھی پادری برکت اللہ مسیحی کی تصنیف ''دینِ فطرت مسیحیت ہے'' کے جواب میں ہے۔

آخر الذکر تینوں کتابوں کو مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''اسلام اور مسیحیت'' کے نام سے ایک مجموعے کی شکل میں شائع کیا۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ اپنی اس کتاب ''اسلام اور مسیحیت'' کی بابت فرماتے ہیں:

''یہ کتاب ''اسلام اور مسیحیت'' عیسائیوں کی تین کتابوں کا جواب ہے، ان میں

ہر ایک کتاب اسلام اور قرآن کے حق میں بصورت جدید سخت ترین حملہ ہے، خدا نے محض اپنے فضل وکرم سے مجھے ان کا جواب دینے کی توفیق بخشی۔

''میں اپنے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہوں کہ اپنی جملہ تصانیف میں سے دو کتابوں کی نسبت مجھے زیادہ یقین ہے کہ خدا ان کو میری نجات کا ذریعہ بنائے گا، ان میں سے ایک کتاب ''مقدس رسول'' ہے، جو ''رنگیلا رسول'' کے جواب میں ہے، دوسری کتاب یہی ''اسلام اور مسیحیت'' ہے۔ پہلی کتاب میں مَیں نے بتوفیقہٖ تعالیٰ ذات رسالت مآب سے دفاع کیا ہے اور دوسری کتاب میں اسلام اور قرآن مجید سے مدافعت کی ہے، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں ؎

روزِ قیامت ہر کسے در دست گیرد نامہ
من نیز حاضر می شوم تائید قرآن در بغل

(اسلام اور مسیحیت، ص: ۳، طبع لاہور)

۱۳۔ تفسیر سورۂ یوسف اور تحریفاتِ بائبل:

اس کتاب کا تذکرہ بھی پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

۱۴۔ برہان التفاسیر لاصلاح سلطان التفاسیر:

اس کتاب کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔

سلطان التفاسیر اور اس کا مؤلف:

پادری سلطان محمد خاں (مؤلف سلطان التفاسیر) ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۳ء میں مسلمان سے عیسائی ہوگیا۔ عیسائی ہونے کے بعد اس نے ایک کتاب ''میں مسیحی کیوں ہوا؟'' لکھی جس کا جواب مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''تم کیوں عیسائی

ہوئے؟'' کے نام سے دیا۔ ذیل کی سطور میں پادری سلطان محمد خاں کا تعارف مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی مذکورہ کتاب ''تم کیوں عیسائی ہوئے؟'' سے پیش کیا جا رہا ہے۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمارے مخاطب پادری سلطان محمد خاں صاحب نے کتاب مذکور میں اپنی پیدائش اور ابتدائی زندگی کا جو حال لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے اور اگست ۱۹۰۳ء کو آپ مسیحی ہوئے۔ اس حساب سے بے وقت مسیحی ہونے کے آپ کی عمر مکمل ۲۲ سال تھی۔ اسی عمر میں آپ نے تعلیم حاصل کی اور ''انجمن ضیاء الاسلام'' بمبئی، میں قائم کی، جس کے آپ خیریت سے صدر تھے اور عبدالرؤف صاحب سکرٹری وغیرہ۔

(میں مسیحی کیوں ہوا، ص: ۳۔ ۱۸۔ ۴۶)

''آپ نے انجمن کے انعقاد کی تاریخ نہیں بتائی۔ ہاں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انجمن ضیاء الاسلام ۱۸۹۵ء میں قائم ہوئی تھی جو آج تک بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہے۔ اس حساب سے انجمن کے انعقاد کے وقت آپ کی عمر ۱۴ سال کی ہوگی۔ کوئی دانا اس کو کیونکر تسلیم کر سکتا ہے کہ چودہ سال کا لڑکا، وہ بھی غریب طالب علمی کی حالت میں، اتنی بڑی انجمن کی بنا قائم کر سکے؟

''ہمارا خیال تھا کہ پادری صاحب نے اپنی پوزیشن بڑی بتانے کو ایسا لکھا ہے تاکہ مسلمانوں پر میرا اثر ہو، اور عیسائیوں میں قدر۔ چونکہ اس سے دونوں قوموں کو دھوکہ لگنے کا اندیشہ تھا، اس لیے ہم نے ضیاء الاسلام کے سیکرٹری جناب مولوی عبدالرؤف خان صاحب کو خط لکھا کہ آپ پادری سلطان محمد صاحب کی بابت اصل حالات سے اطلاع دیجیے تاکہ پبلک کو اس سے آگاہ کیا جائے۔ مولوی صاحب موصوف کا مکرمت نامہ آیا جو

درج ذیل ہے:

''محترم مولانا صاحب! السلام علیکم۔ پوسٹ کارڈ کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ اس ہفتہ سلطان محمد کے مختصر حالات لکھ کر روانہ کروں گا، لہٰذا یہ مختصر حالات ہیں۔ کم و بیش کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔ جس طرح مناسب ہو آپ شائع کریں۔ جس رسالہ میں شائع ہوں چند کاپیاں مجھ کو روانہ فرمائیں تاکہ یہاں مشنریوں میں ان کو تقسیم کرادوں۔

''سلطان محمد صاحب کے حالات اختصار سے حوالہ قلم کرتا ہوں کہ انجمن ضیاء الاسلام ۱۸۹۵ء میں محض عیسائیوں اور آریوں سے تحریری اور تقریری بحث مباحثہ کرنے کو قائم ہوئی ہے، ایک سو سے زائد عیسائی، آریہ، پارسی وغیرہ کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں سلطان محمد کے قدم بہ غرضِ تعلیم منارہ والی مسجد میں آئے اور مسجد کی روٹیوں پر بسرِ اوقات کرنے لگا۔ چونکہ انجمن کے ہر ہفتہ جلسے ہوا کرتے تھے جن میں علاوہ مناظرہ اور مباحثہ کے تعلیم اور پولیٹکل مسائل پر بھی لیکچر وغیرہ ہوتے تھے۔ اس وقت مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا ابو نصر آہ برادر مولانا ابو الکلام آزاد، آغا حشر کاشمیری، مولانا سخا صاحب، مولانا سُہا صاحب، جناب ثاقب بدیوانی، رونق لکھنوی، مرزا نظامی، منشی امیر الدین وغیرہ حضرات تقریریں کیا کرتے تھے۔

''جلسوں میں شرکت کی غرض سے پادری ڈیوڈ، پادری اسمتھ، پادری فرنچ، پادری ٹیلر، پادری احمد شاہ جبلپوری، پادری جوزف بہاری لال، مسٹر منصورِ مسیح اور کئی دیسی مشنری آتے تھے۔ آریوں میں سے پنڈت جگناتھ، مسٹر خوشی رام، پنڈت شرما کے علاوہ کئی اور آریہ بھی آتے تھے۔

ممکن ہے سلطان محمد کسی کونے میں بیٹھ کر تقریریں سنتا ہو لیکن کسی جلسہ میں نہ کوئی تقریر کی، نہ کسی عیسائی اور آریہ سے مباحثہ مناظرہ کیا، نہ کوئی تجویز پیش کی، چونکہ سیکڑوں بلکہ ہزارہا آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا، اس میں انھوں نے محض شرکت کی ہو تو کی ہو، نہ ایسی مشہور و معروف ہستی تھی جس پر نظر پڑتی۔ اگر کوئی خاص بات اُن میں ہوتی تو مقامی اخبارات میں ذکر آتا، خاص کر انجمن کے ماہانہ پرچہ ''البلاغ'' میں ضرور ذکر آتا۔

''اب بھی میں ان کو چیلنج دیتا ہوں کہ کوئی تحریر ایسی پیش کریں کہ آپ بانی انجمن کب ہوئے؟ یا صدر انجمن کب ہوئے ہیں؟ دعوے سے کہتا ہوں کہ صدر اور نائب صدر تو کیا آپ ایک معمولی ممبر بھی نہ تھے۔ لعنة اللّٰه علی الکاذبین!

''اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۳ء میں جلسہ بند کر کے میں دورہ پر گیا تھا، جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ منارہ والی مسجد کا معمولی طالب علم عیسائی ہوگیا۔ تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ سلطان محمد، منصور مسیح کا بیٹا بن کر بپتسمہ لے کر ہمیر پور پادری احمد شاہ کانپوری کے پاس چلا گیا۔ منارہ والی مسجد کے طلبا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد کی روٹیوں کے لیے اکثر شکایت کیا کرتا تھا۔ کپڑے وغیرہ کی اس کو سخت تکلیف تھی۔ بعض میمنوں نے بلحاظ ہمدردی روپے قرض دیے تھے، بعض لوگ روپیوں کا تقاضا کرتے تھے جس کے سبب ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ منصور مسیح نہایت تجربہ کار اور چالاک مشنری تھا، اس نے اس کی ناداری اور غربت دیکھ کر ہمدردی کی۔ یہ اس کے مکان پر آنے جانے لگا اور اس نے اس کو ترغیب دی۔ یہ ناتجربہ کار اور شباب کا عالم۔ گرجائیں کی آمد و رفت کا منظر دیکھ کر از خود

رفتہ ہوا اور کسی خاص غرض سے عیسائی ہو کر یہاں سے چل دیا۔ ممکن ہے کہ اس کی دلی آرزو بر آئی ہو۔

''اس زمانہ میں ''الحق'' نامی عیسائیوں کا ایک پرچہ نکلتا تھا، اس میں غیروں کی مدد سے مضامین بایں طور لکھنے شروع کیے کہ میں بڑا حاذق حکیم ہوں، میں بڑا فاضل ہوں، بڑا دولتمند وغیرہ وغیرہ کا ایک سلسلہ چند روز تک جاری رکھا اور اپنے خداوندان کے خوش کرنے کی تدبیر نکالی۔ مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے اس کا جواب لکھ کر اڈیٹر ''الحق'' کو روانہ کیا۔ اڈیٹر صاحب نے دیکھا کہ اس مضمون سے تو سلطان کی سلطانی خاک میں مل جائے گی۔ تو اڈیٹر صاحب نے لکھا کہ ہم ذاتیات کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔

''میں عیسائیوں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوں کہ نئے مرید کو مولوی، قاضی، سید، حکیم، پنڈت وغیرہ وغیرہ لکھ کر اس کی شان بڑھاتے ہیں، لیکن جب اُس کی قلعی کھول کر تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے تو بغلیں جھانکتے ہیں۔ چنانچہ سلطان محمد کی بابت بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک معمولی طالب علم کے مضمون کو اہمیت دے کر دوسرے اخبارات میں شائع کرایا جائے۔

''تین چار سال بعد بڑے دنوں کی تعطیل میں وہ اپنے (مصنوعی) باپ منصور مسیح کو ملنے آیا، جن کا قرض تھا ادا کیا۔ بعدہ واپس کانپور چلا گیا۔ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ سلطان محمد مرتد سے مسلمان بن گیا۔ توحید کی تائید و ردّ تثلیث میں ایک رسالہ لکھا، جس کی ایک نقل ہمراہ خط کے روانہ کی اور خواہش کی کہ میں بمبئی آؤں۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا میں نے اس کو کوئی جواب

نہیں دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد سنا کہ سلطان محمد پھر مرتد ہوگیا، چونکہ جو آزادی عیسائیت میں ہے وہ اسلام میں کہاں؟ اس لیے دوبارہ مرتد ہو کر پادری صاحبان کو خوش کرنے کے لیے کوئی دوسرا رسالہ لکھا ہوگا جس کا آپ نے ذکر فرمایا۔ مجھ کو اس کا حال پادریوں کی معرفت معلوم ہوا تھا، مگر میں نے زیادہ جستجو نہ کی۔ خدا کا شکر ہے کہ شیر پنجاب نے اس کی طرف توجہ کی اور دندان شکن جواب دینے کے لیے قلم اٹھایا۔ خدا آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

''غالباً بمبئی کے حالات لکھنے کی اُس نے اس لیے جرأت کی ہوگی کہ زمانہ گزر گیا، انجمن ضیاء الاسلام والے مر مرا گئے ہوں گے، جو چاہوں لکھ کر پادریوں کو خوش کر دوں۔ یہ اس کو خبر نہ ہوگی کہ بفضلہٖ تعالیٰ میں زندہ ہوں۔ اور پادری جوزف بہاری لال، اگرچہ مشن سے علیحدہ ہیں تاہم وہ ابھی تک عیسائی ہیں، سلطان محمد کی طرح زر کے طالب نہیں ہیں، میرے بیان کی تصدیق کریں گے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے درست ہے۔
مجھ کو تعجب تو یہ ہوا کہ سلطان محمد مسیحی ہو کر سفید جھوٹ لکھنے پر کیوں دلیر ہوا؟ جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ آمین۔ (عبدالرؤف خان از بمبئی)''

(جواباتِ نصاریٰ، ص: ۸۷ تا ۹۰)

مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے پادری سلطان محمد خاں کے ساتھ بعض مناظرے بھی ہوئے جن میں پادری سلطان محمد خاں کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک مناظرہ ۲۷، ۲۸ر فروری ۱۹۲۶ء کو انجمن اہلحدیث گوجرانوالہ کے سالانہ جلسہ پر ہوا۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ''مسئلہ توحید'' پر تقریر فرمائی۔ جس پر عیسائیوں کو مناظرہ کا وقت دیا گیا۔ حاضری ۸، ۱۰ ہزار سے کم نہ تھی۔ بعض یورپین عیسائی بھی یہ

مناظرہ سننے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ فریق ثانی کی طرف سے پادری محمد سلطان پال مناظر تھے، جو نہ تو مولانا کے دلائل کے توڑ سکے اور نہ ہی کوئی معقول اعتراض کر سکے، چنانچہ ان کی اس شکست سے متاثر ہو کر ایک نوجوان عیسائی عین مناظرہ ہی میں مسلمان ہوگیا جس سے عیسائی بہت نادم ہوئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

(دیکھیں: حیات ثنائی، ص: ۶۵۳)

پادری سلطان محمد خاں کے ساتھ مولانا امرتسری رحمہ اللہ کا ایک مناظرہ ۲، ۳ر ستمبر ۱۹۲۸ء حافظ آباد میں بھی ہوا۔ پہلے دن عیسائیوں کی طرف سے پادری سلطان محمد پال پیش ہوئے، مگر جب وہ مولانا کے دلائل کی تاب نہ لا سکے تو دوسرے دن پادری عبدالحق پروفیسر این آئی یو ای کالج سہارن پور کھڑے ہوگئے۔ مناظرہ پہلے دن ''اسلامی توحید'' پر ہوا۔ اور دوسرے دن ''الوہیت مسیح'' پر، مگر دونوں مناظروں میں اہل اسلام کی فتح ہوئی اور عیسائیوں کو شکست فاش۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ عیسائی دو (۲) ماہ تک اس مناظرہ کا تذکرہ اپنے اخبار ''نور افشاں'' میں کرتے رہے اور چیختے چلاّتے رہے، کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے جو رپورٹ شائع ہوئی اس پر حافظ آباد کے ہندوؤں اور اور سکھوں کے دستخط بھی لے لیے گئے تھے کہ عیسائی مناظر کوئی معقول جواب نہیں دے سکے، اس لیے ضروری تھا کہ عیسائی سٹ پٹاتے، شور مچاتے اور پھر مناظرہ کا چیلنج دیتے، چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر اس کا نتیجہ کچھ برآمد نہ ہوا۔

(حیات ثنائی، ص: ۶۶۷، نیز دیکھیں: ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر (۱۴ر ستمبر ۱۹۲۸ء و ۱۶ر نومبر ۱۹۲۸ء) جوابات نصاریٰ، ص: ۳۷)

عیسائی مذہب کی انھیں خدمات کی بدولت پادری سلطان محمد خاں کا شمار نصرانیت کے سر برآوردہ پوادر میں ہونے لگا۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آج ہمارے ملک پنجاب میں اسلام کی تردید میں لکھنے والے عیسائیوں میں زیادہ شہرت یافتہ مندرجہ ذیل اصحاب ہیں: ① پادری سلطان محمد خاں

صاحب۔ ② پادری برکت اللہ صاحب۔ ③ پادری عبدالحق صاحب۔
④ مسٹر موسیٰ خاں ایڈیٹر ''المائدہ'' وغیرہ۔'' (اسلام اور مسیحیت، ص:۱۳)

بالآخر اسی پادری سلطان محمد خاں نے عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے نشہ میں مخمور ہو کر جنوری ۱۹۳۲ء میں ''سلطان التفاسیر'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ ۶ر مئی ۱۹۳۲ء کے اخبار ''اہلحدیث'' میں ''سلطان التفاسیر'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''عیسائیوں نے اسلام پر آج تک متعدد حملے کیے ہیں مگر یہ حملہ ان سب حملوں سے مضر ترین ہے۔ کیونکہ اس میں قرآن شریف کے مضامین پر مخالفانہ قبضہ کر کے اپنے ناظرین کو ''عدم ضرورتِ قرآن'' کا یقین دلانا ہے۔ سلطان التفاسیر کا لب ولہجہ بالکل مسلمانہ ہے مگر اسی طرح جس طرح اُن لوگوں کا تھا جو بظاہر مومن اور بباطن منکر تھے۔ ہمارے خیال میں عیسائیوں کا ایسا کرنا عیسائیت کی حیثیت سے کچھ قبیح نہیں۔ کیونکہ یہی قاعدہ ہے ؎

پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوارہا
(سیلاب کی قدم بوسی کرنا دیواروں کو جڑ سے گرا دیتا ہے)

برہان التفاسیر لِاِصلاح سلطان التفاسیر:

اسی اہمیت کے پیشِ نظر مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ایسی زہر آلود کتاب کا جواب شروع کیا جو ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر میں ۶ر مئی ۱۹۳۲ء تا ۳۱ر مئی ۱۹۳۵ء جاری رہا اور اکیاسی (۸۱) قسطوں میں موجودہ حصہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد پادری سلطان محمد خاں نے اپنی تفسیر لکھنی بند کر دی جس کے بعد ناچار مولانا امرتسری رحمہ اللہ کو بھی یہ سلسلہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔

برہان التفاسیر کا تعارف اور اسلوب و منہج مولانا اسعد اعظمی حفظہ اللہ نے اپنے

’’پیش لفظ‘‘ میں بخوبی ذکر کر دیا ہے، جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی یہ تصنیف تقریباً پچھتر (۷۵) سال بعد پہلی بار کتابی شکل میں پیش کی جا رہی ہے، جس کے لیے ہم لجنۃ القارۃ الہندیۃ، جمعیہ احیاء التراث الاسلامی کویت کے ذمہ داران کے ممنون ہیں، جن کی توجہ کی بدولت اس وقیع کتاب کی طباعت عمل میں آئی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے جامعہ سلفیہ بنارس، انڈیا کے اصحاب انتظام کو جن کی محنت شاقہ کے سبب ہمیں اس کتاب کا اصل مسودہ اور کمپوز شدہ مبیضہ حاصل ہوا جس پر مندرجہ ذیل عمل کا اضافہ کیا گیا:

۱۔ ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر کے اوراق کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کی مزید تصحیح کی گئی۔

۲۔ حواشی میں احادیث و آثار کی تحقیق و تخریج کا اضافہ کیا گیا ہے، کیونکہ بعض دفعہ احادیث و آثار کی صحت وضعف آشکارا ہونے کے بعد معترض کے اشکالات کی حقیقت بخوبی عیاں ہو جاتی ہے اور علمی اعتبار سے اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

۳۔ عربی اور فارسی اشعار و عبارات کا ترجمہ حواشی میں درج کیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب میں مذکورہ مصادر و مراجع کو مدنظر رکھتے ہوئے منقولہ عبارات کی تصحیح کی گئی ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی خدمت و طباعت میں شریک جملہ معاونین و مساعدین کو اجر جزیل عطا فرمائے اور اسے ان تمام حضرات کے لیے بلندیٔ درجات کا سبب بنائے۔ آمین یا رب العالمین

شاهد محمود

۱۴۳۲ھ/۶/۲۷ = ۲۰۱۱/۵/۳۰

0092-321-6466422

hasanshahid85@hotmail.com

آغاز کتاب

قرآن مجید بھی کیا ہی عجیب کتاب ہے کہ اس کی خدمت خدائے تعالیٰ جس سے چاہتا ہے لیتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے سفرنامہ روم وشام میں لکھا ہے کہ بیروت کے عیسائی کالج میں عربی ادب کے لحاظ سے عیسائیوں نے قرآن مجید کی کئی سورتیں داخل کی ہوئی ہیں۔ روس میں عکسی قرآن مجید چھپا۔ جرمنی میں اعلیٰ درجہ کا چھپا جس کی مثال ہندوستان پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ جارج سیل انگریز نے قرآن مجید کا انگریزی میں اور پادری عمادالدین نے اُردو میں ترجمہ شائع کیا۔

ان لوگوں کی نیت کچھ ہی ہو، ہم تو ان کے کاموں کو بھی قرآن شریف کی خدمت کی فہرست میں جانتے ہیں۔ اسی قسم کی خدمت کی مثال آج ہمارے سامنے لاہور (پنجاب) میں پیدا ہوئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

پادری سلطان محمد (پال) ایک افغان عربی داں ہیں، جو اپنی مرضی سے اسلام ترک کر کے عیسائی ہوئے۔ آپ نے پہلے ایک رسالہ لکھا: ''میں کیوں مسیحی ہوا؟'' اُس میں ترکِ اسلام اور اخذِ مسیحیت کی وجوہات لکھیں جس کا جواب خاکسار (ابوالوفاء) نے دیا۔ اس کا جواب پادری صاحب نے دیا۔ پھر میں نے جواب الجواب دیا جو مع دیگر رسائل جواب عیسائیاں کے ''جواباتِ نصاریٰ'' کے نام سے شائع ہوا۔

اس کے بعد پادری صاحب موصوف نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا اعلان کیا۔ مگر سامان (کتب عربیہ) نہ ہونے کی وجہ سے عیسائی قوم سے چندہ طلب کیا، جو کافی جمع ہونے پر آپ نے کتب عربیہ فراہم کر کے قرآن کی تفسیر ''سلطان التفاسیر'' بصورت رسالہ (موسومہ المائدہ) ماہوار جاری کیا۔ آپ کے عیسائی مداحین نے آپ

کے حق میں یہاں تک لکھا کہ کوئی مسلمان قرآن کی تفسیر نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ ایک مضمون بالاختصار درج ذیل ہے:

کیا مسلمان قرآن کی تفسیر لکھ سکتے ہیں؟

''یہ ایک اہم سوال ہے جس پر مسیحی اور برادران اسلام دونوں کو غور کرنا چاہیے، گو یہ مضمون طوالت چاہتا ہے تو بھی ہمیں امید ہے کہ چند سطور سے ایک گونہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے، جس کے دل میں خدا کی محبت اور بنی نوع انسان کی بہبودی موجود ہو وہ کیسے چین پاسکتا ہے؟ چنانچہ اس رسالہ ''المائدہ'' کو جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے اسی بزرگ اور عالم بے بدل عالی جناب مولوی پادری سلطان محمد خان صاحب مدظلہ کی خیرخواہانہ اور ہمدردانہ کوششوں کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ اے کاش کہ ہماری قوم اس بزرگ کی بے چینی اور سچی تڑپ کو تعصب کی عینک اتار کر دل کی آنکھوں سے محسوس کرے۔ کیونکہ صبح کا بھولا اگر شام کو اپنے گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہیے۔

''مضمون کی طوالت پر قابو رکھتے ہوئے ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ نئی نئی تفاسیر کا نئے نئے انداز میں لکھا جانا اور پرانے خیالات و آراء کا مردود قرار دیا جانا ہی اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ یہ سب کچھ کتاب مقدس یعنی بائبل شریف کا فیضان ہے جسے ایجاد بندہ کہہ کر مسلمان تعلیاں لے رہے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں اعجازِ قرآن یہی ہے۔ پس اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ہمارے فاضل بزرگ نے تہیہ کرلیا ہے کہ قرآن کی تفسیر بائبل کی روشنی میں لکھی جائے۔ کیونکہ قرآن بھی تو یہی اقرار کرتا ہے کہ اگر تجھ کو کچھ شک ہے اس چیز میں جو ہم نے تیری

طرف نازل کیا تو پوچھ لیا کر ان لوگوں سے جو پڑھا کرتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے۔(یونس۔ ع۱۱)'' (المائدہ، جنوری ۳۲ء ص:۵۔۱۱)

برہان:

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر کلام کی تفسیر دو طرح کی ہوتی ہے:

① ایک متکلم کے حسب منشا۔

② دوم مفسر کے حسب منشا۔ یعنی متکلم کے منشا کو نظر انداز کر کے مفسر اپنے منشا کے ماتحت جو چاہتا ہے تفسیر کرتا ہے۔

عربی اصولِ کلام میں ایک قانون ہے:

''تأويل الكلام بما لا يرضى به قائله باطل''

یعنی کسی کلام کی تاویل ایسی کرنی جو متکلم کے خلافِ منشا ہو غلط ہے۔

پادری صاحب کی تفسیر جتنی منصۂ ظہور پر آئی ہے اسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی تفسیر قسم ثانی میں داخل ہونے کی وجہ سے بے شک ایسی ہے کہ ''کوئی مسلمان ایسی تفسیر نہیں لکھ سکتا۔''

اس کی مثال:

انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے:

''مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وے خدا کے فرزند کہلائیں گے۔'' (انجیل متی باب ۵ کی دس)

اس قول کی حسب منشائے قائل یہ تفسیر ہے کہ ''صلح کن اور صلح جو خدا کے مقرب بندے ہوں گے۔'' (آمنا و صدقنا)

دوسری قسم کی تفسیر: ''صلح جو اور صلح کن بجائے اپنے باپوں کے خدا کے ولد بن جائیں گے۔ پس وہ ولدیت لکھاتے ہوئے ''ولد اللہ'' لکھایا کریں۔''

لازمی بات ہے کہ تفسیر ثانی پر ہر کہہ ومہہ مذہبی اور اخلاقی اعتراض کرے گا۔

''دیکھو جی مسیح دنیا کے لوگوں کو تعلیم دیتا ہے کہ اپنے ماں باپ کو جواب دیدو اور خدا کے بیٹے کہلاؤ''

پھر ایسی تفسیر کرنے والا اپنی شان میں اگر یہ کہے کہ ''میری جیسی تفسیر کوئی مسیحی نہیں کرسکتا'' تو مسیحی علماء یقیناً اس کو جواب میں کہیں گے ؎

نہ پہنچا ہے نہ پہنچے گا تمھاری ظلم کیشی کو
بہت سے ہو چکے ہیں گرچہ تم سے فتنہ گر پہلے

مختصر یہ ہے کہ پادری صاحب نے مفسر قرآن بن کر قرآن مجید کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو بحیثیت ایک عیسائی ہونے کے وہ کر سکتے تھے۔ جس پر قرآن کے منہ سے بے ساختہ نکلا ؎

کیے لاکھوں ستم اس پیار میں بھی آپ نے ہم پر
خدا ناخواستہ گر خشمگیں ہوتے تو کیا کرتے

''سلطان التفاسیر'' بصورت رسالہ ''المائدہ'' جنوری ۳۲ء سے جاری ہے۔ ہمارے دل میں اسی وقت سے جواب دینے کا القا ہوا تھا لیکن اتنے دنوں تک ہم نے انتظار کیا کہ رسالہ مذکورہ کے چند نمبر نکل لیں تو توجہ کی جاوے گی۔ چنانچہ آج سلسلہ ہذا کا نمبر اول ہے۔

نوٹ:

آئندہ حسب تجویز ایک صفحہ اخبار اس سلسلہ کے لیے وقف کیا جائے گا۔ اس کا نام یہی ہوگا: ''برہان التفاسیر برائے اصلاح سلطان التفاسیر''۔

سلطان التفاسیر کی غرض و غایت بتانے کے بعد مختصر عرض ہے کہ عیسائیوں نے اسلام پر آج تک متعدد حملے کیے ہیں مگر یہ حملہ ان سب حملوں سے مضر ترین ہے۔

کیونکہ اس میں قرآن شریف کے مضامین پر مخالفانہ قبضہ کر کے اپنے ناظرین کو ''عدمِ ضرورتِ قرآن'' کا یقین دلانا ہے۔ سلطان التفاسیر کا لب ولہجہ بالکل مسلمانہ ہے مگر اُسی طرح جس طرح اُن لوگوں کا تھا جو بظاہر مومن اور بباطن منکر تھے۔ ہمارے خیال میں عیسائیوں کا ایسا کرنا عیسائیت کی حیثیت سے کچھ قبیح نہیں۔ کیونکہ یہی قاعدہ ہے ؎

پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوارہا[1]

سلطان التفاسیر میں حل لغات بھی ہے۔ ترجمہ بھی ہے۔ اقوال مفسرین بھی ہیں۔ بظاہر قرآن کی تعریف بھی ہے۔ لیکن مقصد ان سب باتوں سے وہی ہے کہ یہ قرآن کوئی مستقل الہامی کتاب نہیں، جو کچھ اس میں خوبی ہے وہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ ساتھ ہی اس کے سندِ روایت کے لحاظ سے قرآن کوئی مستند کتاب بھی نہیں۔

ہمارا فرض:

ان سب حالات میں ہمارا فرض یہ نہ ہوگا کہ ہم ان کی سطر سطر کا جواب دیں، بلکہ یہ ہوگا کہ اُن کے غلط استشہاد کا جواب دیں اور غلط نتیجہ کی تردید کریں اور بس۔ چنانچہ اسی اصول سے آج ہم شروع کرتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا شانِ نزول:

پادری صاحب نے سورہ فاتحہ کے شان نزول کے متعلق اختلاف لکھ کر نتیجہ نکالا ہے:

> ''فاتحہ جیسی عظیم الشان سورت کی جائے نزول میں اختلاف ہونا فی الحقیقت ازبس حیرت انگیز امر ہے۔ علی الخصوص جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مؤرخینِ قرآن کریم اُس کی ایک نہایت معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی آیت کی جائے نزول پر نہ صرف اُنگلی رکھ کر بتلاتے ہیں بلکہ اُس کے دن یا رات میں نازل ہونے، زمستان یا تابستان میں اُترنے، سفر میں یا حضر

[1] سیلاب کی قدم بوسی کرنا دیواروں کو جڑ سے گرا دیتا ہے۔

میں وارد ہونے وغیر ذلک کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتلاتے ہیں۔

جب سورہ فاتحہ کے ساتھ، جو ام القرآن (قرآن کی ماں) اور قرآن العظیم کہلاتی ہے، ایسی بے اعتنائی کا سلوک جائز رکھنا کہ اُس کی جائے نزول لکھنے تک کا کوئی مؤرخ فکرمند نہ ہو تو بجز اس کے ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کا تعلق قرآن کے کسی حصہ کے ساتھ نہیں ہے۔''

(سلطان التفاسیر، ص:۲)

برہان:

سب سے پہلے آپ کو شان نزول کے متعلق علماء مفسرین سے معلوم کرنا چاہیے تھا کہ وہ شانِ نزول کو قرآن کی ذات کے لیے جزو یا اُس کے فہم کے لیے مدار جانتے ہیں یا ایک زائد بات سمجھتے ہیں۔ شانِ نزول میں بہت سا حصہ راویانِ کلام کے فہم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے شانِ نزول کا اختلاف قرآن کی کسی سورت یا آیت کی ذات میں خلل انداز نہیں ہوسکتا۔ (مفصل کے لیے دیکھو: فوز الکبیر شاہ ولی اللہ قدس سرہ)[1]

اس کے بعد ہم بتاتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کے متعلق جمہور راویان کلام کا یہ قول ہے کہ یہ مکی ہے، اسی لیے اس کے سر پر ''مکیة'' لکھا ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو: تفسیر خازن۔ فتح البیان۔ روح المعانی وغیرہ وقرآن مطبوعہ۔[2]

صاحب روح المعانی نے ایک روایت نقل کی ہے جو فیصلہ کن ہے کہ یہ سورت مکیہ ہے:

عن أبي ميسرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم: « كان إذا برز سمع مناديا يناديه يا محمد، فإذا سمع الصوت انطلق هاربا فقال له ورقة بن نوفل: إذا سمعت النداء فاثبت

[1] الفوز الكبير في أصول التفسير (ص: ٣١)

[2] تفسير الخازن (١/ ١٥) فتح البيان (١/ ٣١) روح المعاني (١/ ٣٤)

حتى تسمع ما يقول لك، فلما برز سمع النداء: يا محمد. قال: لبيك. قال: قل: أشهد أن لا إله إلا الله، و أشهد أن محمدا رسول الله. ثم قال: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ حتى فرغ من فاتحة القرآن»

(جلد اول ص:۳۱)[1]

یعنی ابو میسرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب شہر سے باہر نکلتے تو ایک منادی کو آواز دیتے ہوئے سُنا کرتے۔ وہ کہتا تھا: یا محمد! جب آپ یہ آواز سنتے تو بھاگ جاتے۔ آخر (جب آپ نے ورقہ[2] مکہ کے عیسائی عالم سے ذکر کیا تو) ورقہ نے آپ کو کہا: جب آپ یہ آواز سنیں تو ثابت قدم رہیے یہاں تک کہ جو وہ کہے وہ سنئے۔ پھر جب ایک روز نکلے تو آواز سنی: یا محمد۔ کہا: میں حاضر ہوں۔ اُس نے کہا: کہہ "أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمداً رسول الله"۔ پھر اُس منادی کرنے والے نے ساری سورہ فاتحہ پڑھ دی (اور آنحضرت نے یاد کرلی)۔"

یہ مرفوع روایت جمہور کی تائید کرتی ہے۔ اسی لیے عام طور پر قرآنوں میں سورہ فاتحہ کو مکیہ لکھا ہوتا ہے۔

ہمارا سوال:

کلیجہ تھام کر بیٹھو کہ بس اب میری باری ہے

1. نیز دیکھیں: مصنف ابن أبي شيبة (۷/ ۳۲۹) یہ عمرو بن شرحبیل ابو میسرہ ہمدانی تابعی کی مرسل روایت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهو مرسل، ورجاله ثقات" (العجاب في بيان الأسباب: ۱/ ۲۲۳) نیز دیکھیں: موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني الحديثية (۴/ ۲۴۹)
2. یہ شخص مکہ میں رہتا تھا عیسائی مذہب تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ میں چچا تھا۔ [مؤلف]

ہم بتا آئے ہیں کہ شانِ نزول داخل فی القرآن نہیں۔ اس لیے اس میں اختلاف ہونا چنداں مضر نہیں۔ مگر کسی الہامی کتاب میں اگر اتنا اختلاف ہو کہ سب سے اول کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ تو وہ اختلاف ایسا ہے جس کو منطقی اصطلاح میں اختلافِ ماہیت کہتے ہیں۔

کیا مسیحی علماء بھولے ہیں کہ انجیل متی کی بابت کیا اختلاف ہے؟ پادری عماد الدین کے الفاظ یہ ہیں:

''اس بات میں اختلاف ہے کہ اُس (متی) نے (یہ انجیل) کس زبان میں لکھی آیا عبرانی میں یا یونانی میں۔'' (دیباچہ تفسیر انجیل متی ص:۵)

پادری صاحب! اب ہم آپ کے الفاظ دُہراتے ہیں کہ ''آج جس انجیل کے بے حساب زبانوں میں ترجمے کیے گئے ہیں، شروع میں اس سے بے اعتنائی کا سلوک کرنا بتا رہا ہے کہ شروع میں اس کی یہ وقعت نہ تھی جواب ہے۔''

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھیے گا ذرہ دیکھ بھال کے

ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور سورۂ فاتحہ:

اس کے بعد پادری صاحب لکھتے ہیں:

''ابن مسعود اور سورہ فاتحہ: ہمارے اس خیال کی تائید کہ سورۂ فاتحہ قرآن میں سے نہیں، ابن مسعود کے قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں سورۃ فاتحہ اور معوذتین نہیں تھیں۔ چنانچہ صاحب اتقان لکھتے ہیں کہ ابن اشتہ نے ابن مسعود کے قرآن کی تعداد و ترتیب سورہ بتلا کر کہا کہ ''ولیس فیه الحمد ولا معوذتان''[1] یعنی ابن مسعود کے قرآن میں

---

[1] اتقان کی عبارت اس طرح ہے: ''ولیس فیه الحمد ولا المعوذتان'' (۸٦/۱)

الحمد اور معوذتین نہیں ہیں۔"

(اتقان: النوع الثامن عشر: في جمعه وترتيبه ص: ٦٤۔ المائدہ، سلطان التفاسیر ص:۳)

برہان:

آپ کی ساری کوشش ایک غرض کے لیے ہے جو ان شاء اللہ پوری نہ ہوگی۔ یعنی آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "سورۃ فاتحہ اور معوذتین مسعودی قرآن میں نہ ہونے سے قرآن کا تواتر ٹوٹ جاتا ہے۔" (ص:۵)

پس سنیے! ابن مسعود سے اس کی بابت سوال ہوا تو انھوں نے خود اس کو حل کر دیا:

"قد روى الأعمش عن إبراهيم قال: قيل لابن مسعود: لِمَ لم تكتب الفاتحة في مصحفك ؟ فقال: لو كتبتها لكتبتها في أول كل سورة. قال أبو بكر بن أبي داود: يعني حيث يقرأ في الصلاة. قال: واكتفيت بحفظ المسلمين لها عن كتابتها."

(تفسیر ابن کثیر، فاتحہ)[1]

یعنی ابن مسعود سے سوال کیا گیا کہ آپ نے سورہ فاتحہ اپنے قرآن میں کیوں نہ لکھی؟ انھوں نے کہا کہ اگر میں لکھتا تو ہر ایک سورت کے شروع میں لکھتا۔ ابو بکر بن داود نے کہا کہ مراد اُن کی یہ ہے کہ چونکہ لوگوں نے اس کو نماز کے لیے حفظ کر رکھا ہے اور بکثرت پڑھتے ہیں اس لیے لکھنے کی حاجت نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کا تواتر باقی قرآن شریف سے زیادہ تھا نہ کہ تواتر سے خارج۔

تواتر فہمی میں آپ کی غلطی:

پادری صاحب کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تواتر کے سمجھنے پر وقت

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۰)

نہیں لگایا۔ محدثین نے جو تواتر کی تعریف کی ہے وہ یہ ہے:

"الكثرة أحد شروط التواتر بأن تكون العادة قد أحالت تواطؤهم على الكذب، فلا معنى لتعيين العدد على الصحيح." (شرح نخبة، ص: ٨)

یعنی متواتر میں اتنی کثرت ہو کہ عادتاً اتنے آدمی جھوٹ پر جمع نہ ہو سکیں۔ اُن میں عدد شرط نہیں۔

صحابہ کرام بالاتفاق فاتحہ کو داخل قرآن سمجھیں، خلافت کے حکم سے قرآن جمع ہو، اُس میں فاتحہ درج قرآن ہو، کسی حاضر غائب نے اعتراض نہ کیا ہو۔ تواتر اس پر ہونے میں کوئی کسر رہ گئی؟ سچ تو یہ ہے کہ ابن مسعود کے قول کی اگر کوئی صحیح تشریح نہ بھی ہو سکے تو بھی ساری مسلم قوم کے اجماع کے مقابلہ میں اُن کا تفرد مانع تواتر نہیں۔

پس آپ کا نتیجہ مندرجہ ذیل سرتا پا غلط ہوا۔ جو یہ ہے:

''انہی وجوہ کی بنا پر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فی الحقیقت سورۃ فاتحہ قرآن کا جزء یا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ آنحضرت کے ایک طویل زمانہ کے انتخابات کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔'' (ص:۵)

غنیمت ہے آپ کو یہ مجموعہ تو پسند آیا۔ سوامی دیانند کی طرح اس پر متعدد سوال تو نہیں سوجھے۔ ان معنی سے ہم آپ کے شکر گزار ہیں ؎

عمر دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است [1]

اسی طرح معوذتین [2] کی کیفیت ہے۔ ابن مسعود ان دو سورتوں کو قرآن میں نہ

---

[1] عمر لمبی ہوئی کہ یہی غنیمت ہے۔

[2] یعنی ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ ان دو سورتوں کو معوذتین کہتے ہیں۔

لکھتے تھے، مگر ان کا نزول آسمانی اور الہامی کہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ دو سورتیں بطور دعا کے خدا نے بھیجی ہیں۔ اس لیے قرآن میں درج نہیں کرتے تھے، بلکہ بطور دعا کے پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے اس دعوے کا ثبوت سنیے!

"عن علقمة قال: كان عبد الله يحكي المعوذتين من المصحف، و يقول: إنما أمر رسول الله ﷺ أن يتعوذ بهما، ولم يكن عبد الله يقرأ بهما." (تفسير ابن كثير:٣/٧٤٢، سورة الفلق)

یعنی علقمہ کہتے ہیں: عبداللہ بن مسعود کہتے تھے کہ آنحضرت کو حکم ہوا تھا کہ ان دوسورتوں کے ساتھ پناہ لیں۔ ابن مسعود ان کی تلاوت نہ کرتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں مرفوع حدیث (فرمان نبوی) سنیے!

"عن زر بن حبيش: قال: قلت لأبي بن كعب: إن ابن مسعود لا يكتب المعوذتين في مصحفه، فقال أشهد أن رسول الله ﷺ أخبرني أن جبرئيل عليه السلام قال له: قل أعوذ برب الفلق. فقلتها، قال: قل أعوذ برب الناس. فقلتها، فنحن نقول ما قال النبي ﷺ." (تفسير ابن كثير: ٤/٧٤١)

یعنی زر بن حبیش کہتے ہیں: میں نے ابی بن کعب کو کہا: عبداللہ بن مسعود معوذتین کو قرآن میں نہیں لکھتے (کیا یہ قرآن میں سے نہیں ہیں؟) اُس نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں تحقیق آنحضرت نے مجھے بتایا ہے کہ جبرئیل نے آپ کو کہا تھا: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ جواب میں (آنحضرت) نے اسی طرح کہا۔ پس ہم مسلمان بھی اُسی طرح پڑھتے ہیں۔

ابی بن کعب کا جواب ہے کہ عبداللہ اگر اپنے فہم سے ایسا سمجھتا ہے کہ یہ دوسورتیں بطور دعاء تعویذ ہیں تو یہ اُس کا فہم سند نہیں جبکہ رسول خدا نے ان کو قرآن

میں داخل کر کے ہمیں پڑھایا۔

اس سے بھی واضح سنیے!

"عن عقبة بن عامر قال: قال (رسول اللہ ﷺ) ألا أعلمك سورتين من خير سورتين قرأ بهما الناس؟ قلت: بلى يا رسول الله، فأقرأني ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ و ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾" (تفسیر ابن کثیر: ٧٤٢/٤)

یعنی عقبہ کہتے ہیں: مجھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں تجھے اچھی دو سورتیں پڑھاؤں؟ میں نے عرض کیا: ہاں حضور۔ پس مجھے پڑھائی: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ و ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾۔

پس ان احادیث مرفوعہ نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ اوراجماع مسلمین میں عبداللہ بن مسعود کا تاویل پذیر قول کسی طرح خلل انداز نہیں ہوسکتا۔ فافہم

نتیجہ صاف اور صحیح ہے کہ قرآن متواتر ہے، ثبوت قطعی یہ ہے کہ دنیا بھر کے حفاظ جمع کر کے ان سے سنیے، زیر، زبر یا جزم پیش کا فرق بھی نہ ہوگا۔ لہ الحمد

ہمارا جواب:

امام رازی رحمہ اللہ نے ابن مسعود والی قراءت کی بحیثیت سند تکذیب کی ہے، حافظ ابن حجر نے اس کی توثیق۔[1] پادری صاحب حافظ ممدوح کی توثیق پر بہت نازاں ہیں، مگر ہم نے جو طریق اختیار کیا اس میں نہ امام رازی کی طرح تکذیب کی ضرورت ہے نہ حافظ موصوف کی توثیق کا ضرر، بلکہ جواب صاف ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کا نزول الہامی مانتے ہیں، مگر بطور دعا اور بطور استعاذہ ان کو

[1] دیکھیں: فتح الباري (٨/ ٧٤٣) امام رازی کے علاوہ امام ابن حزم اور امام نووی نے بھی اس بات کی تکذیب کی ہے۔ جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق یہ روایت صحیح ہے لیکن تاویل صحیح اور اجماع کے ساتھ اس کا جواب ممکن ہے۔

پڑھتے تھے، اور یہ ایسا کرنا ان کا فہم تھا جو فرمودہ رسالت اور اجماع مسلمین کے خلاف تھا، یہ جواب بالکل صاف ہے۔ نہ اس میں امام رازی کی تقلید ہے نہ حافظ مرحوم کی تردید، بلکہ اصل یہ ہے ؎

نہ پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

تتمہ سابق:

سابقہ نمبر میں اس امر پر بحث تھی کہ ابن مسعود کے قرآن میں سورۂ فاتحہ اور سورۃ الفلق اور الناس داخل نہیں تھیں۔ اس کی تفصیل کے بعد مندرجہ ذیل تتمہ لگایئے۔

ناظرین کرام! پادری صاحب کا سورہ فاتحہ کی بابت ابن مسعود کی روایت بیان کرنے سے جو مقصد ہے وہ اُن کے بطن میں ہے، اُسے ہم ظاہر کیے دیتے ہیں۔ یعنی قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے کہ غیر قرآن کو قرآن میں ملایا گیا۔

اس کا جواب روایتاً ہم دے چکے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، سورہ فاتحہ قرآن کا جزو ہے۔ ہاں ہمارا حق ہے کہ پادری صاحب سے دریافت کریں کہ بائبل کا کیا حال ہے؟ جس میں اتنا اختلاف ہے کہ کسی کتاب میں نہ ہوگا۔

رومن کیتھولک جو آپ کے فرقہ پروٹسٹنٹ سے پہلے کے ہیں، اُن کی بائبل میں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ درج ہیں:

① طوبیا کی کتاب ② یہودیت کی کتاب
③ جامع کی کتاب ④ نشید الانا شید کی کتاب
⑤ یشوع بن سیراخ ⑥ باروک کی نبوت
⑦ مکابیون کی پہلی کتاب ⑧ مکابیون کی دوسری کتاب

حالانکہ آپ کے فرقہ پروٹسٹنٹ کی چاہے وہ انگلش ہو یا امریکن ان کی کسی

بائبل میں اتنی کتابیں نہیں ہیں۔

پادری صاحب!

این گناہیست کہ در شہر شما خاص کنند [1]

پادری صاحب نے اس امر پر بڑی محنت کی ہے کہ عرب میں یہودی۔ عیسائی بکثرت آباد تھے، جن میں بڑے بڑے شاعر بھی تھے، خاص کر امیہ بن ابی الصلت ایک موحّد شاعر تھا۔ آنحضرت ﷺ اس کے اشعار سُنا کرتے تھے۔ اس سے آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ سورہ فاتحہ کتب سابقہ سے آنحضرت ﷺ نے منتخب فرمائی تھی۔

چنانچہ پادری صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''یقیناً امیہ کے اسی قسم کے اشعار نے آنحضرت کو اس طرف متوجہ کیا ہوگا کہ آپ کتب مقدسہ کا استقصا کریں اور امیہ کے اشعار کو قدرے تفصیل کے ساتھ الحمد کی صورت میں مرتب فرمائیں۔''

آنحضرت نے الحمد کو کہاں سے انتخاب کیا؟

''آنحضرت ﷺ اہل کتاب کی کتابوں کے صرف مداح ہی نہ تھے بلکہ اُن کو منجانب اللہ اور ہدایت و موعظت بھی مانتے تھے۔ امیہ کے ان سحر افگن اور روح افزا اشعار کو سن کر آپ کو یقین ہوا ہوگا کہ ان سب کی اصل اور ماخذ کتب مقدسہ ہی ہیں۔ اس لیے بلا تاخیر کتب مقدسہ کی طرف آپ نے رجوع کیا ہوگا۔ اور انہی کتابوں سے دیگر قرآنی امور کی طرح الحمد کو منتخب فرمایا ہوگا، چنانچہ الحمد کی آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم ہر آیت کے مقابل کتب مقدسہ کی ایک آیت نقل کریں گے، تاکہ ہماری تفسیر کے پڑھنے والوں کو ہماری رائے کی صداقت میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔'' (ص:۸)

[1] یہ گناہ ہے جو آپ کے شہر میں بھی ہوتا ہے۔

برہان:

یہ ماضی احتمالی کے صیغے پڑھ کر ہمیں اس کی مثال یاد آئی۔

کچھ مدت کا ذکر ہے ایک نوجوان مجرد خوبصورت عیسائی ہوگیا، تو اُس کے مخالفوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ چندروز پہلے گرجا میں گیا ہوگا۔ وہاں برہنہ جوان لیڈیوں کو دیکھا ہوگا، ان میں سے کسی پر فریفتہ ہوا ہوگا، پھر اُس سے طالب ہوا ہوگا، اُس نے کہا ہوگا کہ تم عیسائی ہوجاؤ تو مراد پالو گے، اس لالچ میں وہ جوان عیسائی ہوا ہوگا۔

ہمارے خیال میں ماضی شکیہ کے صیغے نہ یہ ٹھیک ہیں نہ پادری صاحب کے احتمالی صیغے صحیح۔ کیونکہ قرآن مجید نے ان احتمالات کی تردید علی الاعلان اُسی زمانہ میں کردی تھی جس زمانہ کا ذکر پادری صاحب آج کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی تفسیر لکھنے والے کا یہ بھی فرض ہے کہ تفسیر لکھنے سے پہلے قرآن کے مضامین پر ایک جامع نظر رکھے تاکہ کہیں ٹھوکر نہ لگے۔ پس غور سے سنئے!

﴿وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ٤٨]

”(اے رسول) تم (نزول قرآن سے) پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے بلکہ بوجہ امی محض ہونے کے اپنے ہاتھ سے کسی کتاب کو چھوتے بھی نہ تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو جھوٹ بہتان لگانے والے فوراً لوگوں میں شک پھیلاتے۔“

کہتے پھرتے کہ پڑھا لکھا آدمی ہے، کتابوں سے مضمون اخذ کرکے لوگوں کو سناتا ہے۔

یہ جواب اُس وقت شائع کیا گیا جس وقت پادری صاحب کے ہم مذہب عیسائی شاعر اور کتب سابقہ سے مضمون بنانے والے عیسائی اہل علم بھی زندہ تھے۔ اگر پادری صاحب کی ماضی شکیہ کچھ حقیقت رکھتی تو وہی اہل علم تکذیب کرنے کو کھڑے ہو جاتے۔ اور صاف کہتے: واہ صاحب! ؎

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد ❶

اصلی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ملاقات بجز ورقہ بن نوفل کے کسی عیسائی اہل علم سے ثابت نہیں۔ ورقہ ایک عیسائی اہل علم تھا جو ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا قریبی رشتہ دار تھا۔ ابتداءِ وحی کے بعد آنحضرت ﷺ کی حالت دیکھ کر زوجہ محترمہ ورقہ کو اہل علم جان کر محبوب خاوند کو اس کے پاس لے گئیں، حال بتایا۔ ورقہ نے سب کچھ سن کر حضور کو خلعتِ نبوت پر مبارکباد دی۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

« انطلقت به خديجة إلى ورقة بن نوفل ابن عم خديجة، فقالت له: يا ابن عم! اسمع من ابن أخيك. فقال له ورقة: ابن أخي ماذا ترى؟ فأخبره ﷺ خبر ما رأى، فقال ورقة: هذا الناموس الذي أنزل الله على موسىٰ، يا ليتني فيها جذعا، يا ليتني أكون حيا إذ يخرجك قومك. فقال رسول الله ﷺ: أو مخرجي هم؟ قال: نعم، لم يأت رجل قط بمثل ما جئت به إلا عودي، وإن يدركني يومك أنصرك نصراً مؤزراً، ثم لم ينشب ورقة أن توفي» ❷ (بخاری و مسلم)

(یعنی) خدیجہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، کہا: اے بھائی اپنے بھتیجے کا حال سن۔ ورقہ نے آنحضرت کو کہا میرے بھائی کے بیٹے تم نے کیا دیکھا ہے؟ آنحضرت نے جو دیکھا تھا اُس کو بتایا، ورقہ نے سب حال سن کر کہا یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ نبی پر خدا نے بھیجا تھا، کاش کہ اُس وقت میں جوان ہوتا، کاش میں اُس وقت زندہ ہوتا جب تیری قوم تجھ کو نکال

❶ کسی نے مجھ سے علم تیر نہیں سیکھا کہ کہیں انجام کار مجھے ہی نشانہ بنا دے۔

❷ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠)

دے گی۔ آنحضرت نے کہا: کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں ہمیشہ سے چلا آیا ہے جو کوئی ایسی بات لایا جو تو لایا ہے اُس سے لوگوں نے عداوت کی۔ اگر تیرا زمانہ نبوت میں پاؤں تو تیری بڑی مدد کروں۔ اس کے بعد ورقہ جلدی فوت ہوگیا۔'' رضي الله عنه

ناظرین کرام! ورقہ کے یہ الفاظ یقیناً پادری صاحب کی ماضی شکیہ اور احتمالیہ سے کئی درجہ اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی عیسائی اہل علم سے حضور کا ربط و ضبط تو کیا ملاقات بھی ثابت نہیں۔ پادری صاحب اور اُن کے اعوان و انصار اگر مدعی ہیں تو ماضی شکیہ کے صیغے چھوڑ کر یقینی صیغے بولیں اور ان کا ثبوت بھی دیں۔

ورقہ کی پیش گوئی:

ورقہ موصوف کی پیش گوئی کیسی صحیح ثابت ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کو آخر کار ہجرت کرنی پڑی۔ کیونکہ ورقہ کا وہی علم تھا جو اس شعر میں بتایا گیا ہے۔ ؎

کہتی تھی ماہی بریاں کہ دبیران قضا
داغ دیتے ہیں اسے جس کو درم دیتے ہیں

پس پادری صاحب کی ماضی شکیہ غلط ہے اور قرآن مجید کی ماضی قریب بالکل صحیح ہے۔ غور سے سنیے!

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴾

[الحجر: ۷۸]

''اور بے شک ہم نے تم کو سورہ فاتحہ دی ہے۔'' له الحمد

پادری صاحب کی ''بسم اللہ'' غلط:

سورہ فاتحہ کے جزوِ قرآن ہونے نہ ہونے کے متعلق اظہارِ رائے کرنے کے بعد پادری صاحب نے بسم اللہ کے جزو فاتحہ ہونے نہ ہونے پر بحث کی ہے۔

چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کے الہامی یا قرآن شریف کے جزو ہونے میں بھی وہی اختلاف ہے جو الحمد کی نسبت تھا۔ امام مالک اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

"إنه ليس من القرآن إلا في سورة النمل."

یعنی بسم اللہ قرآن میں سے نہیں ہے مگر سورہ نمل میں۔''

(تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۱۰۰ و تفسیر بیضاوی جلد اول صفحہ ۸)

''مدینہ، بصرہ اور شام کے علماء کے نزدیک بھی بسم اللہ قرآن کا جزو نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۱۰۰ اور بیضاوی بحوالہ بالا)

''اس لیے یہ لوگ نماز میں نہ تو بسم اللہ کو آہستہ پڑھتے ہیں اور نہ ہی بلند آواز سے۔ بسم اللہ کے ہر ایک سورت کے شروع میں الہامی ہونے کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ (تفسیر بیضاوی جلد اول صفحہ ۸)

''اور اس لیے بسم اللہ کو قرآن کی اور آیتوں کی طرح بلند آواز کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ (تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۱۰۰)

''علامہ کازرونی تفسیر بیضاوی کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے خاموش رہنے کا یہ مطلب ہے کہ ''آپ کے نزدیک بسم اللہ کسی سورت کا جزو نہیں ہے۔'' (تفسیر بیضاوی بر حاشیہ بسم اللہ)

''ان کے برخلاف امام شافعی اور ابن مبارک رحمہ اللہ اور مکہ و کوفہ کے علما کہتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن کی ہر سورۃ کا جزو ہے۔ اس لیے یہ لوگ قرآن کی دیگر آیتوں کی طرح اس کو بھی نماز میں بلند آواز کے ساتھ پڑھتے ہیں۔''

(تفسیر خازن جلد اول صفحہ ۲۲ تحت بیضاوی)

نتیجہ:

اس اختلافِ علماء سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بھی قابل اظہار ہے۔ لکھتے ہیں:

"اختلاف بالا سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ جو لوگ بسم اللہ کو قرآن کا جزو تسلیم نہیں کرتے وہ ایک سو تیرہ آیتیں قرآن میں سے گھٹاتے ہیں۔ اور جو لوگ بسم اللہ کو قرآن کا جزو تسلیم کرتے ہیں وہ ایک سو تیرہ آیتیں قرآن میں اضافہ کرتے ہیں۔"

برہان:

پادری صاحب ایک رائے دل میں بٹھا لیتے ہیں، پھر اس پر روایات کو ڈھالتے ہیں) ورنہ روایات کو روایات کے اصول سے دیکھتے تو یہ نتیجہ نہ نکالتے، البتہ ان کی مخفی غرض کو نقصان ضرور پہنچتا۔ خیر ہم تو حدیث شریف کو راہنما جانتے ہیں۔ جس میں ارشاد ہے: «لکل امرئ ما نوی» [1] (ہر آدمی جو نیت کرے وہی پاوے گا) پس پادری صاحب اپنی نیت سے کام کریں ہم اپنی نیت سے کرتے جائیں گے۔ فستعلمون من له عاقبة الدار!

سنیے جناب:

بسم اللہ کو جو ہر سورت کے شروع میں ہے اس کو کلام الٰہی سب مانتے ہیں۔ ہاں جزوِ سورت ماننے میں اختلاف ہے بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ بسم اللہ بوحی خدا قرآن کی ہر سورت کے ساتھ اتری ہے۔ مگر ایک فریق اس کو ہر سورت کا جزو کہتا ہے، ایک بغرض فصل کہتا ہے۔ یعنی بسم اللہ سے غرض اور مقصود میں اختلاف ہے نہ کہ ذات اور نزول میں۔ ہماری بات کو تو آپ محض دعوی سمجھیں گے۔ اس لیے ہم اپنے دعوے کا ثبوت آپ کو دیتے ہیں۔ مفسر تفسیر کبیر نے اپنے خیال (جزوِ فاتحہ ہونے) کا ثبوت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

کئی ایک دلائل سے دیا ہے۔ مصنف تفسیر روح المعانی دوسرے خیال کے سبب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"ليس فيهما سوى إثبات أنها آية، وهو مسلم لكن من القرآن، وأما أنها من الفاتحة فلا." (روح المعاني ١/ ٤٠)

یعنی امام رازی نے جو دلائل اثبات بسم اللہ کے جزوِ قرآن ہونے کے لکھے ہیں مسلم ہیں۔ لیکن ان دلائل سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ قرآن سے ہے مگر فاتحہ کا جزء ہونا ثابت نہیں۔

اس کے بعد پھر لکھا ہے:

"أما ما ذكره في الحجة الثالثة فليس سوى إثبات أن التسمية من القرآن كما أقر هو به، ولسنا ممن نخالفه فيه" (ص:٤١)

یعنی امام رازی نے جو تیسری دلیل دی ہے اُس میں بھی سوائے اس کے کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ بسم اللہ قرآن سے ہے۔ اس سے ہم منکر نہیں مگر فاتحہ کا جزء ہونا ثابت نہیں۔

عملی نتیجہ:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ قرآن شریف کے ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب ہے۔[1] "بسم الله الرحمن الرحيم" پڑھنے پر ہر فریق اس کے ہر حرف پر دس نیکیوں کے ثواب کا اظہار کرے گا۔ فریق اول تو اس لیے کہ قرآن کی ہر سورت کا جزء ہے۔ فریق ثانی اس لیے کہ قرآن کا جزء ہے، جو دو سورتوں میں امتیاز کرنے کو اترا ہے۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ نہیں کہ فریق منکر ایک سو تیرہ آیتیں قرآن کی کم مانتا ہے۔ ایسا ہوتا تو بسم اللہ کو قرآن میں سورت کے شروع میں جگہ نہ ملتی۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٠) وقال الترمذي: "هذا حديث حسن صحيح غريب"

ہاں! ہم آپ کو بتادیں کہ کسی آیت کو کلام اللہ میں نہ ماننا یوں ہوتا ہے۔ ذرا غور سے سنیے۔ مسیح فرماتے ہیں:

''اگر تمھیں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوتا، تو اگر تم اس پہاڑ سے کہتے کہ یہاں سے وہاں چلا جا تو وہ چلا جاتا اور کوئی بات تمہاری ناممکن نہ ہوتی۔ مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا و روزہ کے نہیں نکالے جاتے۔''

(انجیل باب ۱۷۔ درس ۲۰۔۲۱)

زیر خط عبارت امریکن مشن کی انجیل میں ہے مگر برٹش سوسائٹی کی انجیلوں میں نہیں۔

دوسری مثال:

مسیح فرماتے ہیں:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ آسمان پر ان کے فرشتے میرے باپ کا منہ جو آسمان پر ہے ہمیشہ دیکھتے ہیں (کیونکہ ابن آدم آیا ہے کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈ کے بچاوے) (متی باب ۱۸۔ درس ۱۰،۱۱)

زیر خط فقرہ امریکن انجیل میں ہے مگر برٹش میں نہیں۔ یہ دو مثالیں سردست پیش ہیں، ورنہ اس قسم کی کئی آیات انجیلوں میں ہیں، جو ایک میں ہیں دوسری میں نہیں ہیں۔ یہ ہے کمی بیشی کی مکمل مثال!!

پادری صاحب!

اند کے باتو گفتم و بدل ترسیدم
که دل آزرده شوی ورنہ سخن بسیار ست ❶

ناظرین کرام!

مسلمانوں میں جو اختلاف متعلقہ مسائل ہو اس کے فیصلے کی صورت یہ ہے کہ

❶ تم سے میں کتنی باتیں کرتا ہوں مگر دل میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تمھارا دل آزردہ نہ ہو جائے دگرنہ باتیں تو بہت ہیں۔

دربارِ رسالت میں پیش کر کے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ قرآن ہی میں یہ بھی ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾

[النساء: ٥٩]

''اگر تم کسی امر میں اختلاف کرو تو اس کو اللہ کی کتاب اور رسول کے حکم سے فیصلہ کراؤ۔''

اس ارشادِ ہدایت کی بنیاد کے ماتحت ہم اس اختلاف کو دربار رسالت میں پیش کرتے ہیں تو وہاں سے فیصلہ ہوتا ہے:

« الحمد لله سبع آيات، بسم الله الرحمن الرحيم إحداهن، وهي السبع المثاني والقرآن العظيم، وهي أم القرآن، وهي فاتحة الكتاب » أخرجه الطبراني وابن مردويه والبيهقي، و أخرجه الدارقطني بلفظ: « إذا قرأتم الحمد فاقرؤا بسم الله الرحمن الرحيم، أنها أم القرآن، و أم الكتاب، وهي فاتحة الكتاب، و بسم الله الرحمن الرحيم إحدى آياتها »[1]

(روح المعاني: ١/ ٤٠)

یعنی سورۃ الحمد سات آیات ہیں۔ بسم اللہ ان میں سے ایک آیت ہے اور یہ سورت سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔ یہ ام القرآن ہے، یہ فاتحۃ الکتاب ہے، جب تم اس کو پڑھو تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھا کرو، بسم اللہ اس کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

ناظرین! ہم نے تو فریق مخالف کا بیان بھی اپنے موافق اور پادری صاحب کے خلاف دکھایا بلکہ دربار رسالت کا فیصلہ بھی اپنے حق میں بتا دیا۔ مگر پادری صاحب سے ممکن نہیں کہ انجیلی اختلاف کی بابت دربار مسیحی سے ایسا فیصلہ دکھائیں۔ اس لیے

[1] سنن الدارقطني (١/ ٣١٢) سنن البيهقي (٢/ ٤٥) نیز دیکھیں: السلسلة الصحيحة (١١٨٣)

جو مخفی غرض پادری صاحب دل میں قرآن کی بابت رکھتے ہیں، وہ قرآن سے پوری نہ ہوگی۔ ہاں انجیل، تورات سے بآسانی پوری ہو سکتی ہے۔ پادری صاحب کی محنت کی ہم داد دیتے ہیں کہ آپ اپنے مزعومہ خیال کی تائید خس وخاشاک سے بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پادری صاحب کا ایک اور اعتراض:

ایک روایت مجہولہ تفسیر کبیر سے نقل کی ہے جس کو امام رازی نے "رُوِيَ" کے لفظ سے لکھا ہے۔[1] جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ شروع شروع میں اپنے مکتوبات وغیرہ پر قریش کی رسم سے "باسمك اللهم" لکھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آیت اتری: "بسم الله مجراها" تو آپ نے صرف "بسم الله" لکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ آیت اتری:

﴿إِنَّهُ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾[2] [النمل: ٣٠]

اس مجہولہ روایت سے آپ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ قابل دید وشنید ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اس روایت کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کی ہر سورۃ کے شروع میں نازل ہوا ہے؟ قرآن کی سب سے پہلی سورت جو الہام ہوئی ہے، سورہ علق کی پہلی پانچ آیتیں ہیں۔ اگر بسم اللہ ہر سورۃ کے شروع میں الہام ہوا تو لازم تھا کہ اس سورت کے شروع میں بھی الہام ہوتا، اور اگر اس سورت کے شروع میں الہام ہوا ہوتا تو اول تو کہیں اس کا ذکر ہوتا، اور دوئم یہ کہ پھر آنحضرت ﷺ کو شروع میں

---

[1] یعنی صیغہ تمریض کے ساتھ نقل کیا ہے جو مذکورہ بات کے ضعف کی اشارہ ہے۔

[2] التفسير الكبير (١/ ٢٧) یہ امام شعبی رحمہ اللہ کی مرسل روایت ہے۔ دیکھیں: تفسير البغوي (١/ ٤٩)

"باسمک اللھم" لکھنے اور پھر "بسم اللہ" لکھنے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے آخر میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے لکھنے کی کیا ضرورت اور کیا مصلحت تھی؟ شروع ہی سے آپ بسم اللہ الخ کیوں لکھتے نہیں آئے ہیں؟"

برہان:

محدثین کے اصول سے یہ روایت اس قابل نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ کیونکہ بصیغۂ مجہول "رُوِيَ" روایت مجہولہ ہے۔ لیکن ہم پادری صاحب کو بے جواب رکھ کر ملول خاطر کرنا نہیں چاہتے۔

یار کا پاس نزاکت دلِ ناشاد رہے
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

سو جواب یہ ہے کہ سورہ اقرأ کے ساتھ بسم اللہ تو اتری تھی لیکن حضور نے اس کا استعمال عام نہ سمجھا تھا۔ یہی خیال تھا کہ سورہ پڑھنے سے پہلے پڑھ لیا کریں لیکن جب حضرت سلیمان کے خط کے شروع میں آیت بسم اللہ الخ دیکھا تو آپ نے بھی اس کا استعمال عام جاری فرمادیا۔ یہاں تک کہ اب مسلمانوں میں کھانا کھانے، پانی پینے، کپڑے پہننے وغیرہ اوقات میں بھی بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔ فاندفع ما أورد

پس یہ روایت اگر کچھ ہے تو عام استعمالِ نزول کے برخلاف ہے۔ نزول کے برخلاف نہیں۔ پس آپ کا یہ مندرجہ ذیل نتیجہ خود غلط ہے جو یہ ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ بسم اللہ الخ نہ تو ابتدائے نبوت کا الہام ہے اور نہ وسط نبوت کا اور نہ ہی اختتام نبوت کا۔ بلکہ یہ آنحضرت ﷺ کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ جس کو فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں بعبارت بالا بیان کیا ہے۔"

جواب:

اصل بات یہ ہے کہ آپ کو نہ تحقیق سے غرض ہے نہ تنقید سے، بلکہ مسیحیوں میں پادری عمادالدین کے بعد کا خادم القرآن کہلانا مقصود ہے۔ پادری صاحب نے بڑی محنت سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ''بسم اللّٰه الرحمن الرحيم'' بائبل سے ماخوذ ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو بائبل سے تو ملا نہیں، البتہ قرآن کی مذکورہ آیت ﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ [النمل: ۳۰] سے دیا ہے۔ اس کے سوا ایک روایت تفسیر کبیر سے ثعلبی کی نقل کی ہے جس میں ذکر ہے کہ بسم اللہ بعد سلیمان علیہ السلام کے کسی پر نہیں اتری۔[1] (سلطان، ص:۱۰) ہمارے یہ کسی طرح خلاف نہیں ہے کیونکہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ نہیں کہ میں کوئی جدید تعلیم لے کر آیا ہوں بلکہ وہ صاف صاف بتاتا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الشعراء: ۱۹۶]

بے شک یہ قرآن پہلے نبیوں کے صحیفوں میں تھا۔ پس ہم مانتے ہیں کہ عربی الفاظ ''بسم اللّٰه الرحمن الرحيم'' کا ترجمہ حضرت سلیمان کو الہام ہوا ہوگا بلکہ اگر یہ بھی کہہ دیں کہ سارے نبیوں کو ہوا ہوگا تو اسلام اور قرآن کے خلاف نہیں، اس لیے کہ قرآن شریف کا یہ دعوے نہیں کہ میری تعلیم نئی ہے۔ ہاں یہ دعوی ہے کہ عربی اسلوب میرا خاص ہے۔ سو اس کی تردید یوں ہوسکتی ہے کہ پادری صاحب یا کوئی اور صاحب ''بسم اللّٰه الرحمن الرحيم'' بعینہٖ کسی سابق کتاب میں دکھادیں۔ ودونہ خرط القتاد! (یہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے)

[1] سنن الدارقطني (۱/ ۳۱۰) سنن البيهقي (۱۰/ ۶۲) امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وأخرج ابن أبي حاتم والطبراني و الدارقطني والبيهقي في سننه بسند ضعيف'' (الدر المنثور: ۱/ ۱۹) نیز امام بیہقی رحمہ اللہ یہ روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''إسناده ضعيف.''

سورۂ فاتحہ اور صنعت التفات:

پادری صاحب نے سورۂ فاتحہ کی صنعت التفات پر بھی چبھتا سا اعتراض کیا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ تک صیغہ غائب ہے۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے آخر تک صیغہ خطاب ہے۔ اس کو صنعتِ التفات کہتے ہیں۔ عرب کے قصائد میں یہ صنعت بکثرت ہے۔ پادری صاحب نے خود امرأ القیس کے چند اشعار نقل کیے ہیں جو عام طور پر کتب معانی و بیان میں نقل ہوئے ہیں۔ تفسیر بیضاوی میں بھی مذکور ہیں۔[1] شاعر نے ان میں خطاب سے تکلم کی طرف التفات کیا ہے۔ عربی کی مثال فارسی میں بھی ملتی ہے۔ شیخ سعدی مرحوم اپنے بادشاہ کے ذکر میں کہتے ہیں:

چنیں پادشاہاں کہ دیں پرورند — ببازوئے دیں گوے دولت برند
از آقاں نہ بینم دریں عہد کس — دگر ہست بوبکر سعد ست و بس
خدیو خردمند فرخ نہاد — کہ شاخ امیدش برومند باد
بہشتی درختے تونی اے پادشاہ — کہ افگندۂ سایہ یک سالہ راہ[2]

(بوستاں باب ۱)

پہلے تین شعروں میں صیغہ غائب ہے چوتھے میں مخاطب ۔ بالکل سورفاتحہ جیسا، مگر باوجود اس ثبوت کے پادری صاحب لکھتے ہیں:

> ''میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ عرب کے بعض شاعروں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے اشعار میں کبھی کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر سے خطاب کیا کرتے تھے، جس کو علم ادب کی اصطلاح میں التفات کہتے ہیں۔ لیکن یہ

---

[1] دیکھیں: تفسير البيضاوي (١/ ٦٣)

[2] ایسے بادشاہ جو دین پرور ہوں دین کی قوت سے گوئے دولت لے جاتے ہیں، اس عہد میں میں کوئی دوسرا نہیں دیکھتا جو ابوبکر ہو، دانا اور مبارک بادشاہ جس کی شاخ امید بار آور رہتی ہے۔ اے بادشاہ! تم بہشت کا وہ درخت ہو جس کا سایہ راستے میں سال بھر رہتا ہے۔

طریقِ خطاب خاص اشعار سے مخصوص تھا، وہ نثر میں کبھی اس طرز سے کام نہیں لیتے تھے۔ قرآن شریف چونکہ نثر میں ہے اس لیے اس اسلوب کا اختیار کرنا اس کے لیے مناسب نہ تھا۔" (ص: ۱۸)

برہان:

آج تک تو ہر محاورے اور صنعت کے ثبوت میں نظم ہی کو پیش کیا جاتا تھا، کیونکہ زبان کی حفاظت نظم ہی سے ہوتی ہے مگر آج پادری صاحب نے یہ نئ ایجاد کی ہے کہ نثر کے لیے نثر سے استشہاد ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایام جاہلیت کی نثر کا مجموعہ بلکہ ایک صفحہ محفوظ نہیں۔ ہم پادری صاحب کی اس ایجاد پر اُن کو ہدیہ تبریک میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانہ میں دستور نکلا

ہاں قرآنی نثر میں یہ صنعت بکثرت ملتی ہے۔ ﴿اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ﴾ [الیونس: ۲۲] وغیرہ اسی قسم سے ہے۔

الرحمٰن پر اعتراض:

الرحمٰن پر اعتراض پادری صاحب نے نہیں کیا بلکہ معترضین کو جواب دیا ہے کہ الرحمٰن واقعی عرب میں اللہ کا نام ہے۔ تاہم اس کا بھی جواب دیتے ہیں کہ "الرحمٰن" عرب میں اللہ کے لیے مخصوص تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے:

علم نحو میں ایک بحث ہے غیر منصرف کی۔ اس میں الف نون مزیدتان بھی ایک علت ہیں۔ اس علت کی شرطیت میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ علماء کا کہتا ہے کہ "فعلان" غیر منصرف ہوگا، اس شرط سے کہ اس کی مؤنث "فعلانة" نہ ہو۔ دوسرا گروہ کہتا ہے اس شرط سے کہ اس کی مؤنث "فعلیٰ" کے وزن پر ہو۔ کتاب "کافیہ" جو علم نحو میں ایک مستند کتاب ہے، اُس میں یہ شرط لکھ کر لکھا ہے:

"من ثم اختلف في رحمن"[1]

''اسی لیے رحمٰن کے لفظ میں اختلاف ہے کہ منصرف ہے یا غیر منصرف۔''

''کیونکہ بوجہ اس کے کہ یہ لفظ خاص اللہ کے لیے ہے اس کا صیغہ مؤنث نہیں آتا، نہ "فعلانة" آتا ہے نہ "فعلی"۔ فعلانۃ کی نفی کرنے والے غیر منصرف کہتے ہیں۔ فعلی کی شرط لگانے والے منصرف مانتے ہیں۔ پھر اس میں کیا شک رہا کہ ''الرحمٰن'' عربی ہے اور مخصوص خدا کے ساتھ ہے؟''

تطبیق:

اس عنوان کے ماتحت پادری صاحب نے یہ کام کیا ہے کہ سورہ فاتحہ کو بائبل سے ماخوذ بتایا ہے۔ کس طرح؟ ایک لفظ کہیں سے ایک فقرہ کہیں سے۔ مثلاً

صحف مطهرة	سورة الحمد
ا۔ ''خداوند کی ستائش کرو۔ اے خداوند کے بندو اس کی ستائش کرو۔ خداوند کے نام کی مدح کرو۔'' (زبور ۱۱۳:۱) ''تو ہاں تو ہی اکیلا خداوند ہے تو نے آسمان کو اور آسمانوں کے آسمان کو اور ان کی ساری آبادی کو اور زمین کو اور جو کچھ اس پر ہے اور سمندروں کو اور جو کچھ ان میں ہے بنایا۔ اور تو سبھوں کا پروردگار ہے اور آسمانوں کا لشکر تیرا سجدہ کرتا ہے۔'' (نحمیاہ ۹:۶) ''اور داوٗد نے ساری جماعت کے آگے خداوند کا شکر کیا۔ اور داود نے کہا کہ اے خداوند ہمارے باپ اسرائیل کے خدا تو ابدالآباد مبارک ہو۔ اے خداوند بزرگی اور قدرت اور جلال اور ابدیت اور	ا۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِینَ ۝

[1] شرح الرضي على الكافية (١/ ١٥٧)

حشمت بلکہ سب کچھ جو آسمان اور زمین میں ہے
تیرا ہی ہے۔ اے خداوند بادشاہت تیری ہے۔ اور
تو سبھوں کے اوپر سرفراز ہے۔ اوردولت اور عزت
تیری طرف سے آتی ہیں، اور تو سبھوں پر
بادشاہت کرتا ہے، اور تیرے ہاتھ میں قدرت اور
توانائی ہیں، اورتیرے قابو میں ہے کہ بزرگی اور
زورسب کو بخشے۔" (ا۔تواریخ ۲۹: ۱۰۔۱۲)

۲۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ | ۲۔ "خداوندمہربان اور رحیم ہے۔" (زبور ۱۱۱: ۴)

۳۔ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝ | ۳۔"جیسے ان کے اعمال ہیں ویسے ان کو جزا دے گا۔" (یسعیاہ ۵۹: ۱۸)

۴۔ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝ | ۴۔"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (متی ۴: ۱۰)

"تو خداوند اپنے خدا سے ڈر اور اُس کی بندگی کیا کر
اور اُس کے نام کی قسم کھایا کر۔ تم اور معبودوں کی
قوموں کے معبودوں میں سے جو تمھارے آس
پاس ہیں پیروی نہ کرو کیونکہ خداوند تیرا خدا جو
تمھارے درمیان ہے غیور خدا ہے۔ نہ ہو کہ خداوند
تیرے خدا کے قہر کی آگ تجھ پر بھڑکے اور تمھیں
روئے زمین سے فنا کردے۔"

(استثناء: ۱۳۔۱۵) الخ (ص: ۱۸۔۱۹)

برہان:

پادری صاحب کی سورہ فاتحہ کے متعلق ہی یہ کوشش نہیں کہ اس کو بائبل سے

ماخوذ بتاتے ہیں، بلکہ سارے قرآن کو بائبل سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ ہم پادری صاحب کی اس کوشش کے اس لیے مشکور ہیں کہ آپ اسی طریقہ سے قرآن عیسائیوں میں نہ صرف پہنچا رہے ہیں بلکہ عیسائیوں کا معترضانہ منہ بند کر رہے ہیں کہ قرآنی تعلیم پر اعتراض نہ کرو بلکہ اس کی اصلیت تسلیم کرو۔ ہاں دوسری جانب سے ہم جواب دیتے ہیں جو اُن کی مخفی غرض ہے کہ بائبل کے ہوتے ہوئے قرآن شریف کی حاجت نہ تھی۔

یہ سلسلہ دراصل پادری ٹھاکر داس سے چلا ہے جنھوں نے ایک کتاب اسی عنوان سے لکھی تھی: ''عدم ضرورتِ قرآن''۔ پادری ٹھاکر داس کی کتاب کا جواب تو ہماری کتاب ''تقابل ثلاثہ'' میں ملتا ہے۔ پادری صاحب (مخاطب) کو جواب یہ ہے کہ آپ نے علم بلاغت کی تعریف پر غور کیا ہوتا تو یہ نہ کہتے۔

بلیغ قصیدہ وہ ہے جس کے سب اجزاء متصلہ بلیغ ہوں۔ یہ نہیں کہ اُس میں ایک بلیغ مصرعہ کہیں کا ہو اور دوسرا کہیں کا، اور اُس پر ناظم یہ دعویٰ کرے کہ یہ مصرعہ ملا کر میرا سارا قصیدہ بلیغ ہے۔

سورہ فاتحہ اگر کتب سابقہ سے ماخوذ ہے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر ایک حدیث میں آیا ہے کہ سورۂ فاتحہ جیسی کوئی سورت پہلے نہیں اُتری۔[1] اس حدیث کی توجیہ کرنا اور جواب دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس حدیث شریف میں جو سورہ فاتحہ کی نسبت یہ فرمایا ہے تو مجموعی حیثیت سے ہے نہ کہ اجزاءِ متفرقہ کی حیثیت سے۔ جس طرح بلیغ اور غیر بلیغ کلام پر حکم اُس کی مجموعی حیثیت اور ہیئت سے ہوتا ہے نہ کہ اجزاءِ متفرقہ سے۔

پادری صاحب کو عرب کے مسلمہ شاعر امرؤ القیس کی بلاغت مسلّمہ ہے۔ ہم پوچھتے ہیں امرؤ القیس کے قصیدہ کے سارے فقرات بلکہ الفاظ فصیحہ لے کر کوئی شخص غیر بلیغ مختلف صُوَر میں قصیدہ مرتب کرے، کیا وہ بھی امرؤ القیس کے برابر ہو جائے گا؟

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٥) مسند أحمد (٢/ ٣٥٧)

قانونی جواب:

آج قانونی حکومت ہمارے سامنے ہے، کسی مصنف کی تصنیف میں مختلف مقامات میں چند الفاظ دل آزار ہیں۔ مگر اس طرح کہ کہیں ایک۔ کہیں دو۔ کوئی شخص اُن سب کو یکجا کر کے شائع کرے تو دل آزاری اس کے ذمہ عائد ہوگی، اُس مصنف کے ذمہ نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ متفرق اور متفق کا حکم الگ الگ ہے۔ پس پادری صاحب کی کوشش باوجود سعی بلیغ ہونے کے ہمارے برخلاف نہیں۔

مزید شکریہ:

پادری صاحب نے سورہ فاتحہ پر اظہار رائے ان لفظوں میں کیا ہے:

سورۂ فاتحہ کی شان:

''سورہ فاتحہ اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے نہایت شاندار سورۃ ہے۔ اس کے ہر جملہ سے خدا کی خدائی، اُس کی عظمت اور برتری، اُس کے رحم اور فضل کی عالم گستری، اُس کے بندوں کی طرف سے عجز و نیاز مندی، اطاعت و فرمانبرداری اور حقیقی دعا و التجا ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ویری صاحب نے اپنی انگریزی تفسیر القرآن میں کیا ہی خوب لکھا ہے کہ ''سورہ فاتحہ کی اُس کے حقیقی مقصد کے لحاظ سے کوئی مسیحی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ اول سے آخر تک ایک مخلصانہ دعا ہے جس کو مسیحیانہ طور پر ادا کیا گیا ہے۔ ہر ایک شخص اس کے جواب میں آمین کہہ سکتا ہے۔'' میں کہتا ہوں کہ صرف آمین نہیں بلکہ اس کو ورد کر سکتا ہے اور پڑھ سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ بائبل مقدس کے وہ جواہر ریزے ہیں جن کو ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کے ساتھ ایک ہی سلک میں پرو دیا گیا ہے۔'' (ص:۲۱)

برہان:

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ٤]

یعنی اے کتاب والو! (یہودیو اور مسیحیو) آؤ ہم تم ایک متفقہ امر پر جمع ہو جائیں جو ہم میں اور تم میں برابر ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت نہ کریں۔ اور نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک کریں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا رب (حاجت روا مشکل کشا) بنائے۔

آج سے پہلے اس متفقہ تعلیم سے پادری صاحبان (عماد الدین وغیرہ) انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ صاحب قرآن نے (معاذ اللہ) دھوکہ دیا ہے کہ محض توحید کو ہمارا اور اپنا متفقہ عقیدہ بتایا ہے، کیونکہ ہم محض توحید کے قائل اور عابد نہیں بلکہ توحید فی التثلیث کے قائل ہیں۔ ہمارے مخاطب پادری نے کھلے لفظوں میں تسلیم کیا کہ سورۂ فاتحہ میں مسیحیانہ طور پر دعا کی گئی ہے۔ حالانکہ اسی دعا میں ہے:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ [الفاتحة: ٤]

کچھ شک نہیں کہ اصلی مسیحی مذہب یہی ہے جو سورہ فاتحہ نے بتایا اور پادری صاحب نے اس کی تصدیق فرمائی۔ چنانچہ قرآن شریف نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے:

﴿وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ﴾

[المائدة: ٧٢]

"مسیح نے خود فرمایا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا

اور تمھارا سب کا پروردگار ہے۔"

ہاں مسیح کے بعد جو عیسائی مذہب دنیا میں پھیلا اُس میں توحید خالص نہ رہی۔ یہاں تک کہ عیسائیوں کا مدار نجات عقیدہ "اتھاناسیس" قرار پایا۔ جس کے چند فقرات یہ ہیں:

"باپ (خدا) ازلی۔ بیٹا (مسیح) ازلی اور روح القدس ازلی۔ باپ قادر مطلق۔ بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق۔ اس لیے سب باتوں میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تثلیث میں توحید کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کرنی چاہیے۔" (عقیدہ اتھاناسیس مندرجہ دعاء عمیم ص:۲۴۔۲۵)

ناظرین! جس قوم کے عقیدہ میں تثلیث کی عبادت داخل ایمان ہو وہ ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ﴾ کیسے کہہ سکتی ہے؟ لیکن اس سے کیا مطلب؟ ہم تو اپنے بچھڑے بھائی کو اپنے میں شامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ آہ ؂

یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے
جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

سورۂ فاتحہ پر ایک معنوی سوال:

پادری سلطان محمد صاحب پال نے سورہ فاتحہ پر ایک معنوی سوال بھی کیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

"دوسرا اعتراض یہ ہے کہ الرحمٰن و الرحیم کو دو متصل آیتوں میں دوبارہ ذکر کیا ہے جو نہایت معیوب اور فضول تکرار ہے۔ در اصل یہ اعتراض اُن لوگوں پر وارد ہوتا ہے جن کے نزدیک "بسم اللہ الرحمن الرحیم" الحمد کا جز ہے، اور جن کے نزدیک "بسم اللہ الرحمن الرحیم" الحمد کا جز نہیں ہے ان پر اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے۔ جن کے نزدیک بسم اللہ الخ الحمد کا جز ہے وہ اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دے

سکتے۔ وہ صرف یہ جواب دیتے ہیں کہ ان دو اسموں کی عظمت کی وجہ سے ان کو دہرایا گیا ہے۔" (ص:۱۸)

برہان:

آپ نے تفسیر بیضاوی تو یقیناً سامنے رکھی ہوگی۔ کیا اُس میں آپ کو اس کا جواب نہیں ملا؟ سنیے ہم بتاتے ہیں۔ بسمُ اللہ والے فقرہ کی نوعیت اور ہے، اور الحمد کی اور۔ بسم اللہ میں بلحاظ ابتدا کرنے فعل کے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لایا گیا، جس سے مراد یہ ہے کہ میرے فعل پر ابتدا ہی سے رحمانیت اور رحیمیت شامل ہو۔ جس سے میں اس کے ختم کرنے پر قدرت پاؤں۔ سورۂ فاتحہ میں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو محض بلحاظِ اعتقاد بصفات اللہ رکھا گیا۔ یعنی چونکہ الحمد میں اظہار کیا گیا ہے کہ سب تعریفات اللہ کے لیے ہیں، اُن صفات میں سے خاص چار صفات کاملہ کو بلحاظ اظہار عقیدہ بطور مثال ذکر کیا گیا یعنی رب العالمین۔ الرحمٰن۔ الرحیم۔ مالک یوم الدین۔ پس یہ تکرار بے وجہ نہیں۔

نوٹ:

آپ نے لکھا ہے کہ "جن کے نزدیک بسم اللہ جز نہیں ان پر اعتراض نہیں۔" بہت خوب! آپ کا سابق مذہب حنفی تھا جو بسم اللہ کو جزوِ فاتحہ نہیں جانتے؟ اب بھی آپ کو اختیار ہے آپ یہی مذہب اختیار کریں۔

سورہ فاتحہ کے فضائل:

حدیث شریف میں ہے: سورہ فاتحہ بڑی عظمت کی سورۃ ہے، یہ سبع مثانی ہے، یہ قرآن کا حصہ عظیم ہے۔[1] (بخاری)

حدیث شریف میں آیا ہے سورہ فاتحہ جیسی سورۃ نہ تورات میں نہ زبور میں نہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٤)

انجیل میں بلکہ نہ ایسی کوئی اور سورۃ قرآن میں اتری ہے۔[1] (مؤطا مالک)

حدیث شریف میں ہے خدا نے فرمایا ہے کہ سورۂ فاتحہ مجھ میں اور میرے بندے میں تقسیم ہے، یعنی پہلا حصہ خدا کی تعریف ہے، دوسرا بندے کی درخواست اور دعا ہے۔ حدیث شریف میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے سورہ فاتحہ کو اپنے اور بندہ میں تقسیم کر دیا ہے۔ میرا بندہ جو مانگے میں اُس کو دوں گا۔ جب بندہ نماز میں کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اس کے جواب میں خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ اور جب بندہ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی۔ اسی طرح مالک یوم الدین، اس سے آگے کے الفاظ دعائیہ ہیں، وہ سب بندے کے لیے ہیں، اور بندہ جو مانگتا ہے اُس کو ملے گا۔[2]

(ماخوذ من ابن کثیر: ۱/ ۲۷-۳۰)

تفسیر سورۂ فاتحہ:

انسان دنیا میں متمدن طبع پیدا ہوا ہے، اس کے تعلقات مختلف ہیں، اوپر کی جانب اُس کے ماں باپ دادا نانا وغیرہ بزرگ ہیں، نیچے کی جانب اولاد در اولاد ہے، درمیانی درجہ میں بیوی اور مساوی درجہ کے احباب ہیں۔

ان سب سے بلند تر خدا سے تعلق ہے۔ یہ تعلقات واقعی ہیں، ان سے کسی کو انکار نہیں۔ ان سب تعلقات کے فرائض اور حقوق ادا کرنے کا نام اصطلاحِ قرآن شریف میں ''صراط مستقیم'' ہے کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ

---

[1] موطأ الإمام مالك (١/ ٨٣) مسند أحمد (٢/ ٣٥٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [الأنعام: 151/ 153]

''اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ ادھر آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں گا جو تمھارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں۔ وہ یہ کہ کسی چیز کو خدا کا شریک مت ٹھہراؤ۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو۔ اور مفلسی (کے ڈر) سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو۔ (کیونکہ) ہم (ہی) تم کو (بھی) رزق دیتے ہیں اور ان کو (بھی) اور بے حیائی کی باتیں جو ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں ان میں سے کسی کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اور جان جس (کے مارنے) کو اللہ نے حرام کردیا ہے (اس کو) مار نہ ڈالنا مگر حق پر۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے تاکہ تم (دنیا میں رہنے کا طریقہ) سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے پاس (بھی) نہ جانا مگر ایسے طور پر کہ (اس کے حق میں) بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچے۔ اور انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ کرو اور (پوری

پوری) تول۔ ہم کسی شخص پر اس کی سمائی سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔ (جو) عہد (کر چکے ہو اُس) کو پورا کرو۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کا تم کو خدا نے حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔ اور (اس نے) یہ (بھی ارشاد فرمایا ہے) کہ یہی ہمارا سیدھا راستہ ہے تو اسی پر چلے جاؤ اور (دوسرے) رستوں پر نہ پڑنا کہ یہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا کر تتر بتر کر دیں گے۔ (غرض) یہ (سب وہ باتیں) ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔"

بغور دیکھا جائے تو کامل انسان وہی ہے جو ان سب فرائض اور حقوق کو باحسن طریق ادا کرے۔ انہی تعلقات کے فرائض ادا کرنے کی دعا اس سورۃ میں سکھائی گئی ہے، یعنی یہ سکھایا گیا ہے کہ خدا سے صراط مستقیم پر چلنے کی درخواست کرو۔ درخواست کا طریق بھی از راہ مہربانی خود ہی سکھایا، یعنی یہ سورت بطور مسودہ عرضی نازل فرمائی ہے۔ اے بندو! یوں کہا کرو:

"میں اس کام کو اللہ رحمٰن رحیم کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔ وہ اپنی حمایت کی طفیل میرا کام انجام کو پہنچائے۔ شروع مطلب سے پہلے میں اعتراف کرتا ہوں کہ دنیا میں جس قدر خوبیاں ہیں اُن سب کا مالک یعنی سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، کسی مظہر میں حسن جلوئی نما ہے تو اُس کا خالق بھی خدا ہے، کسی مظہر میں سخاوت رونما ہے تو اُس کا موصوف بھی دراصل اللہ ہے۔ اسی طرح صنعت، حرفت وغیرہ جتنی صفات حسنہ دنیا میں نظر آتی ہیں ان سب کا مخرج چونکہ خدا کی ذات ہے اس لیے سب صفات اللہ ہی کے لیے ہیں۔ دنیا کو سب سے زیادہ خدا کی جس صفت

سے تعلق ہے وہ صفت ربوبیت ہے۔ کیونکہ پرورش نہ ہوتو کوئی چیز زندہ رہ نہیں سکتی۔ وہی خدا ساری دنیا کی سب چیزوں کا پرورش کرنے والا ہے اُس کی پرورش ماں باپ کی پرورش سے نرالی اور مختلف ہے۔ انسانی ضروریات سے پہلے انتظام کرنے والا رحمان ہے۔ اور عین حالت ضرورت میں سامان مہیا کردینے والا رحیم ہے۔ یعنی اُس کی صفت رحمانیت کا تقاضا یہ ہے کہ قبل از حدوث ضرورت دفع ضرورت کے سامان مہیا کرنے والا ہے۔ موجودہ دنیا کا مالک ہے مگر اس دنیا میں بہت لوگ مالکیت کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔ روز جزا میں کوئی کسی نوع کی مالکیت کا دعویٰ نہ کرے گا، اس لیے کہ روز جزا کا واحد مالک خدا ہوگا۔

یہاں تک پہنچ کر داعی اپنا مطلب ظاہر کرنے کو کہتا ہے۔ اے ان صفات کے مالک خدا ہم سب بنی آدم تیرے ہی بندے ہیں، اس لیے تیری عبادت کرتے ہیں۔ جو ہم میں سے ایسا نہیں کرتے وہ بے وقوف ہیں۔

اس کام کی انجام دہی میں تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ پس اے خدا ہم کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ یعنی ایسی توفیق بخش کہ ہم اُن بزرگوں کے طریق پہ چلیں جن پر تو نے ان کی پارسائی کی وجہ اور ادائیگی فرائض متعلقہ کی وجہ سے انعام کیے تاکہ ہم بھی انعام کے مستحق ہوں، نہ ان لوگوں کی راہ پر چلائیو جن کی بدعملی اور قصور ہمت کی وجہ سے ان پر غضب کیا گیا تاکہ ہم بھی ان کے غضب میں شریک نہ ہوجائیں۔ اور نہ گمراہ لوگوں کی راہ پر چلائیو جو جہالت کی وجہ سے سیدھی راہ چھوڑ کر بھٹکے ہوئے ہیں۔ چاہے کفر میں ہیں یا مسلم کہلا کر فسق و فجور یا بدعات میں منہمک۔ کیونکہ ایسے لوگ در اصل سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ گو

قرآن، حدیث یا دیگر علوم پڑھیں تاہم وہ بھولے ہوئے ہیں۔ اے خدا! ہماری یہ دعا اور التجا قبول فرما۔"

سورۂ فاتحہ کی تفسیر مع جواب ختم ہوئی۔ الحمد للہ۔ آج سورہ بقرہ کی تفسیر اور تنقید شروع ہوتی ہے۔

نوٹ: ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اس سلسلہ کو خاص مفید صورت میں مرتب کریں جو علاوہ ''جواباتِ نصاریٰ'' کے قرآن فہمی میں بھی ممد و معاون ہو۔ پس ناظرین سنیں اور اپنے حلقہ اثر میں اشاعت کریں۔

فضائلِ سورہ بقرہ:

اس سورت کے فضائل حدیثوں میں بہت آئے ہیں۔

١ قال رسول الله ﷺ: «لكل شيء سنام، وإن سنام القرآن سورة البقرة، و فيها آية هي سيدة آي القرآن، هي آية الكرسي»[1]

''آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر چیز کا کوہان ہوتا ہے، قرآن شریف کا کوہان سورہ بقرہ ہے۔ اس میں ایک آیت ہے جو آیات قرآنیہ کی سردار ہے، اُس کا نام آیۃ الکرسی ہے۔''

٢ إن رسول الله ﷺ قال: «لا تجعلوا بيوتكم قبورا، فإن البيت الذي تقرأ فيه سورة البقرة لا يدخله الشيطان»[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٨) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا حديث غريب، لا نعرفه إلا من حديث حكيم بن جبير، وقد تكلم شعبة في حكيم بن جبير وضعفه" لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت حسن سند کے ساتھ بایں الفاظ مروی ہے: "إن لكل شيء سناما وإن سنام القرآن سورة البقرة" (سنن الدارمي: ٢/ ٥٣٩، المستدرك للحاكم: ١/ ٧٤٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٧)

''آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: اپنے گھروں کو قبروں کی طرح نہ بناؤ کیونکہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس میں شیطان داخل نہیں ہوگا۔''

٣ قال رسول الله ﷺ: «إن الشيطان يخرج من البيت إذا سمع سورة البقرة»[1]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: شیطان جس گھر میں سورۂ بقرہ کی قراءت سنتا ہے وہاں سے نکل جاتا ہے۔''

٤ قال أبو هريرة: «بعث رسول الله ﷺ بعثا وهم ذو عدد فاستقرأهم، فاستقرأ كل واحد منهم ما معه من القرآن، فأتى على رجل من أحدثهم سنا، فقال: ما معك يا فلان؟ فقال: معي كذا وكذا وسورة البقرة، فقال أمعك سورة البقرة؟ قال: نعم، قال: اذهب فأنت أميرهم»[2]

- ''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت کو کہیں بھیجنا چاہا۔ ان سے قرآن پڑھوایا۔ ایک جوان آدمی کو پوچھا تجھے کیا یاد ہے؟ اُس نے کہا: مجھے فلاں فلاں سورت یاد ہے اور سورۂ بقرہ بھی۔ فرمایا: کیا تجھے سورۂ بقرہ بھی یاد ہے؟ اُس نے کہا: ہاں حضور! فرمایا: جا تو ان کا امیر ہے۔''

---

[1] مسند إسحاق بن راهويه (١/ ٤٢٨) اس کی سند میں کلثوم بن محمد بن ابی سدرہ راوی ضعیف ہے خصوصاً جب وہ عطاء خراسانی سے روایت کرتا ہے، اور مذکورہ بالا حدیث میں اس کا استاذ عطا خراسانی ہی ہے۔ یہ روایت حسن بصری سے مرسلاً بھی مروی ہے۔ (الزهد لابن المبارك، ص: ٢٧٣) اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔ (مصنف عبد الرزاق: ٣/ ٣٦٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٦) اس کی سند میں ''عطاء مولیٰ ابی احمد'' راوی ہے جس کے متعلق حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''لا یعرف'' کہا ہے، اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مقبول'' (ميزان الاعتدال: ٣/ ٧٧، تقريب التهذيب، ص: ٣٩٢)

۵ سمعت رسول اللهﷺ يقول: «يؤتى بالقرآن يوم القيامة، و أهله الذين كانوا يعملون به تقدمهم سورة البقرة و آل عمران»[1]

(ماخوذ من تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۷-۵۹)

''صحابی کہتا ہے میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا کہ قیامت کے روز قرآن کو لایا جائے گا اور اُس پر عمل کرنے والوں کو بھی۔ سورۂ بقرہ اور آلِ عمران اُن سے آگے آگے ہوں گی۔''

ان احادیث کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث سورۂ بقرہ کی فضیلت میں آئی ہیں۔

مضامین سورۂ بقرہ:

اس سورۃ میں بڑے زبردست مضامین ہیں:

(۱)انسان کی تین قسموں مومنوں، کافروں اور منافقوں کا بیان ہے۔ (۲) منافقوں دغابازوں کا ذکر۔ (۳)عبادت کا حکم ۔ (۴) قرآن کی مثل کا مطالبہ۔ (۵)دوزخ کا خوف۔ (۶)خلقِ آدم کا ذکر۔ (۷) بنی اسرائیل کے متفرق حالات۔ (۸)حضرت ابراہیم، بناءِ کعبہ اور تحویلِ کعبہ کا ذکر۔ (۹)محبت خدا کا ذکر۔ (۱۰)قیامت میں افراتفری۔ (۱۱)حلال غذا اور نیک عمل۔ (۱۲) محرمات کا ذکر۔ (۱۳)روزے کا ذکر۔ (۱۴) جہاد کا حکم۔ (۱۵)قصاص کا حکم۔ (۱۶)حج وعمرہ کا حکم۔ (۱۷) دنیا دار مغروروں کا ذکر۔ (۱۸) فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم۔ (۱۹)یتیموں کی اصلاح۔ (۲۰)بیوی خاوند کے احکام۔ (۲۱)اولاد کی پرورش۔ (۲۲)طلاق کا ذکر۔ (۲۳)نماز کی پابندی۔ (۲۴)پہلی قوموں کا جہاد سے انکار اور اُس کا نتیجہ۔ (۲۵)آیت الکرسی۔(۲۶) حضرت ابراہیم اور عزیر کا ذکر۔ (۲۷)خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کا بدلہ۔ (۲۸) سود کا ذکر۔ (۲۹)قرض پر سودا کرنے کا حکم۔ (۳۰)ضروری اور مفید دعاؤں کی تعلیم۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۰۵)

نوٹ: ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ایک ایک رکوع کا ترجمہ مع ضروری تفسیر کے لکھ کر پادری صاحب کی طرف توجہ کیا کریں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کا پہلا رکوع یہ ہے۔

پہلا رکوع:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۱ تا ۷]

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ میں ہوں اللہ بڑا جاننے والا ۔ اپنے علم کی شہادت پر بتاتا ہوں کہ اس کتاب قرآن مجید میں اصلی معنی سے کوئی شک و شبہ وارد نہیں ہوسکتا ۔ یہ تو پرہیزگار لوگوں کے لئے ہدایت نامہ ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو بن دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز با قاعدہ ادا کرتے ہیں اور جو کچھ بھی ہم نے ان کو دیا ہے مال، علم، عزت وغیرہ اُس میں سے نیک راہ میں خرچ کرتے ہیں، یعنی مال محتاجوں کو دیتے ہیں۔ اسی طرح علم سے، عزت سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے کا ان کو اس کتاب میں حکم ہے اور اُن لوگوں کے لئے بھی ہدایت ہے جو اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو اے نبی تیری طرف اُتری اور تجھ سے پہلے اتریں ۔

یعنی اُن کا ایمان حسب ہدایتِ قرآن سب کتابوں پر ہے۔ اور اس کے علاوہ اس دنیا کی زندگی کے بعد پچھلی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں ۔بس یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ زندگی کے مقصد میں کامیاب ہیں ۔ یہ ہے انسان کی قسم اول جو سچ پوچھو تو انسانی نسل کا مکھن ہے۔ باقی رہے دوسرے لوگ اُن میں اول وہ لوگ ہیں جو سچی تعلیم کے منکر ہیں ۔انکار کے ساتھ ہی ایسے ضدی ہیں کہ اے نبی تیرا یا کسی دوسرے ناصح کا سمجھانا اور نہ سمجھانا ان کو برابر ہے وہ ایمان نہ لاویں گے ۔اللہ نے ان کی اس حالت کی وجہ سے اُن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر بندش کی قدرتی مہر کردی ہے ۔اور اُن کی آنکھوں پر حق بینی سے حجاب کا پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۔''

ترکیب نحوی:

آیت مرقومہ میں ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ﴾ کی ترکیب نحوی پر بہت کچھ مدار ہے۔ عام طور پر اس کو ﴿إِنَّ﴾ کی خبر بتائی جاتی ہے۔ پادری پال صاحب کے ترجمے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کے ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:

''بے شک جن لوگوں نے انکار کیا ان کو آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔''

اس ترکیب اور ترجمہ پر ایک سنگین اعتراض ہوتا ہے۔ پادری صاحب نے اس آیت کی ترکیب پر توجہ نہیں کی اور بے مطلب دور از کار مباحث جبر وقدر سے اوراق بھر دیے۔ ہمارے خیال میں ان سب مباحث کا جواب آیت کی نحوی ترکیب صحیح سے حاصل ہوسکتا ہے۔

سنگین اعتراض یہ ہے:

''آیت موصوفہ میں ذکر ہے کہ جو لوگ کافر ہیں وہ ایمان نہ لاویں گے

حالانکہ نزول آیت کے بعد بہت سے کافر ایمان لائے پھر اس آیت کی صداقت کیسے رہی۔"

جواب یہ ہے کہ ترکیب آیت کی یوں ہے: ﴿اِنَّ﴾ حرف مشبہ بالفعل، ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ موصول، ﴿كَفَرُوْا﴾ صلہ، ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ﴾ بدل ہے صلہ سے، تقدیر کلام یوں ہے:

"إن الذين،[1] سواء عليهم إنذارك وعدم إنذارك، لا يومنون"

﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ جملہ فعلیہ خبر ﴿اِنَّ﴾۔

اس ترکیب کی شہادت قرآن کی دوسری کئی ایک آیات سے ملتی ہے اور ہر قسم کے اعتراضات بھی دور ہو جاتے ہیں۔

حروف مقطعات:

پادری صاحب نے ان حروف الف۔ لام۔ میم (الم) پر بہت وقت لیا ہے، اس غرض سے کہ ثابت کریں کہ قرآن شریف میں جس طرح یہ حروف عدیم الفہم ہیں اسی طرح عیسائی مذہب میں مسئلہ تثلیث عدیم الفہم ہے۔ لیکن ہمارا جواب اس میں صاف ہے کہ اول مفسر قرآن ابن عباس جن کی بابت پیغمبر اسلام مبلغ قرآن نے قرآن فہمی کی دعا کی تھی،[2] اُن کا قول ان حروف کے ترجمہ کرنے کی بابت ملتا ہے، تو جو ترجمہ ہم نے کیا ہے یہ اُن ہی کا قول ہے۔ پھر اتنا پیچ و تاب کیا؟!

ہاں پادری صاحب کا مدعا اُن ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"اکثر مسلمان ہم مسیحیوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ چونکہ تثلیث کی تعلیم انسانی سمجھ سے بالاتر ہے اس لیے یہ تعلیم خدا کی طرف سے نہیں ہے کیونکہ خدا ایسی تعلیم نہیں دیتا ہے جس کو انسان نہ سمجھ سکے۔ ہم اس قسم کے معترضین

---

[1] باسقاط مبدل [مؤلف]

[2] مسند أحمد (١/ ٢٦٦)

سے یہ کہتے ہیں کہ تثلیث کو تو کروڑوں انسان نے سمجھ لیا ہے لیکن حروف مقطعات کو کس انسان نے سمجھا ہے؟ ایک نے بھی نہیں۔‘‘ (ص:۲۸)

جواب:

ہم تو قرآن مجید کا کوئی لفظ نا قابل فہم نہیں کہتے ۔ نہ صرف ہم بلکہ سلف سے خلف تک اس کے قائل چلے آئے ہیں۔ امام نووی کا قول صاحب اتقان نے لکھا ہے:

”یبعد أن یخاطب اللّٰہ عبادہ بما لا سبیل لأحد من الخلق إلی معرفتہ.“ ❶

یعنی یہ بات بعید از عقل ہے کہ خدا بندوں کو ایسے کلام سے مخاطب کرے جس کو وہ نہ سمجھتے ہوں۔

علاوہ اس کے ایک مضمون بعید الفہم ہوتا ہے دوسرا ضد الفہم، ان دو میں فرق ہے، مثلاً برقی کام جو آج کل ترقی یاب ہو رہا ہے دیہات میں کسی دیہاتی کی سمجھ میں نہ آئے تو کہا جائے گا اس کے حق میں بعید الفہم ہے۔ لیکن دو دونے پانچ، ضد الفہم ہے۔ اس کا قائل اگر پہلی مثال کو اپنی تائید میں پیش کرے تو کون اس کو صحیح جانے گا؟ قرآن میں اگر کوئی لفظ مبہم ہے تو بعید از فہم ہے۔ تثلیث ضد الفہم ہے۔ اس ہماری مثال کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ تثلیث کی تصویر پہلے معلوم ہو۔ ہم اپنے لفظوں میں تو اُس کی تصویر دکھا نہیں سکتے، اکابر نصاریٰ کے اقوال پیش کرتے ہیں۔

تثلیث کی وضاحت:

مقدس اتھاناسیس جس کے عقیدے کو مسیحی قوم میں مدار نجات جانا گیا ہے، اُس میں لکھا ہے:

’’جو کوئی نجات چاہتا ہے اُس کو سب باتوں سے پہلے ضرور ہے کہ عقیدہ جامعہ رکھے۔ عقیدہ جامعہ یہ ہے کہ ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید

❶ الإتقان للسیوطي (۲/ ۷) نیز دیکھیں: شرح مسلم للنووي (۱۶/ ۲۱۸)

میں تثلیث کی پرستش کریں، نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں۔ کیونکہ باپ ایک اقنوم، بیٹا[1] ایک اقنوم اور روح قدس ایک اقنوم۔ مگر باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر۔ عظمت ازلی یکساں۔ جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح القدس۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی۔ آخر تک۔'' (دعاء عمیم۔ ص:۲۴)

پادری فنڈر لکھتے ہیں:

''مسیح بندہ بھی ہے اور مالک بھی ہے۔ اور آدمی ہے اور خدا بھی ہے۔''

(مفتاح الاسرار ص:۱۹)

اسی مضمون کی تفصیل دوسری کتاب میں یوں کی ہے جو قابل دید ہے:

''وہ کلمہ جو ابتدا میں خدا کے پاس تھا جس سے خدا نے ازل سے اپنے تئیں پیغمبروں پر بیان کیا اور اُسی کے وسیلے سے سب چیزیں پیدا ہوئیں یعنی ذاتِ الٰہی کی وہ خصوصیت جو انجیل کی آیتوں کے مطابق خدا کے بیٹے کے لفظ سے بیان کی گئی مجسّم ہوا اور بشریت کو گویا لباس کی طرح اپنے اوپر قبول کر کے آدمیوں میں رہا۔ چنانچہ یوحنا کی پہلی فصل کی ۱۴/ آیت میں ذکر ہوا ہے کہ کلمہ مجسّم ہوا اور وہ فضل وراستی سے بھر پور ہو کے ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اُس کا ایسا جلال دیکھا جیسے باپ کے اکلوتے کا جلال۔ پھر فلپیوں کی ۲/ فصل کی ۶/ آیت سے ۱۲/ آیت تک لکھا ہے کہ اُس نے خدا کی صورت میں ہو کے خدا کے برابر ہونا غنیمت نہ جانا بلکہ اُس نے آپ کو عاجز بنایا اور خادم کی صورت پکڑ کے آدمی کی شکل بنا۔ اور آدمی کی صورت میں ظاہر ہو کے آپ کو فروتن کیا اور مرنے تک بلکہ صلیبی موت تک فرمابردار رہا۔ اس واسطے خدا

---

[1] یسوع مسیح [مؤلف]

نے اُسے بہت سرفراز کیا۔ اور اُس کو ایسا نام جو سب ناموں سے بزرگ ہے بخشا، تاکہ یسوع کے نام پر کیا آسمانی کیا زمینی اور کیا جو زمین کے تلے ہیں ہر ایک گھٹنا ٹیکے اور ہر ایک کی زبان اقرار کرے کہ یسوع مسیح خداوند ہے تاکہ خدا باپ کا جلال ہووے۔ پس جسم کی رو سے مسیح کھانے اور پینے اور سونے اور جاگنے اور خوشی وغم میں ہم سب آدمیوں کی طرح ہو کر انسان کی مانند تھا لیکن گناہ سے مبرّا تھا اور کوئی گناہ اُس سے سرزد نہ ہوا جیسا کہ پہلے پطرس کی ۲ر فصل کی ۲۲ر آیت میں ذکر ہوا ہے کہ اُس نے گناہ نہ کیا اور اُس کی زبان میں چھل بل نہ پایا گیا۔ اور عبرانیوں کی ۷ر فصل کی ۲۶ر آیت میں مرقوم ہے کہ وہ پاک اور بے بد اور بے عیب، گنہگاروں سے جدا، اور آسمانوں سے بلند ہے۔ اور یہ جو انجیل میں کہا گیا ہے کہ باپ نے بیٹے کو بھیجا اور یسوع مسیح کا لقب انسان کا بیٹا بھی ہوا۔ اور لکھا ہے کہ دُکھ سہہ کے صلیب پر مرا اور دفن ہوا پھر جی اُٹھا۔ اور خود یسوع مسیح اقرار کرتا ہے کہ باپ مجھ سے بڑا ہے اور میں اس لیے نہیں آیا کہ اپنی خواہش پوری کروں بلکہ اُس کی خواہش جس نے مجھے بھیجا ہے۔ اور چونکہ وہ سلسلۂ انسانی کا واسطہ اور شافع ہے لہٰذا اُس نے خدا سے دعا و مناجات اور شفاعت کی۔ پس اس قسم کے جتنے افعال کہ مسیح سے سرزد ہوئے بشریت کے تقاضا سے تھے نہ تقاضائے الوہیت سے۔ اور اگر تو سوال کرے کہ آیا کیونکر ہوسکتا ہے کہ الوہیت اور بشریت دونوں مل جائیں تو ہم بھی تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ بھلا یہ کیونکر ہوا کہ روح وجسم دونوں باہم مل گئے جیسا کہ انسان کے وجود میں ملے ہیں۔

سوایسے سوالوں کا جواب اتنا ہی کافی ہے کہ حکیم مطلق ہر بات پر قادر ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی عین حکمت سے کرتا ہے۔ اور خداوند تعالیٰ کی حکمت میں بحث کرنا بڑی کم خردی اور غرور ہے اور آدمی کو صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے

کہ یہ مطلب کلام الٰہی میں واضح و ثابت ہوا ہے۔ اور خدا کے کلام سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسیح میں الوہیت و بشریت کامل جانا خدا کے ایک ارادۂ عظیم پورا ہونے کے لیے واقع ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسی وسیلہ سے آدمی ہلاکت ابدی سے بچیں اور خدا کے مقرب ہوکر نیک بختی ابدی کے مالک بنیں۔''

(میزان الحق ص:۱۴۹تا۱۵۱)

اسی کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت ملالیں:

''انجیل کے ان مقامات سے صاف ظاہر ویقین ہے کہ یسوع مسیح صرف تعظیم کی راہ سے خدا کا بیٹا نہیں کہلاتا بلکہ فی الحقیقت الوہیت کے مرتبہ میں ہے اور صفات الوہیت اُس میں پائی جاتی ہیں اور وہ خدا کے ساتھ ایک ہے اور خود خدا ہے۔'' (میزان الحق ص:۱۴۶ مطبوعہ ۱۸۹۲ء)

پادری صاحب! مسیح کو خدا کہنا عقل سے باہر ہے یا عقل کے خلاف ہے؟ اور سنیے! جس اخبار ''نور افشاں'' کے پادری پال صاحب آج کل ذمہ دار مدیر ہیں، اُسی میں ایک دفعہ تثلیث کی تصویر چھپی تھی جو ہو بہو ہم نقل کرتے ہیں۔

''مسئلہ تثلیث پر چند خیالات''

''ہمارے قابل داد و قابل فخر مسیحی بزرگوں اور علما نے مسئلہ تثلیث کو منطقانہ و فلسفانہ طور پر نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کر کے دنیا کے روبرو پیش کردیا ہے۔ مگر اُن کی پُرزور فلسفانہ تقریر کے سمجھنے میں اکثر لوگ قاصر ہیں۔ لہٰذا مسئلہ تثلیث ذیل کی عبارت میں بہت سادہ وصاف الفاظ میں تحریر کرکے امید کی جاتی ہے کہ عام فہم صاحبان اس کو بخوبی سمجھ کر فائدہ اُٹھائیں گے۔

① ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا ور کلام خدا تھا۔ یوحنا پہلا باب پہلی

آیت۔ یہ آیت تین جملوں سے مرکب ہے۔ یعنی

ابتدا میں کلام تھا	کلام خدا کے ساتھ تھا	کلام خدا تھا
خدا	خدا	خدا

چونکہ کلام خدا تھا۔ لہٰذا اگر ہم لفظ خدا کو تینوں جملوں کے نیچے لکھ دیں تو صاف طور پر ظاہر ہو جائے گا کہ تینوں جملے ایک ہی معنی رکھتے ہیں، یعنی خدا کے۔ یہ دراصل تثلیث ہے۔ مگر

خدا	خدا		خدا
باپ	بیٹا	اور	روح القدس

کو کیونکر تثلیث مانا جائے جب کہ یہ معلوم نہیں کہ خدا کا باپ، بیٹا اور روح القدس سے جدا گانہ طور پر کیا رشتہ ہے۔ تو بھی اس کو تثلیث تسلیم کرتے ہیں۔ اور اگر لفظ خدا جو تینوں جملوں میں عام ہے نکال دیا جائے تو صرف الفاظ :

باپ بیٹا روح القدس

باقی رہ جاتے ہیں جو کچھ معنی نہیں رکھتے۔ وہ صرف اپنے لفظی معنی رکھتے ہیں مگر تثلیث کے مسئلہ میں ان تینوں لفظ کا استعمال لازمی اور ضروری بھی ہے۔ لہٰذا دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

اول: ان تینوں لفظ کا استعمال مسئلہ تثلیث میں کس مطلب اور غرض کے لیے ضروری سمجھا گیا۔

دوم: یہ تینوں لفظ کیوں کر ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ جس کا ثابت کر کے دکھلانا ضروری ہے۔ ورنہ مسئلہ تثلیث کوئی معنی نہیں رکھتا۔

② **تشریح:** الف۔ انجیل مقدس سے ظاہر ہے کہ مسیح کی پیدائش ایک غریب اور معجزانہ پیدائش تھی۔ یعنی مسیح بغیر دنیاوی باپ کے معجزانہ طور پر کنواری مریم

سے پیدا ہوا۔ سب مسیحی اس کو مانتے ہیں اور نیز قرآن بھی اس امر کی صداقت کا شاہد ہے۔

ب۔ انجیل مقدس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ خدا نے کہا یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں ۔تم اُس کی سنو۔ یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہیں کہ خدا بغیر بی بی یا جوڑہ رکھتے ہوئے اپنے کو باپ اور مسیح کو بیٹے کے نام سے نامزد کرتا ہے۔ یہ شان ایزدی ہے اور اُس کے حکم کو ماننا ہمارا فرض ہے۔ اُس کے سامنے کچھ غیر ممکن نہیں۔ وہ پتھروں سے بھی بچے پیدا کرسکتا ہے اور اُن کو اپنا بیٹا اور بیٹیاں کہہ سکتا ہے۔ ہماری ہستی کیا ہے کہ ہم خدا سے سوال کریں کہ تونے اپنے کو خدا کیوں نامزد کیا۔ تونے آسمان اور زمین کو کیوں بنایا۔ جو تو حکم کرتا ہے وہ کیوں ہوجاتا ہے۔ تونے فرشتوں کو فرشتے کے نام سے کیوں نامزد کیا۔ تونے ہم کو اندھا، لنگڑا، لنجا کیوں پیدا کیا وغیرہ۔ یہ الٰہی مرضی ہے اور ہم اُس کے فعل اور ارادوں میں مخل نہیں ہوسکتے اور نہ اُس کی خبر غیب رکھتے ہیں۔ خدا اپنے کو باپ اور مسیح کو اپنا بیٹا کہتا ہے۔ یعنی خدا اور باپ ایک اور مسیح اُس کا بیٹا۔ اور ہم کو محض اُس کے حکم کی تعمیل بجالانا ہے اور بس۔ لہٰذا ہم کو ذیل کے الفاظ دستیاب ہوئے۔ یعنی:

خدا باپ	بیٹا

نوٹ: ممکن ہے کہ خدا نے دنیاوی اور جسمانی تقاضا کو مٹانے اور حل کرنے کی غرض سے مسیح کو بیٹا کہا کیونکہ مریم مقدس روح القدس سے حاملہ ہوئی تھی جو ایک الٰہی بھید تھا اور انسان کے فہم سے بعید ہے۔ مسیح جو معجزانہ طور پر عورت سے پیدا ہوا اُس کا کوئی باپ بھی ہونا چاہیے۔ اور چونکہ مقدس مریم روح القدس سے حاملہ

ہوئی۔ لہٰذا روح القدس مسیح کا باپ ہے۔ روح القدس اور خدا ایک ہیں۔ جیسا کہ آگے کو ثابت کر کے دکھایا گیا ہے لہٰذا خدا مسیح کا باپ ہے۔

ج۔ انجیل مقدس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مسیح جو معجزانہ طور پر بغیر باپ کے کنواری مریم سے پیدا ہوا وغیرہ کامل انسان اور کامل خدا بھی تھا۔ یعنی مسیح انسانی اور الٰہی دونوں ذاتیں رکھتا تھا اور اسی میں تثلیث کا بھید موجود ہے۔ جب گناہ سرزد ہوا تب خدا نے جو ہم کو پیار کرتا ہے چھوڑ نہیں دیا۔ بلکہ ہماری گناہ سے نجات پانے کی صورت اُس نے مسیح کے ذریعہ سے پیدا کی۔ اگر مسیح نہ آتا تو نجات غیر ممکن تھی۔ کیونکہ تمام انبیاء ناکام ہو چکے تھے اُس کا آنا لازمی اور ضروری ٹھیرا۔ کیونکہ خدا چاہتا تھا کہ انسان ہلاک نہ ہو اور ایمان لا کر بچ جاوے۔ لہٰذا مسیح نے انسانی صورت اختیار کی۔ اُس کے بغیر کوئی دوسرا طریقہ نجات کا نہ تھا۔

واضح رہے کہ خدا نے ایسے مسیح کو جو کامل انسان تھا اور انسانی ذات بھی رکھتا تھا۔ جو معجزانہ طور پر بغیر باپ کے کنواری سے پیدا ہوا اپنا بیٹا کہا، نہ کہ اُس کامل خدا کو جو ایسے مسیح میں الٰہی ذات بھی رکھتا تھا، جو خود خدا تھا، اپنا بیٹا کہا۔ خدا کے اوپر کوئی دوسرا خدا نہیں جو خود خدا ہو کر اپنے آپ کو بیٹا کہے۔ خدا کا کوئی مالک نہیں جو خدا کو حکم دیوے۔ خدا نے اُس مسیح کو جو کامل انسان تھا بیٹا کہا نہ کہ اُس مسیح کو جو کامل خدا نہیں تھا، اور الٰہی ذات رکھتا تھا۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اُس کے خلاف گوئی کلمہ کفر ہے۔ اب سوال لازم آتا ہے کہ مسیح جو کامل انسان اور کامل خدا بھی تھا۔ کیا وہ خدا اور بیٹا دونوں بھی تھا۔ اس کا جواب ہے کہ ہاں۔ وہ انسانی طور پر بیٹا اور روحانی طور پر خدا تھا۔

د۔ اب ہم تثلیث کے تیسرے لفظ یعنی روح القدس پر غور کریں کہ روح القدس کیا

ہے۔ روح القدس خدا کی پاک روح ہے۔ خدا کیا ہے، خدا روح ہے، پس جب روح القدس روح ہے اور خدا بھی روح ہے تو خدا اور روح القدس بھی ایک ہی ہیں۔ اور جب خدا اور بیٹا ایک ہیں تو روح القدس اور باپ اور بیٹا بھی ایک ٹھیرے۔ اب تثلیث کا تیسرا نقطہ بھی حل ہوا جیسا کہ ذیل میں تحریر ہے۔ یعنی:

خدا	خدا	خدا
باپ	بیٹا	روح القدس
کلام	کلام	کلام

۶۔ اب اگر ہم اصل تثلیث نمبر ایک کا لفظ کلام مندرجہ بالا مسئلہ تثلیث کے لفظوں کے نیچے لکھ دیں تو جس تین لفظ کو آپ کسی پہلو یا کسی طور سے لے کر دیکھیں تو وہی ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ یعنی خدا کے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ لفظ باپ و بیٹا اور روح القدس گو تین علیحدہ لفظ ہیں مگر ان کے معنی ایک ہیں۔ اور نیز یہ کہ مسئلہ تثلیث میں ان کے استعمال کرنے کی ضرورت اور غرض اور مطلب کیا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کر کے دکھایا گیا ہے۔

(۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبل اس کے گناہ دنیا میں سرزد ہوا، بنی نوع انسان تثلیث کو محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت نجات کی کوئی ضرورت نہ تھی یا سمجھی نہ گئی۔ گو تثلیث بہت صاف اور سادہ طور پر موجود تھی جیسا کہ نمبر ایک میں تحریر ہے۔

جب گناہ سرزد ہوا تو خدا اور انسان میں جدائی ہوگئی اور گو بہت پیغمبر صاحبان تشریف لائے۔ وہ انسان کی سخت دلی کے سبب اس گناہ کی دیوار کو جو انسان اور خدا کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی توڑ نہ سکے۔ مگر خدا نے انسان کو ایسا پیار کیا کہ اُس نے خود بحیثیت بیٹے کے مسیح میں انسانی صورت اختیار کی اور بیٹے کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوا تا کہ جو کوئی

اُس پر ایمان لائے بچ جائے اور گناہوں کی معافی حاصل کرے۔ اگر مسیح باپ (بیٹا) نہ آتا اور ہمارے بدلے گناہوں کو اپنے سر پر نہ اٹھا لیتا تو انسان کی نجات پایۂ تکمیل کو ہرگز نہ پہنچتی۔ چونکہ باپ (بیٹا) خود آیا اور دنیا میں انسانی صورت اختیار کی لہٰذا اُس کی الٰہی ذات کو جیسا کہ اصل تثلیث میں ہے دیگر ضروری الفاظ میں یا تین صورتوں یا تین اقانیم میں بیان کرنا پڑا جو تثلیث ہے جس کو انسان اپنی نجات کے لیے محسوس کرتا ہوا اُس الٰہی سچائی اور حقیقت کے بھید سے انکار کرنے لگا۔ یعنی:

خدا	خدا	خدا
باپ	بیٹا	روح القدس

جس کے معنی یہ ہیں خدا (باپ) نجات دینے والا۔ خدا (بیٹا) گناہ سے مخلصی دینے والا اور خدا سے ملانے والا اور خدا (روح القدس) انسان کا نور اور راہنمائی کرنے والا جو تین ایک اور ایک تین خدا واحد ہے۔ آمین۔''

برہان:

ناظرین! یہ ہے مسئلہ تثلیث کی تصویر اور اُس پر فلسفانہ تنویر، مگر کسی کی سمجھ میں آئی بھی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ساری تقریر اس شعر کی مصداق ہے ؂

کہہ گیا ہوں جنون میں کیا کیا
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ایک ہی شخص خدا بھی اور بندہ بھی۔ معلوم نہیں کہ ایسا کہنے والے خدا کو کیا سمجھتے ہیں اور اپنے سامعین کو عقل سے اتنا خالی کیوں جانتے ہیں؟ سیدھی بات ہے کہ خدا کی ذات میں داخل ہے کہ نہ اُس کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ اور انسان کی ذات میں داخل ہے کہ اُس کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ پھر ایک ہی شخص میں یہ دو متضاد

اوصاف داخل فی الذات کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟

پادری صاحب! جمع ضدین بیرون عقل نہیں بلکہ خلاف عقل ہے۔ کوئی شخص آن واحد میں رات اور دن کے وجود کا اعتقاد رکھے اور کہے کہ یہ عقیدہ عقل سے باہر ہے۔ تو کہا جائے گا ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست [1]

اسی لیے سچے رسول کی ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ حالی مرحوم نے یوں کیا ہے ؎

نصاریٰ نے جس طرح کھایا ہے دھوکہ
کہ سمجھے ہیں عیسیٰ کو بیٹا خدا کا
مجھے تم سمجھنا نہ زنہار ایسا
مری حد سے رتبہ بڑھانا نہ میرا
سب انساں ہیں واں جس طرح سر فگندہ
اُسی طرح ہوں میں بھی اک اُس کا بندہ

ذٰلك الكتاب:

پادری صاحب کی تفسیر نویسی سے غرض ہی یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے خود اسلامی لباس اتار کر مسیحی لباس پہن رکھا ہے، قرآن مجید بھی اسلامی لباس اتار کر عیسائی لباس پہن لے: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ [النساء: ٨٩]

ہم مانتے ہیں کہ کتب نحو میں لکھا ہے کہ ”ذٰلك“ بعید کے لیے ہے۔ مگر قرآن مجید کی اصطلاح میں بہت جگہ ”ذٰلك“ ایسے مواضع میں آیا ہے کہ وہاں بعید کے معنی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

---

[1] دلبرتم سخن شناس نہیں، یہی غلطی ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۞ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ﴾ [النساء: ۱۵۰، ۱۵۱]

''جو لوگ کافر ہیں اور ارادہ کرتے ہیں کہ اللہ اور رسولوں کے ماننے میں فرق کریں کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض سے انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راستہ اختیار کریں۔ یہی پکے کافر ہیں۔''

اس آیت میں ''ذٰلك'' سے وہی مراد ہے جو اس لفظ کے متصل مذکور ہے یعنی تفریق۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴾ [الإسراء: ۱۱۰]

''دعا کے وقت نہ اپنی آواز بلند کیا کرو۔ نہ بالکل نیچی۔ اس کے درمیان راستہ اختیار کرو۔''

چنانچہ پہلے پارے کے دوسرے ربع سے ہم آپ کو چند مواقع دکھاتے ہیں جہاں تھوڑے سے حصے میں کتنی دفعہ اسم اشارہ ''ذٰلك'' یا ''ذٰلکم'' آیا ہے۔ توجہ سے سنیے!

① ﴿ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴾ [البقرة: ٤٩]

② ﴿ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرة: ٥٤]

③ ﴿ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ ﴾ [البقرة : ٦١]

❹ ﴿وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا﴾ [البقرة: ٦١]

❺ ﴿وَ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ [البقرة: ٦٣، ٦٤]

ان آیات میں اشارہ بعید کی طرف نہیں ہے بلکہ اسی مضمون کی طرف ہے جو "ذٰلك" سے پہلے متصل مذکور ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ، جن کا فارسی ترجمہ اصح التراجم سمجھا گیا ہے، ان آیات میں اشارہ قریب کی طرف لفظ ''ایں'' کے ساتھ فرماتے ہیں۔

اگر آپ ہماری نہ سنیں نہ شاہ صاحب کی سنیں تو ہم آپ کو آپ کے سابق عالم بڑے پادری (عمادالدین متوفی) کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ آپ دیکھیے انھوں نے بھی ان مواقع میں وہی ترجمہ اختیار کیا ہے جو ہم نے کیا ہے۔ بلکہ اصل متنازع مقام ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ کا ترجمہ بھی یوں کیا ہے:

''اس کتاب میں شک نہیں''

پادری صاحب! اپنی غرض کے لیے دوسرے کے کلام کو بگاڑنا اہل علم کی شان سے بعید ہے ؎

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

اسی قسم کی کئی ایک مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ پس اس "ذٰلك" کو بعید کے لیے کہنا، پھر اس سے عظمتِ شان مراد لینا ہمارے نزدیک محض تکلف اور اصطلاحِ قرآن سے دور ہے۔ اسی لیے علم نحو کی مستند اور درسی کتاب شرح جامی میں لکھا ہے کہ ذا۔ ذاك اور ذٰلك ایک دوسرے کے مقام پر بولے جاتے ہیں۔ اسی لیے مصنف کافیہ نے اس تفریق کو پسند نہیں کیا۔[1] فافہم

[1] دیکھیں: شرح الرضي على الكافية (٢/ ٤٧١)

ہاں اس سے بائبل مراد لینا تو بالکل اس محبانہ مصرعہ کا مصداق ہے ؎

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

آپ کے اس دعوے سے مجھے قرآن کے حق میں یہ عقیدہ پختہ ہوا کہ واقعی قرآن مجید عالم الغیب خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس کے علم میں تھا کہ پادری پال صاحب اس آیت ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ کو بائبل پر لگائیں گے۔ اس لیے اُس نے اس کا جواب ایسا مخفی اشارہ سے دیا جو راسخ فی العلم کے سمجھنے اور ماہر قرآن کے قابل قدر ہے۔

سنیے! جو مضمون سورہ بقرہ کے شروع میں ہے اور جس عنوان سے ہے وہی مضمون اُسی عنوان سے سورہ سجدہ میں بیان کیا ہے مگر اس طرز سے کہ سورہ بقرہ والی آیت کی ایسی تفسیر ہوتی ہے کہ پادری صاحب کو جرأت نہ ہو سکے کہ اس آیت کو بائبل کے حق میں کہیں۔ پس ناظرین کرام غور سے سنیں۔ ارشاد ہے:

﴿ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ [السجدة: ١ تا ٣]

یعنی الٓمّٓ کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کا نزول اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ مخالف لوگ کہتے ہیں اس (محمد رسول اللہ) نے اپنے پاس سے اسے بنایا۔ نہیں بلکہ یہ کتاب واقعی تیرے رب کی طرف سے ہے۔ تاکہ تو (اے رسول) اُس قوم کو سمجھائے جن کے پاس کوئی سمجھانے والا تجھ سے پہلے نہیں آیا تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

اس آیت کو ہم نے پادری صاحب کا جواب ان وجوہ سے سمجھا:

1. شروع میں ﴿الٓمّٓ﴾ کا ہونا جیسے سورہ بقرہ میں۔
2. دونوں میں ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کا ہونا۔

۳ بقرہ میں ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ اور اس میں ﴿لِتُنْذِرَ﴾ دونوں ہدایت کے معنی میں ہیں۔

غرض ان دونوں آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی مضمون بیان کرتی ہیں۔

یہ تو بالکل بدیہی بات ہے کہ پچھلی آیت میں آنحضرت ﷺ کو خطاب اور کتاب کے نزول کی وجہ بتائی ہے۔ ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا﴾ اس فقرہ سے صاف ثابت ہے کہ ﴿لَا رَيْبَ﴾ والی کتاب وہی ہے جو اس کے مخاطب (محمد رسول اللہ) پر اتری ہے۔ یعنی قرآن۔ باوجود اس وضاحت کے پادری صاحب اگر سورہ بقرہ والی آیت سے بائبل ہی مراد لیتے رہیں گے تو قرآن مجید سے ایک اور جگہ پر اس کا جواب یوں ہوگا:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ [البقرة: ٢٦]

ذلک الکتاب سے مراد:

اس تحقیق کے بعد ضرورت نہیں کہ مزید کچھ لکھا جائے، لیکن ہم اپنی عادت کے مطابق آپ کا عندیہ آپ کے الفاظ میں مسلمانوں تک پہنچانے میں بخل نہیں کرتے۔ جو آپ نے لکھا ہے بعینہ درج ہے:

''قرآن شریف پر تو لفظ ''ذٰلك'' کا اطلاق کسی صورت میں بھی صحیح طور پر چسپاں نہیں ہوسکتا ہے۔ اول تو اس لئے کہ قرآن شریف حاضر اور موجود تھا، اس لیے اس کے لیے لفظ ''هذا'' لانا چاہیے تھا نہ کہ لفظ ''ذٰلك''۔ دوم اس لیے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو اس وقت تک قرآن شریف مکمل نہیں ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کا مشارٌ الیہ قرآن نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر مسلمان یہ کہیں کہ اس کا مشارٌ الیہ وہ چند سورتیں ہیں جو سورۂ بقرہ سے قبل مکہ میں نازل ہو چکی تھیں نہ کہ کل قرآن۔ (تفسیر کبیر: ۱/ ۱۵۶)

''تو ہمارا یہ جواب ہے کہ اگر ہم آپ کی اس تاویل بعید کو صحیح تسلیم کر لیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ قرآن شریف کی وہ باقی سورتیں جو سورۂ بقرہ

کے بعد نازل ہوئی ہیں مشکوک ہوں گی۔ اور ان تمام صفات سے خالی ہوں گی جن کا ذکر ان آیات میں ہے۔ پس حقیقت اور صحیح یہی ہے کہ ذلک الکتاب سے بائبل مقدس ہی مراد ہے۔ کیونکہ بائبل مقدس کا خاص نام قرآن شریف میں الکتاب ہی آیا ہے جو لفظ بائبل کا ہم معنی ہے۔ اور بائبل مقدس ہی وہ کتاب ہے جس کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور خدا سے ڈرنے والوں کو الٰہی راستہ بتاتی ہے۔ چنانچہ بائبل مقدس کا دوسرا نام قرآن میں ہدایت اور تیسرا نام موعظت بھی آیا ہے۔" (سلطان التفاسیر، ص:۲۹)

برہان:

پہلی وجہ کا جواب پہلے ہو چکا کہ "ذلك" بمعنی "ھذا" بکثرت قرآن مجید میں آیا ہے۔ دوسری وجہ کا جواب بھی آسان ہے جو علم نحو کے اصول پر مبنی ہے۔

علم نحو میں اسم کی ایک قسم اسم جنس بھی ہے۔ جس کا استعمال قلیل، کثیر، جز، اور کل سب پر ہوتا ہے۔ ہندی میں اس کی مثالیں گیہوں، چاول، گوشت، کتاب اور قرآن بھی ہے۔ مسلمانوں کو آپ نے سنا ہوگا آپس میں کہا کرتے ہیں: "میاں آج تم نے قرآن تلاوت کیا تھا؟ ہاں بھائی آج میں نے نماز فجر کے بعد قرآن پڑھا تھا" کیا سارا؟ نہیں بلکہ اسم جنس کے ماتحت جیسا موقع ہو۔

اسم جنس کے متعلق دوسرا قانون یہ بھی ہے کہ جو وصف اُس کا ذاتی ہو وہ جیسا کل میں ہوگا جزء میں بھی علی قدرہ پایا جائے گا۔ مثلاً پانی اسم جنس ہے۔ جو تاثیر (برودت) کثیر پانی میں ہے وہی ایک قطرہ میں بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جملہ قرآن کی نسبت یہ وصف آیا ہے:

﴿ إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ﴾ [الإسراء: ٩]

"تحقیق یہ قرآن مضبوط راستے کی ہدایت کرتا ہے۔"

اسی طرح "ریب" کی نفی جملہ قرآن سے کی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [السجدة: ٢]

پس اسم جنس کے قاعدے سے جزء قرآن (ایک سورہ) بھی قرآن ہے۔ اور جو وصف عدم ریب اور ہدایت سارے قرآن میں ہے وہ اُس کے ہر جزء میں بھی ہے۔

بائبل کی مزید تحقیق زیر آیت: ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ آئے گی۔ إن شاء اللّٰه، فانتظر.

لَا رَيْبَ:

پادری صاحب نے ﴿لَا رَيْبَ﴾ کی آیت پر بھی دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلائی ہے۔ یعنی بعض ملحدین کا اعتراض نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اگر ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے نزدیک وہ قابل شک نہیں (تو غلط ہے) کیونکہ ہم شک کرتے ہیں۔ اوراگر اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے نزدیک وہ قابل شک نہیں ہے تو اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔" (ص:٣٠)

جواب:

نہ اُن ملحدین معترضین نے لاریب کا محاورہ سمجھا نہ پادری صاحب نے غور فرمایا۔ محل اس کلام کا وہاں ہوتا ہے جہاں متکلم علی الیقین کوئی بات صحیح کہے۔ مخاطب کے شک سے انکار کرنا مقصود نہیں بلکہ محض کلام کا علی وجہ الیقین ہونا بتایا جاتا ہے۔ علم معانی و بیان میں جو قاعدہ "اِنَّ" اور "اَنَّ" کا لکھا ہے کہ کلام کو مؤکد اور مخاطب کو یقین دلانے کے لیے آتے ہیں جیسے یہ شعر:

جَاءَ شَقِيقٌ عَارِضاً رُمْحَهُ إِنَّ بَنِي عَمِّكَ فِيهِم رِمَاحُ

''شقیق نیزہ لٹکا کر آ رہا ہے اُسے خیال ہے کہ ہم لوگ غیر مسلح ہیں۔ اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ ہم میں بھی اسلحہ موجود ہیں۔''

یعنی وہ ہمارے مسلح ہونے سے عملاً منکر ہے مگر ہم اسے یقین دلاتے ہیں کہ ہم مسلح ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آیت موصوفہ ہے۔ عربی میں اس کی تقدیر کلام یوں ہے:

''إن هذا الكتاب هدى للمتقين''

یہ نہیں کہ مخاطب اس میں شک نہیں کرتے کیونکہ مخاطبوں کا شک تو خود منزلِ قرآن کو مسلّم ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا... ﴾ [البقرة: ٢٣]

''اگر تم اس میں شک کرتے ہو تو اس جیسی سورت بنا لاؤ۔''

پادری صاحب نے تفسیر کبیر سے سوال نقل کیا ہے مگر وہاں اس کا جواب جو لکھا ہوا ہے اسے نہیں چھوا۔ ہم نے اُس جواب کو نقل نہیں کیا اس خیال سے کہ شاید پادری صاحب کو وہ جواب ناپسند ہو اس لیے جدید جواب عرض کیا ہے۔ فافھم

ہدیٰ اور متقی کی تفسیر:

''لا ریب'' پر اعتراض کے بعد پادری صاحب نے ''ھدی'' اور ''متقی'' کی تفسیر میں علما کے اقوال نقل کر کے حرف مطلب یوں لکھا ہے:

''احادیث کے رو سے متقی وہ ہے جس کی تقدیر میں متقی ہونا اس کی ماں کے پیٹ میں مقرر ہو چکا ہو۔ اور شقی وہ ہے جس کی تقدیر میں شقی ہونا اس کی ماں کے پیٹ میں مقرر ہو چکا ہو۔ جس پر ذیل کی احادیث گواہ ہیں:

① ''روایت ہے ابن مسعود سے کہ کہا رسول اللہ ﷺ نے اور وہ سچے ہیں سچ کیے گئے، تحقیق پیدائش ایک تمھارے کی یہ ہے کہ جمع کیا جاتا ہے

بیچ پیٹ ماں اپنی کے چالیس دن نطفہ۔ پھر ہوتا ہے خون جما ہوا مانند اسی کے (یعنی چالیس دن تک) پھر ہوتا ہے ٹکڑا گوشت کا مانند اسی کے (یعنی چالیس دن تک) پھر بھیجتا ہے اللہ طرف اس کے فرشتہ کو ساتھ چار باتوں کے۔ پس لکھتا ہے وہ فرشتہ عمل اُس کا اور موت اُس کی اور روزی اُس کی اور بد بخت ہونا یا نیک بخت ہونا اُس کا۔ پھر پھونکی جاتی ہے بیچ اُس کے روح۔ پس قسم ہے اُس ذات کی کہ نہیں کوئی معبود سوا اُس کے تحقیق ایک تمہارا البتہ کرتا ہے کام اہل بہشت کے، یہاں تک کہ نہیں ہوتا درمیان اس شخص کے اور درمیان بہشت کے مگر ہاتھ بھر۔ پس غلبہ کرتی ہے اوپر اس کے سرنوشت اس کی۔ پس کرتا ہے کام دوزخیوں کے سے، پس داخل ہوتا ہے دوزخ میں۔ اور تحقیق ایک تمھارا البتہ کرتا ہے کام دوزخیوں کے سے یہاں تک کہ نہیں ہوتا ہے درمیان اُس کے اور درمیان دوزخ کے مگر ہاتھ بھر۔ پس غلبہ کرتی ہے اُس پر سرنوشت اُس کی۔ پس کرتا ہے کام بہشتیوں کے سے پس داخل ہوتا ہے بہشت میں۔ روایت کی یہ بخاری اور مسلم نے۔"

(2) "روایت ہے سہل بیٹے سعد کے سے کہ کہا فرمایا رسول اللہ ﷺ نے تحقیق بندہ البتہ کرتا ہے کام دوزخیوں کے، اور تحقیق وہ ہوتا ہے بہشتیوں میں سے۔ اور کرتا ہے کام بہشتیوں کے اور تحقیق وہ ہوتا ہے دوزخیوں میں سے۔ اور نہیں اعتبار عمل کا مگر ساتھ خاتمہ کے۔ روایت کی یہ بخاری اور مسلم نے۔"

(3) "روایت ہے ابی ذر سے کہا آیا میں پاس نبی ﷺ کے، اور اوپر حضرت کے کپڑا تھا سفید، اور وہ سوتے تھے، اور جب میں پھر آیا تو اس

وقت آپ جاگتے تھے، پس فرمایا کہ نہیں کوئی بندہ کہ کہے نہیں کوئی معبود مگر اللہ، پھر مرے اوپر اسی کے مگر داخل ہوگا بہشت میں۔ کہا میں نے اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے؟ فرمایا اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے۔ پھر کہا میں نے اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے؟ فرمایا اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے۔ پھر کہا میں نے اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے؟ فرمایا اگر چہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے، اوپر خاک آلودہ ہونے ناک ابی ذر کے۔ اور تھے ابوذر جس وقت کہ یہ حدیث بیان کرتے، کہتے تھے اگرچہ خاک آلودہ ہو ناک ابوذر کی۔ روایت کی یہ بخاری اور مسلم نے۔ (مشکوۃ کتاب الایمان)

ان حدیثوں کو نقل کرکے پادری صاحب نے دل کا بھید یوں کھولا ہے:

''حدیث نمبر اول کے رو سے قرآن نہ تو متقی کے لیے ہدیت ہوسکتا ہے اور نہ ہی شقی کے لیے۔ کیونکہ جس شخص کی تقدیر میں متقی ہونا لکھا ہے اور ماں کے پیٹ ہی سے متقی ہو کر نکلتا ہے اس کے لیے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ وہ تو خود مہتدی یعنی ہدایت یافتہ ہے۔ اور شقی کے لیے اس لیے ہدایت نہیں ہوسکتا کہ جو شخص ازل سے شقی مقرر ہوا ہے اور اس کی تقدیر میں شقاوت لکھی ہے وہ کسی طرح بھی ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا۔'' (سلطان التفاسیر، ص: ۳۱-۳۲)

برہان:

یہ اعتراض دراصل قرآن کے مضمون پر نہیں بلکہ حدیث پر ہے۔ پادری صاحب ذرا صبر کرتے تو اس اعتراض کا احسن مقام آگے مل سکتا تھا مگر بمصداق ارشاد الٰہی:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبیا: ۳۷]

پادری صاحب نے جلدی کی کہ اس جگہ بے محل اعتراض کر دیا۔ آپ کے اعتراض کی بنا مسئلہ تقدیر پر ہے جو ہر حکم کے لیے محل اعتراض ہوسکتا ہے۔

قبل اس سے کہ ہم اس اعتراض کا جواب دیں، پادری صاحب کو اُن کے گھر کی اطلاع دیتے ہیں تاکہ قرآن اور بائبل کی سطح مساوی ہو جائے۔ پس پادری صاحب اور اُن کے اعوان اور انصار سُن لیں کہ حضرت داود علیہ السلام زبور میں فرماتے ہیں:

''خدا نے ایک تقدیر مقرر کی ہے جوٹل نہیں سکتی۔'' (زبور ۱۴۸:۶)

یہ تقدیر کیا ہے؟ علم الٰہی کا نام ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے:

ہمارا اور آپ کا بلکہ کل ادیان کا، جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں، اتفاق ہے کہ واقعات گزشتہ اور آئندہ پر خدا کا علم حاوی ہے۔ کوئی ذرّہ کوئی واقعہ اُس کے علم سے باہر نہیں۔ نہ گزشتہ نہ آئندہ۔ مثلاً یہ اعتراض جو آپ نے کیا ہے، یہ تفسیر جو آپ نے لکھی ہے، قبل از وقوع خدا کے علم میں تھی۔ جنگ عظیم جو دنیا کے واقعات میں بڑا واقعہ ہے، اُس کے ساتھ ایک چیونٹی جس نے آج انڈا دیا ہے، یہ واقعات قبل از ظہور بلکہ آج سے اربہا سال قبل خدا کے علم میں تھے۔

پادری صاحب! بحیثیت مسیحی ہونے کے آپ کا بھی یہی عقیدہ ہونا ہے، اگر یہی ہے تو بتایئے آج جو ایک بوڑھا پادری مسلمان ہو جائے۔ یا مرتے دم ایک مسلمان عیسائی ہو جائے، اللہ کے علم میں ایسا ہی تھا یا کچھ اور تھا؟ جواب دینے سے پہلے زبور کا مذکورہ ارشاد اور انجیل کا آئندہ حوالہ سامنے رکھ لیجیے۔

پادری صاحب! انبیاء کرام کی متفقہ تعلیم ہے جس کا مضمون یہ ہے۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ [1]

اسی لیے مسیح فرماتے ہیں:

---

[1] یہ بزور بازو سعادت حاصل نہیں ہوتی جب تک خدا عطا نہ کرے تب تک نہیں ملتی۔

"کوئی شخص مجھ پاس آ نہیں سکتا جب تک باپ جس نے مجھے بھیجا ہے
اُسے کھینچ نہ لاوے۔" (انجیل یوحنا۔ ۶:۴۴)

غور کیجیے! آج جتنے لوگ عیسائی مذہب میں نہیں جاتے یا (بالفاظ آپ کے) مسیح کے پاس نہیں جاتے۔ وہ کیوں نہیں جاتے؟ صرف اس لیے کہ خدا اُن کو نہیں لے جاتا۔ پھر اُن کا قصور کیا اور انجیل کا اُن کو فائدہ کیا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ہم آپ کو مخاطب کر کے کہیں ؎

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند ❶

کیا ہم اس کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ آپ تفسیر قرآن کے ضمن میں عیسائی مذہب کی بنیادوں میں بم کا گولہ رکھ رہے ہیں۔ ہم تو اس پر جزاک اللہ ہی کہیں گے!!

اصل جواب:

قرآن مجید ایک کتاب ہے جس میں روحانی امراض کے نسخے ہیں، جیسے قرابا دین میں جسمانی امراض کے نسخے ہیں۔ جس وقت ایک بیمار کی بیماری اور صحت علم الٰہی میں مقدر ہے، اُس وقت پر وہ اچھا ہو جاتا ہے، جس کا اچھا ہونا خدائی تقدیر میں مقدر نہیں وہ باوجود صدہا علاجوں کے اچھا نہیں ہوتا۔ چاہے پادری ہو یا مولوی، راجہ ہو یا بادشاہ، لیکن اس نظریہ صحیحہ کے باوجود علم طب اور علم ڈاکٹری کو کوئی صاحب عقل بیکار نا قابل توجہ چیز نہیں کہتا، نہ کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کو سمجھ لیجیے۔ مزید تسلی کے لیے مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ کیجیے جس میں ہماری تمثیل کی تائید ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ۸۲]

"ہم (خدا) قرآن کو نسخہ شفا بنا کر اُتارتے ہیں اور مومنوں کے حق میں

❶ یہ گناہ ہے کہ جو تمھارے شہر میں بھی ہوتا ہے۔

رحمت ہے اور ظالموں کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔''

آمنا و صدقنا، فاکتبنا مع الشاهدین.

آپ کی پیش کردہ باقی دو حدیثوں کا جواب بھی اسی میں آ گیا۔ لہ الحمد۔

پادری صاحب کی دوسری بات:

پادری صاحب کی دوسری بات بھی سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

''دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ چونکہ قرآن شریف کی بہت سی آیتیں متشابہات اور محکمات، مجملات و مفصلات میں منقسم ہیں اور بہت سی آیتیں صریحاً جبر پر دلالت کرتی ہیں اور بعض قدر پر تو تاوقتیکہ دلائل عقلی نہ ہوں متشابہات و محکمات میں مجملات و مفصلات میں تمیز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی جبر و قدر میں تاویل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اگر ہادی ہو سکتی ہیں تو دلائل عقلی ہو سکتی ہیں نہ کہ قرآن شریف۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی نے ابن عباس کو خوارج کے پاس بھیجا تو ابن عباس کو یہ حکم دیا کہ "لا تحتج علیهم بالقرآن فإنه خصم ذو وجهین" یعنی قرآن کے رو سے ان کے ساتھ حجت نہ کرنا کیونکہ قرآن دو رخہ دلیل ہے۔ (تفسیر کبیر: ۱/۱۶۲)

اگر در حقیقت قرآن شریف ہدایت ہوتا تو حضرت علی ہرگز حضرت ابن عباس کو قرآن سے دلیل پیش کرنے سے منع نہ فرماتے۔'' (ص: ۳۲)

برہان:

گمان ہوتا ہے کہ پادری صاحب قرآن مجید پر اعتراض کرتے ہوئے ستیارتھ پرکاش مصنفہ سوامی دیانند کو سامنے رکھ لیتے ہیں۔ جس طرح سوامی مذکور قرآن اور بائبل پر بے دردی سے اعتراض کرتے جاتے تھے، چاہے عندالعقلاء خود اُن کے دماغ کی کیفیت کا اظہار ہوتا جائے مگر وہ نمبر پر نمبر بڑھاتے جاتے تھے۔ اسی طرح آپ

اپنے مضمون کو طول دینے کے لیے بے تعلق باتیں کہتے جاتے ہیں۔ سنیے!

ناظرین! پادری صاحب کا کمال ہے کہ اعتراض تفسیر کبیر سے لیتے ہیں مگر جواب جو تفسیر مذکور میں درج ہوتا ہے اُسے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمیں چونکہ آپ کی خاطر منظور ہے اس لیے یہ سمجھ کر کہ تفسیر کبیر میں جو جواب ہے وہ تو آپ دیکھ چکے ہیں اس لیے کوئی نیا جواب آپ کو دیں تاکہ آپ کی تسلی ہو۔ پس سنیے!

کسی کتاب کے حق میں یہ کہا جائے کہ صرف ونحو پڑھنے والوں کے لیے راہنما ہے تو اُس میں کیا ہونا چاہیے؟ اور اگر کسی کتاب میں یہ ذکر ہو کہ مسائل فقہیہ جاننے والوں کے لیے معلم ہے، تو اُس میں کیا مذکور ہونا چاہیے؟ اور اگر کسی میں یہ ذکر ہو کہ انگریزی پڑھنے والوں کے لیے ٹیچر ہے، تو اُس میں کیا مذکور ہونا چاہیے؟ ان تینوں سوالوں کے جواب گو صاف ہیں تاہم، ہم خود ہی جواب بتاتے ہیں۔ پہلی کتاب میں صرف ونحو کے مسائل بآسان صورت مذکور ہونے چاہییں ۔ دوسری میں فقہ کے۔ تیسری میں انگریزی زبان کے۔ اس اصول کے مطابق دیکھنا یہ چاہیے کہ آیات مذکورہ میں جو آیا ہے کہ یہ کتاب متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ پھر متقیوں کی تعریف اور توصیف کی ہے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، قرآن کو اور پہلی کتابوں کو مانتے ہیں وغیرہ، یہ متقیوں کے کام ہیں۔ بماتحت اصول مذکورہ آپ کا سوال یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کاموں کی ہدایات قرآن مجید میں دکھاؤ؟ اگر یہ سوال ہوتا تو معقول ہوتا۔ ہم بھی خوشی بخوشی آپ کو ان کاموں کے متعلق قرآن مجید میں احکام دکھاتے۔ برخلاف اس کے آپ نے جو فرمایا وہ ناظرین کے سامنے ہے، ہمارے خیال میں بماتحت اصول مذکورہ یہ سوال اس جگہ سے بالکل اجنبی ہے۔ تاہم آپ کی خاطر جواب دیتے ہیں۔ کیوں؟ ؎

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے
نالہ رُکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

پادری صاحب اپنی تفسیر کو مستند اور معتبر بنانے کے لیے مرزا صاحب قادیانی کی طرح چند شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنی صداقت پر چند مجذوبوں کی شہادات بھی پیش کی تھیں۔ اُسی طرح پادری صاحب نے چند گواہ پیش کیے ہیں۔ جن میں سے ایک صاحب منشی کیدارناتھ (عیسائی) ہیں جن کے مضمون کی سرخی ہی آپ کی لیاقت کاملہ کا پتہ دیتی ہے۔ وہ سرخی یہ ہے۔

أنا[1] لتفسیر حقا کی جو مکہ سے ندا اُٹھی

حبیبي أنت یا ایس ایم کی یثرب سے صدا اُٹھی

ان حضرت کو ہمارے جواب دینے سے بہت رنج ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''سچی بات کسی کے منہ سے نکلے خواہ عیسائی کے خواہ مسلمان کے، اس قابل ہے کہ اسے بے چون و چرا قبول کر لیا جائے۔ عیسائیوں میں ایسے افراد نیک نہاد کی تو انتہا نہیں، لیکن قصور معاف مسلمانوں میں ہم کو ایسا ایک بھی نہیں ملا۔ وہ جناب فضیلت مآب سلطان المفسرین پادری سلطان محمد پال کی تفسیر کو ''إنا نفسر حقا'' کا دعویٰ کرتے ہوئے بھلا اُول جلول بکنے سے کب باز رہ سکتے۔ الخ۔'' (نورافشاں ۱۷ جون ۳۲ء ص: ۷)

پادری صاحب! عیسائی اگر حق پسند ہوتے تو جب اُن کو بتایا گیا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ﴾ [المائدة: ۷۲]

اس کو ضرور قبول کرتے۔ عیسائی اگر اس آواز کو اپنے عقیدے کے خلاف جان کر قبول نہ کرنے میں معذور ہیں تو مسلمان ''سلطان التفاسیر'' کا جواب دینے میں کیوں حق پر نہیں؟

---

[1] اسی طرح مطبوع ہے۔ [مؤلف]

دوسرا گواہ کوئی مجہول الحال شخص ہے جس کے حق میں لکھا ہے:

''ایک مسلمان بھائی کے قلم سے۔''

ان صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے ساتھ ابھی دنیا میں آئے ہیں۔ ان کو دنیا کے حالات سے کوئی اطلاع نہیں۔ یہ لکھتے ہیں:

''میں مولوی ثناء اللہ صاحب سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جو اس تفسیر (سلطان التفاسیر) پر اظہار ناراضگی کر رہے ہیں اور آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں اور فوراً ہی اس کا جواب لکھنا شروع کر دیا، کیا اس سے پہلے آپ کو کسی تفسیر کا جواب لکھنے کی ضرورت نہ پیش آئی؟'' (نور افشاں ۸ جولائی ۲۳ء، ص: ۸)

ان حضرت کو معلوم نہیں کہ اس سے پہلے ہم نے تفسیر ثنائی میں سرسید کی تفسیر کا جواب دیا۔ اُس کے بعد امرتسری تفسیر ''بیان للناس'' کا جواب دیا۔ اسی طرح مولوی محمد علی لاہوری کی تفسیر کا جواب دیا۔ اسی ذیل میں چوتھے نمبر پر اب سلطان التفاسیر کا جواب بشکل برہان التفاسیر دیا جاتا ہے۔ بتایئے کیا اعتراض؟

تیسرے گواہ آپ کے جے۔ ڈی۔ نندوانی صاحب ہیں جنھوں نے المائدہ (جولائی) میں شکایت کی ہے کہ پادری سلطان محمد پال صاحب مسلمانوں کی حدیثیں اور مفسرین کے اقوال ہی بیان کرتے ہیں:

''ہم اس لیے مولوی ثناء اللہ صاحب کے متشکر ہوں گے کہ وہ اپنی برہان قاطع سے اپنے ہی ہم مذہب علما کی ان مستند تفاسیر کا قلع قمع کریں اور مسلمان پکار اُٹھیں کہ ؂

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(ص:۲)

ان سب صاحبوں خصوصاً تیسرے گواہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو

یہی ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ سلطان التفاسیر میں سوائے احادیث اور اقوال مسلم مفسرین کے کچھ بھی نہیں۔ پھر جواب کیسا؟

واقعی اگر یہ زعم صحیح ہوتا تو ہم بھی آپ کے ہم خیال ہوتے کہ جواب کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ کی واقفیت کا حال یہ ہے کہ آپ خود ہی لکھتے ہیں:

''ہم افسوس کرتے ہیں کہ آپ (مولوی ثناء اللہ) کی برہان التفاسیر کا دیدار ابھی نصیب نہیں ہوا۔'' (حوالہ مذکور)

اصل وجہ ہی یہ ہے کہ آپ نے جواب نہیں دیکھا اس لیے بحکم مثل مشہور ''مَنْ جَهِلَ شَيْئًا عَادَاهُ''[1] مخالفت کرتے ہیں۔

ان عالمانہ شہادتوں کو دیکھ کر پادری صاحب کو ایک بڑے فلاسفر کا قول سناتے ہیں۔ ؎

صائب دو چیز مے شکند قدر شعر را
تعریف ناشناس و سکوتِ قدر شناس[2]

نوٹ: گزشتہ پرچہ میں نقل ہوا ہے کہ پادری صاحب نے لکھا ہے کہ سارا قرآن ہدایت نہیں، کیونکہ اس میں محکم کے ساتھ متشابہ بھی ہیں۔ اس کے جواب میں ہم ڈنکے کی چوٹ سے کہتے ہیں قرآن سارے کا سارا ہدایت ہے، مفصل ہو خواہ مجمل، محکم ہو یا متشابہ، ان اقسام میں سے کوئی بھی ہدایت سے خالی نہیں۔ یہاں ہمارا یقین نہ ہوتو آگے محکمات اور متشابہات کے موقع پر ہم بتادیں گے۔

حضرت علی کا قول (بعد ثبوت بسند صحیح)[3] اپنے اندر بڑی حکمت رکھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں

1. جو کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے اس کا دشمن بن جاتا ہے۔
2. صائب! دو چیزیں شعر کی قدر ختم کر دیتی ہیں: ناشناس کی تعریف اور قدر شناس کی خاموشی۔
3. الدر المنثور للسيوطي (١/ ٤٠) اس کی سند میں عمران بن مناح راوی کا ترجمہ نہیں ملا۔ نیز اسے حافظ خطیب بغدادی نے الفقیہ والمتفقہ (١/ ٥٦٠) میں روایت کیا←

کہ ہم عیسائیوں کے سامنے قرآن کی واضح سے واضح آیت پیش کرتے ہیں:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ﴾ [المومنون: ۹۱]

اس واضح تر آیت کی بھی تاویل کی جاتی ہے کہ اس میں اُس ولد کی نفی ہے جو باقاعدہ نطفہ سے پیدا ہو۔ مسیح کی ولدیت ایسی نہیں بلکہ وہ روحانی ہے۔ ایسے مواقع کے لیے حضرت علی نے فرمایا ہے کہ جو لوگ قرآنی نصوص کو پھیریں اُن کے سامنے عقلی دلیل پیش کرو۔ نہایت معقول ہے۔ اس میں قرآن کے ہادی ہونے پر حرف نہیں بلکہ مخاطب کے ذہن کا نقص ہے۔ شیخ سعدی اُستاد فلاسفر اخلاق نویس ہو کر کہتے ہیں ؎

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نرہی

اینست جوابش کہ جوابش ندہی ❶

قرآن و حدیث سے جس کی تسلی نہ ہو اُس کو جواب دینے سے شیخ منع فرماتے ہیں۔ مگر حضرت علی کی شان تو ان سے ارفع ہے وہ جواب سے منع نہیں فرماتے بلکہ نوعیتِ جواب اور بتاتے ہیں۔ یعنی نقلی کی بجائے عقلی۔ کیسا حکیمانہ اور عارفانہ اصول ہے؟ پادری صاحب کی نظر میں یہ بھی قابل اعتراض ہے۔ سچ ہے ؎

گل ست سعدی و در چشم دشمناں خارست ❷

پادری صاحب کی تیسری بات:

اس کے بعد آپ نے تیسری بات لکھی ہے:

''تیسری غور طلب بات یہ ہے کہ ہدایت کی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ نہایت واضح اور صریح ہو۔ حالانکہ قرآن شریف میں یہ بات موجود نہیں

← ہے لیکن اس کی سند میں یحییٰ بن عبداللہ بابلتی اور حسن سمسار ضعیف ہیں۔

❶ جس کی قرآن و حدیث سے تسلی نہ ہو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو جواب نہ دیں۔

❷ سعدی پھول ہے اور دشمنوں کی آنکھ میں کانٹا۔

ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک ہی آیت سے کس طرح متضاد باتیں ثابت کی جاتی ہیں اور مفسرین کو باہم کس قدر اختلاف ہے۔ لہٰذا قرآن شریف ہادی نہیں ہوسکتا۔'' (سلطان التفاسیر، ص:۳۲)

برہان:

ہم پادری صاحب کے ناز کہاں تک اٹھائیں کہ بے ثبوت بات کہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

سنیے! علم معانی میں تین لفظ آتے ہیں: ① مجمل۔ ② مبہم۔ ③ مغلق۔

نمبر۲ و۳ سے ہدایت نہیں ہوتی، نمبر اول سے ہدایت ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید میں بعض آیات مجملہ ہیں جو ہدایت سے خالی نہیں۔ مبہم اور مغلق نہیں۔ آپ کوئی مثال دیتے تو ہم بھی اُس کی تشریح کرتے۔

نوٹ: پادری صاحب آیندہ مہربانی سے ایسے موقع پر قرآن سے ایسی مثالیں پیش کیا کریں۔ ہاں انجیل کے مجملات بھی سامنے رکھ لیا کریں جن میں سے ایک یہ ہے۔ مسیح فرماتے ہیں:

''زندگی کی روٹی میں ہی ہوں، روٹی جو میں دوں گا، میرا گوشت ہے جو میں جہان کی زندگی کے لیے دوں گا۔'' (یوحنا۔ ۶: ۴۸)

اتنا مجمل ذو استعارہ کلام تو آپ کے نزدیک بھی ہدایت سے خالی نہیں ہوگا۔ اس سے زیادہ مجمل یا بقول آپ کے مبہم قرآن مجید میں ہو تو مثال دیجیے ہم غور کریں گے۔

ایمان بالغیب:

اس کے بعد آپ نے ایمان کے معنی بتائے ہیں کہ دل سے ماننا اور زبان سے اظہار کرنا۔ پھر ''الغیب'' کے معنی نقل کیے ہیں کہ جو حواس سے معلوم نہ ہوسکے۔ پھر سر سید احمد خان مرحوم اور مولانا عبدالحق مصنف تفسیر حقانی کا قول نقل کرکے حرف

مطلب یوں لکھا ہے:

''افسوس ہے کہ خود مسلمان اس آیت پر عمل نہیں کرتے اور اس کے دائرۂ عمل کو صرف انھی غائبات تک محدود کرتے ہیں جن کا بیان قرآن یا احادیث میں ہے۔ ان کے علاوہ وہ کسی اور الہامی اور الٰہی کتاب کے اُن امور پر جو بطور غائب کے مذکور ہیں ایمان نہیں لاتے بلکہ ان کی تصدیق کے لیے عقلی دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں۔'' (ص:۳۳)

برہان:

رہ رہ کر آپ کو جس بات پر رنج ہوتا ہے وہ مسئلہ تثلیث ہے جس کی بابت ہم پہلے مفصل لکھ آئے ہیں اور یہاں بھی عرض کرتے ہیں کہ مسلمان تثلیث کے اس لیے منکر نہیں ہیں کہ وہ قرآن مجید میں مذکور نہیں، اس لیے اس کی عقلی دلیل چاہیے، بلکہ اس لیے انکار کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس کی نفی ہے۔ اور عقلی دلیل قرآنی نفی کی مؤید ہے۔ آئندہ ان دو مفہوموں کا امتیاز ذہن میں رکھ کر فرمایا کریں۔

خدا کی ذات وصفات پر بحث:

اس کے بعد آپ نے خدا کی ذات اور صفات پر بحث کی ہے کہ خدا نہ منطقی حد سے جانا جاتا ہے نہ رسم سے وغیرہ۔ ہم نہیں جان سکتے کہ اس بحث کو مخصوص اسلام سے کیا تعلق ہے؟ بحالیکہ مسلم علمائے منطق نے خود تصریح کی ہے: "لا یحد ولا یتصور"[1] ہاں اُس کا علم اُس کے افعالی صفات سے قرآن مجید نے کرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى

---

[1] یعنی اس کی حد اور تصور ممکن نہیں۔

اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۞ وَ مَا يَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ
شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ
تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَی الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ
لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی
النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ
يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ الَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ﴾ [الفاطر: ۱۱ تا ۱۳]

''اور (لوگو!) اللہ ہی نے تم کو (پہلے) مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے۔ پھر (مردعورت بناکر) جوڑے جوڑے بنایا۔ اور نہ کسی عورت کو پیٹ رہتا ہے اور نہ (وہ بچہ) جنتی ہے مگر (یہ سب) خدا ہی کے علم (اور اجازت) سے (ہوتا ہے) اور نہ کسی شخص کی عمر زیادہ اور نہ کسی کی عمر کم کی جاتی ہے مگر (یہ سب) کتاب (لوح محفوظ) میں (لکھا ہوا موجود) ہے (اور) کچھ شک نہیں کہ یہ (سب) اللہ کے نزدیک (ایک) سہل (سی بات) ہے اور (سمندر) دو (قسم کے ہوتے ہیں اور وہ دونوں) سمندر ایک طرح کے نہیں ہیں، ایک (ایسا ہے کہ) اُس کا پانی میٹھا خوش ذائقہ خوشگوار ہے۔ اور ایک (ایسا ہے کہ اُس کا پانی) کھاری کڑوا ہے، اور (باوجود اس اختلاف کے) تم (لوگ) دونوں (قسم کے دریاؤں میں) سے (مچھلیاں شکار کرکے اُن کا ترو) تازہ گوشت کھاتے اور زیور (یعنی موتی) نکالتے جن کو پہنتے ہو اور (اے مخاطب) تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں دریا میں (پانی کو میٹھا ہو یا کھاری) پھاڑتی چلی جارہی ہیں تاکہ تم

(لوگ) خدا کا فضل (یعنی تجارت کے فائدے) ڈھونڈو اور تاکہ تم (اُس کا) احسان مانو۔ وہ رات (کے ایک جزو) کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن (کے جزو) کو رات میں داخل کر دیتا ہے اور اُسی نے سورج اور چاند کو (اپنا) مطیع (فرمان) کر رکھا ہے کہ دونوں (اسی طرح اپنے) بندھے ہوئے وقتوں میں پڑے چل رہے ہیں۔ (لوگو!) یہی اللہ تو تمہارا پروردگار ہے اُسی کی سلطنت ہے اور اُس کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو ذرہ سا بھی تو اختیار نہیں رکھتے۔''

برہان:

کیسی انسانی فہم کے حسب حال تعلیم ہے، نہ منطقی اُلجھن، نہ فلسفی دقت، بلکہ صاف صاف ہے، کیونکہ عرب کہا کرتے تھے:

"البعر تدل علی البعیر و الخلق یدل علی الخالق الخبیر"

''مینگنی اونٹ پر دلالت کرتی ہے، مخلوق خالق خبیر پر دلالت کرتی ہے۔''

اسی اصول سے سمجھایا گیا:

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ﴾ [الفاطر: ۱۳]

''یہ اللہ تمھارا معبود ہے اسی کا ملک اور حکم ہے۔''

پادری صاحب کو تثلیث کا ولولہ:

باوجود اس صفائی کے آپ کو وہی ولولہ اُٹھا ہے جس کا نام تثلیث ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''اس کے برعکس انجیل جلیل کی یہ تعلیم ہے کہ ''ساری چیزوں کو آزماؤ، جو اچھی ہو اُسے پکڑے رہو۔'' (ا۔تسلونیکیوں ۵۔ ۲۱) میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اسی تثلیث کا جس پر ہمارا ایمان ہے قرآن میں حکم یا اشارہ تک ہوتا

تو تمام مسلمان اس پر ایمان لاتے اور اپنی اُن تمام دلائل عقلیہ کو جو اس کے برخلاف پیش کیا کرتے ہیں بالائے طاق رکھ کر آمنا وصدقنا کہتے۔ پس مسلمانوں کا تثلیث کو نہ ماننا اس بنا پر نہیں ہے کہ اس میں صداقت نہیں کیونکہ یہ تو صداقت کا سرچشمہ ہے بلکہ محض اس بنا پر اسے نہیں مانتے کہ قرآن شریف نے اس صداقت پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا ہے۔" (ص:۳۷)

برہان:

پادری صاحب نے ایک کلام شرطیہ لکھا ہے کہ "اگر قرآن تثلیث کا حکم دیتا تو مسلمان مان لیتے۔" اس کا جواب اول تو یہ ہے قضیہ شرطیہ میں مقدم کا امکان بھی ضروری نہیں بلکہ مقدم محال بھی ہوسکتا ہے۔ صرف ملازمت پر مدار ہے نہ کہ امکان یا اطلاق پر۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ کے شرطیہ کی جگہ قرآن شریف نے بھی ایک شرطیہ فرمایا ہے۔ غور سے سنیے!

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ [الزخرف: ۸۱]

یعنی اگر خدا کا بیٹا ہوتا تو میں اُس کی پہلے عبادت کرتا۔ کیونکہ بیٹا نوعیت میں باپ کا مثل ہوتا ہے۔

اس شرطیہ میں "ہوتا" کو شرط بنایا ہے نہ کہ محض امرِ قرآن۔ یعنی یوں نہیں فرمایا: "إن أمر الله بعبادة الغير"

ان دو شرطیوں میں بہت فرق ہے۔ قرآن عالم الغیب خدا کی طرف سے ہے، اُس کے علم میں تھا کہ پادری پال صاحب اس قسم کا شرطیہ لکھ کر مسلمانوں کو الزام دیں گے، اُس نے خود ایک شرطیہ بتایا جس میں محض حکم پر ولد اللہ کی عبادت متفرع نہیں کی بلکہ ثبوت پر متفرع فرمائی ہے۔ فافهم فإنه دقيق.

اس کے بعد پادری صاحب نے چند لفظوں کی تشریح کر کے اپنے مطلب کی بات یہ کہی ہے۔

مسلمانوں کا ایمان بلا عمل:

''پس متقی کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ تورات اور انجیل اور زبور اور دیگر صحفِ انبیاء پر ویسا ہی ایمان لائے جیسا کہ قرآن پر لاتا ہے۔ مسلمان بظاہر تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں وہ کتب سابقہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ ایمان میں تین باتیں شامل ہیں جن کا ذکر میں نے لفظ ''ایمان'' کی تفسیر میں مفصل کیا ہے، یعنی ① زبان سے اقرار۔ ② دل سے تصدیق۔ ③ اعضاء سے عمل۔ مسلمان کتب مقدسہ کے متعلق پہلی دو باتوں پر تو عمل کرتے ہیں لیکن تیسری بات پر عمل نہیں کرتے۔ یعنی کتب مقدسہ کے اوامر اور نواہی پر عمل نہیں کرتے۔ اس لیے اس قسم کے مسلمان متقین کی جماعت سے خارج ہیں۔'' (ص: ۳۸)

برہان:

یہی ایک مقام ہے جس میں فریقین کے ایمان کا امتحان ہے اور ہوگا کہ دلائل کی حیثیت سے کون صحیح کہتا ہے؟ پس انصاف سے سنیے!

اس آیت میں ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں: ''جو کلام مجھ سے پہلے اُترا وہ بھی ماننے کے لائق ہے''۔ مگر یہ لفظ اپنا مفہوم بتانے میں مجمل ہے۔ اس کی تفصیل یا تشریح دوسری آیت میں یوں ملتی ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ

عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ١٣٦]

یعنی مسلمانو! تم (پادری پال صاحب کے سامنے) کہو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اُس کلام پر جو ہماری طرف اُتارا گیا۔ اور اُس کلام پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد علیہم السلام کی طرف اُتارا گیا ہم سب کو مانتے ہیں۔ اُن میں سے کسی میں ہم فرق نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) اور ہم اُسی (خدا) کے فرمانبردار ہیں۔"

ان آیات میں مفصل اور مشرح بتایا گیا ہے کہ کتب سابقہ سے مراد وہ کتابیں ہیں جو ان انبیاءِ کرام علیہم السلام پر نازل ہوئیں۔ پس اب مطلع صاف ہے، آیئے اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہم دیکھیں کہ آج کل جو تورات انجیل وغیرہ ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ وغیرہ پر نازل ہوئی ہیں یا اپنے مؤلفین کی تالیف ہیں؟ ہم کوئی بیرونی شہادت پیش نہیں کرتے بلکہ خود تورات و انجیل کی اندرونی شہادت سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ناظرین بغور پڑھیں۔

تورات و انجیل میں الحاق:

مروجہ تورات کی پانچویں کتاب میں لکھا ہے:

"سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا اور اُس نے اُسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے مقابل گاڑا، پر آج کے دن تک کوئی اُس کی قبر کو نہیں جانتا، اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا کہ نہ اُس کی آنکھیں دُھندلائیں اور نہ اُس کی تازگی جاتی رہی ...نون کا بیٹا یشوع دانائی کی روح سے معمور ہوا...اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا۔" الخ (استثناء۳۴: ۵۔۱۰)

یہ فقرات اور ان کے بعد تا ختم کتاب سارے فقرات بآواز بلند اپنا مضمون صاف صاف بتا رہے ہیں کہ ہمارا زمانہ تصنیف حضرت موسیٰ کے بعد کا ہے۔ پھر جس کتاب میں ایسے فقرات ہوں وہ کتاب حضرت موسیٰ پر نازل کیسے ہوگی کیونکہ نزول تو زندگی میں ہوتا ہے نہ کہ بعد موت؟ آئیے اب انجیل کی شہادت سنیے!

چاروں اناجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صلیب (پھانسی) دیا جانا اور صلیب پر مرجانا لکھا ہے۔ سب سے پہلے انجیل کے یہ لفظ ہیں:

''یسوع نے پھر بڑے شور سے چلا کر جان دی۔'' (متی ۲۷۔۵۰)

اس کے بعد، بعد الموت کے حالات بھی درج ہیں۔ اب یہ شہادات پیش کر کے ہم ایک مثال دیتے ہیں۔

شیخ سعدی کی کتاب گلستان ہے۔ اُس کے ساتھ چند اوراق ایسے لگے ہوں جن میں شیخ موصوف کی پیدائش اور موت اور موت کے بعد کے واقعات درج ہوں تو اُن کو دیکھ کر ہر اعلیٰ و ادنیٰ عقل کا آدمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اوراق سعدی مرحوم کی تصنیف نہیں بلکہ بعد میں کسی نے لگائے ہیں۔ مگر وہاں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اتنے اوراق الگ منضم کیے گئے ہیں لیکن یہاں تورات و انجیل میں یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ نہ حد فاصل ہے اور نہ ان کتابوں کے حامی اس امتیاز کے قائل ہیں۔ پس مسیحیوں کو چاہیے کہ ان کتابوں میں حضرات موسیٰ اور عیسیٰ کے الہامات میں امتیاز کریں۔

ان حالات میں مسلم کا کیا فرض ہے؟ وہی جو قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ہم اُن سب کتابوں کو مانتے ہیں جو ہم سے پہلے حضرات انبیاء کرام کو ملی تھیں، بس اس کے سوا تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، نہ جا سکتے ہیں، کیونکہ کتب سابقہ کے ماننے والوں نے اُن کتب کی ہیئت ایسی بگاڑ دی ہے کہ اصل اور ملحق میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ ہاں پادری صاحب کے اس الزام کا جواب ہم خود قرآن مجید کے الفاظ میں دیتے

ہیں۔ پادری صاحب کے الزام تین ہیں:

① زبان سے اقرار۔ ② دل سے تصدیق۔ ③ اعضاء سے عمل۔

غنیمت ہے ان تین الزامات میں سے دو الزاموں کا جواب خود ہی دے دیا کہ ''مسلمان کتب مقدسہ کے متعلق پہلی دو باتوں پر تو عمل کرتے ہیں۔'' اس لیے ہمیں ان الزامات کے دفع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تیسرے الزام کا جواب دینا ہے۔ الزام یہ ہے کہ ''لیکن تیسری بات پر عمل نہیں کرتے۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے بھیجنے والے کو علم تھا کہ کسی زمانہ میں پادری صاحب اس پر اعتراض کر کے مسلمانوں کو مورد الزام بنائیں گے۔ اس لیے اُس نے ارشاد فرمادیا:

﴿ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ﴾ [الأعراف: ٣]

''یعنی اے مسلمانو! (ایمان اور تصدیق تو سب کی کرو جو کتاب تم سے پہلے اُتری ہے اور جو تمھاری طرف اُتری ہے۔ مگر) پیروی اُسی کی کرو جو تمھاری طرف (قرآن کی صورت میں) اُتری ہے۔ اور اس کے سوا کسی اور کی پیروی نہ کرو۔''

مسلمان اس حکم کے ماتحت مامور ہیں کہ ایمان سب پر رکھیں اور عمل صرف قرآن پر کریں۔ فرمائیے مسلمان باصطلاح قرآن متقی ہوئے یا نہ؟ رہی آپ کی اصطلاح سو اس کی مسلمانوں کو پرواہ نہیں۔ کیونکہ عیسائی اصطلاح میں تو متقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک بے گناہ کو عام انسانوں کی وجہ سے مصلوب ہو کر ملعون اور جہنمی سمجھیں۔ (پولوس کا خط) استغفر اللہ! سو ایسے تقوے کے لحاظ سے مسلمان بے شک متقی نہیں۔ ہم پادری صاحب کو تصدیق اور تعمیل کی مثال دیتے ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ انجیل میں تورات کی تصدیق کی گئی ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے:

''جب تک آسمان زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات کا ہرگز نہ مٹے گا۔'' (انجیل متی ۵: ۱۹)

بتایئے! عیسائیوں کا عمل تورات پر ہے؟ ہے تو فرمایئے جس سبت (شنبہ) کی بابت تورات میں حکم ہے۔ اس کی بابت توریت میں ارشاد ہے:

''ساتواں روز خداوند تیرے خدا کے سبت کا دن ہے تو اُس دن کوئی کام نہ کر، نہ تو، نہ تیرا بیٹا، نہ تیری بیٹی، نہ تیرا غلام، نہ تیری لونڈی، نہ تیرا بیل، نہ تیرا گدھا، نہ تیرا کوئی مویشی، اور نہ مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو۔ الخ'' (استثناء ۵۔۱۴)

فرمایئے! آج عیسائی دنیا میں اتنی تبدیلی کی گئی ہے کہ بجائے سبت (ہفتہ) کے اتوار مقرر کر دیا گیا ہے، یہی تورات کی تعمیل ہے؟ حالانکہ تورات کو مقدس اور کتاب اللہ جان کر بائبل میں سب سے پہلے رکھا گیا ہے۔ اور مسیح (علیہ السلام) نے اس پر عمل کرنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ لیکن عمل جو ہے وہ نمایاں ہے کہ کسی فرقہ یا شخص نے ترک نہیں کیا بلکہ کل مسیحی دنیا نے بالاتفاق ترک کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ کسی الہامی سند پر نہیں کیا بلکہ محض مجلسی اور جماعتی مشورہ سے الہامی تعلیم کو بگاڑ دیا۔ شاباش ہے یہود کو کہ اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔

دوسری مثال:

دوسری مثال ختنہ ہے۔ جس کی بابت تورات میں سخت تاکیدی حکم ہے:

''ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔'' (کتاب پیدائش ۱۷۔۱۰)

لیکن عیسائیوں نے اس حکم پر بھی عمل کرنا چھوڑ دیا۔ اسی طرح سوختنی قربانی وغیرہ کے احکام بہت سے ہیں جن پر عیسائی قوم کا یقین تو ہے مگر تعمیل

نہیں۔ غالبًا اب تو پادری صاحب نے قرآن مجید کا مدعا سمجھ لیا ہوگا کہ ہر ایک تعلیم واجب التعمیل نہیں ہوتی۔

تورات:

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ پادری صاحب کا الزام ہم پر نہیں بلکہ جامعین بائبل پر ہونا چاہیے۔ یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید مسلمانوں سے وہ کتب مقدسہ منواتا ہے جو حضرات انبیاء موسیٰ، عیسیٰ کو ملی تھیں۔ تورات کی بابت سوائے ﴿مَآ اُوْتِيَ مُوْسىٰ﴾ کے ایک اور لفظ بھی آیا ہے:

﴿ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [الأعراف: ١٤٥]

یعنی ہم (خدا) نے موسیٰ کو الواح میں ہر قسم کی نصیحت اور تفصیل لکھ کر دی تھی۔

آیئے! ہم بائبل سے پوچھیں کہ الواح پر لکھا ہوا حضرت موسیٰ کو کیا ملا تھا؟ پس غور سے سنیے:

> ''پھر موسیٰ نے سارے اسرائیل کو بلایا اور انھیں کہا: اے اسرائیل! یہ شرعیں اور احکام سُن رکھو جنہیں میں آج تمھارے کانوں تک پہنچاتا ہوں، تاکہ تم اُنھیں سیکھو، اور حفظ کرو، اور اُن پر عمل کرو۔ خداوند ہمارے خدا نے حورب میں ہم سے ایک عہد کیا، خداوند نے یہ عہد ہمارے باپ دادوں سے نہیں کیا بلکہ خود ہم سے، یعنی ہم سب سے جو آج کے دن جیتے ہیں، خداوند نے تمھارے ساتھ رو برو پہاڑ کے اوپر آگ میں سے کلام کیا، اُس وقت میں نے تمھارے اور خداوند کے درمیان کھڑے ہو کے خداوند کا کلام تم پر ظاہر کیا، کیونکہ تم آگ کے سبب ڈر گئے تھے، اور پہاڑ پر نہ چڑھے۔ تب اُس نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خداوند ہوں، جو تجھ کو

مصر کی زمین سے اور غلام خانے سے باہر لایا، میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لیے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا، تو انھیں سجدہ نہ کر، نہ اُن کی بندگی کر، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلا اُن کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک جو کہ میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں، اور اُن میں سے جو میرے دوست ہیں اور میرے حکموں کو یاد رکھتے ہیں ہزاروں پر رحم کرتا ہوں، تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب مت لے، کیونکہ خداوند اُس کو جو اُس کا نام بے سبب لیتا ہے بے گناہ نہ ٹھیرائے گا۔ سبت کے دن کو یاد کر، تاکہ تو اُسے مقدس جانے، جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم کیا ہے۔ چھ دن تک تو محنت کر اور اپنے سب کام کیا کر، پر ساتواں روز خداوند تیرے خدا کے سبت کا ہے، تو اُس دن کوئی کام نہ کر، نہ تو، نہ تیرا بیٹا، نہ تیری بیٹی، نہ تیرا غلام، نہ تیری لونڈی، نہ تیرا بیل، نہ تیرا گدھا، نہ تیرا کوئی مویشی، اور نہ مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو، تاکہ تیرا غلام اور تیری لونڈی تیری طرح سے آرام کریں۔ یہ بھی یاد کر کہ تو مصر کی زمین میں غلام تھا اور وہاں سے خداوند تیرا خدا اپنے زور آور ہاتھ اور بڑھائے ہوئے بازو سے تجھ کو نکال لایا۔ اس لیے خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا کہ تو سبت کے دن کی محافظت کر، اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے، جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے فرمایا ہے، تاکہ تیری عمر کے دن بہت ہوویں، اور تاکہ اُس زمین میں جسے خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے تیرا بھلا ہو۔ تو خون مت کر، تو زنا مت کر، تو چوری نہ کر، تو اپنے ہمسائے پر جھوٹی گواہی نہ دے، تو اپنے ہمسائے کی جورو کو مت چاہ، تو

اپنے ہمسائے کے گھر کی، یا اُس کی زمین کی، اُس کے غلام کی، اُس کی لونڈی کی، اُس کے بیل کی، اُس کے گدھے کی، یا ہمسائے کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔" (استثناء باب ۵۔فقرہ ۱ تا ۲۱)

ناظرین کرام! مسیحی اصحاب اور اہل اسلام برادران للہ غور فرمائیں کہ جس تورات مرقومہ فی الالواح کے منوانے کا قرآن مجید ارشاد کرتا ہے وہ بائبل کے ایک صفحہ سے بھی کم میں سما سکتی ہے۔ جس کی بابت حضرت موسیٰ نے صاف صاف فرمادیا:

"یہی باتیں خداوند نے پہاڑ پر آگ کے اور بدلی کے اور بے نہایت تاریکی کے درمیان سے تمھاری ساری جماعت کو بلند آواز سے کہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہ فرمایا۔ اور اُس نے اُن کو پتھر کی دو لوحوں پر لکھا اور اُنھیں میرے سپرد کیا۔" (کتاب استثناء باب ۵)

یہ احکام ایسے ہیں کہ قرآن مجید کے متعدد مقامات پر ان کی بابت مسلمانوں کو ارشاد ہو چکا ہے۔ پھر مسلمان ان پر عمل کیوں نہ کریں؟

پادری صاحب! آیئے ہم اور آپ دونوں عمل کریں۔ ہاں جو ان کے ادھر ادھر اضافہ کیا گیا ہے قرآن مجید اس کے منوانے کا حکم نہیں دیتا۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید جو منواتا ہے مسلمان اُسے مانتے ہیں، اور جو نہیں مانتے قرآن مجید وہ منواتا بھی نہیں۔

انجیل:

اب آیئے انجیل کی بابت آپ کو سنائیں۔ ہمارے سامنے جو انجیل پیش کی جاتی ہے وہ مسیح کی سوانح عمری ہے، اس کو انجیل کہنا عیسائیوں کی اصطلاح ہے۔ قرآن اس اصطلاح کا پابند نہیں۔ قرآن مجید جو انجیل منواتا ہے اُس کی بابت ﴿اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ﴾ کہتا ہے۔ اس کا ثبوت مسیح کے کلام سے ملتا ہے جو یوں ہے:

"پھر یوحنا کی گرفتاری کے بعد یسوع نے گلیل میں آکے خدا کی بادشاہت

کی خوشخبری کی منادی کی، اور کہا کہ وقت پورا ہوا اور خدا کی بادشاہت نزدیک آئی، توبہ کرو، اور انجیل پر ایمان لاؤ، ہم (خدا) نے مسیح کو انجیل دی۔" (انجیل مرقس ۱۔۱۴)

اسی انجیل کے اخیر میں مسیح نے تاکید فرمائی ہے:

"ہر ایک مخلوق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔" (مرقس ۱۶۔۱۵)

بدیہی بات ہے کہ جس انجیل پر ایمان لانے کو اور جس کی اشاعت کرنے کو جناب مسیح نے فرمایا ہے وہ مرقس کی انجیل نہ ہوگی۔ کیونکہ اناجیل متی، مرقس، لوقا اور یوحنا تو بعد مسیح بنی ہیں۔ پس وہ انجیل جس کی بابت حضرت مسیح نے حکم فرمایا ہے، وہ ان اناجیل کے سوا ہے جو آج ہمارے سامنے ہیں، جن پر ایمان لانے کی پادری صاحبان ہم کو تبلیغ کرتے ہیں، اور اُن پر عمل نہ کرنے سے ہم کو دائرہ متقین سے خارج فرماتے ہیں، جس کے بعد ہمارا یہی جواب ہے۔ ؎

ناصحا! اتنا تو دل میں تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ نادان ہیں کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

مسلمانوں کے باہمی اختلافی مسائل:

اس کے بعد پادری صاحب نے تفسیر کبیر سے اہل سنت اور معتزلہ کا اختلاف اور مسئلہ جبر وقدر کے مباحث کو نقل کیا ہے جو نہ آپ ہی کو مفید ہے نہ ہمیں مضر۔ ایسے اختلافات ہر بڑی امت میں ہوا ہی کرتے ہیں، اس سے اصل کتاب پر کوئی اعتراض نہیں، ہم اس قسم کے مباحث کو بے کار نہ جانتے تو فرقہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے اختلافات اور توحیدی اور تثلیثی عیسائیوں کے تحریری مباحثات پادری صاحب کے سامنے رکھ دیتے مگر ہم ایسے غیر مفید کام نہیں کرتے۔

اس کے بعد پادری صاحب نے پھر اپنے عندیہ کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اگر آپ اُن حدیثوں کو پھر ایک بار پڑھیں جن کو ہم نے لفظ ''متقی'' کے تحت صفحہ (۳۰) پر لکھا ہے تو آپ متعجب ہوں گے کہ اسلام میں نہ تو ایمان کی کوئی وقعت ہے اور نہ کفر میں کوئی قباحت۔'' (ص:۴۶)

برہان:

آپ کے اس شبہہ کا جواب ہم اہل حدیث ۱۵/ جولائی میں دے آئے ہیں۔ فلينظر هناك.[1]

عہدِ رسالت میں کتب مقدسہ کی حالت:

چلتے چلتے پادری صاحب نے ایک بات ایسی کہہ دی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ قرآن شریف پر واقعی قبضہ تامہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی خوش ہیں کیونکہ خربوزہ چھری پر قبضہ کر کے جو نتیجہ پا سکتا ہے وہی قرآن پر قبضہ کرنے والا پائے گا۔ یعنی اُس کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ آپ لکھتے ہیں:

''چونکہ یہ آیت بالاتفاق ان اہل کتاب کی مدح میں ہے جو آنخضرت ﷺ پر ایمان لائے تھے، لہٰذا کتب مقدسہ کا بلاکم وکاست آنخضرت کے زمانہ میں اہل کتاب کے پاس ہونا اور اُن پر اہل کتاب کا عمل کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن شریف کے اور مقام میں بھی تورات و انجیل پر عمل کرنے کی تاکید ہے کہ ﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدة:٤٤] یعنی جو شخص اللہ کے اُتارے پر حکم نہیں کرتا ہے وہ کافر ہے۔''

برہان:

تعجب ہے کہ آپ نے ''بالاتفاق'' کیسے لکھ دیا؟ آیئے ہم آپ کو اس کی حقیقت پر آگاہ کریں۔

[1] اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ دیکھیں: (ص: ١٣٥)

سب سے پہلی تفسیر ابن جریر میں لکھا ہے کہ ان آیات کے شانِ نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے خاص عرب کے ایمانداروں کے حق میں ہیں، سوائے اہل کتاب کے، دوسرا گروہ کہتا ہے اہل کتاب کے حق میں ہیں، تیسرا گروہ کہتا ہے:

"بل الآيات الأربع من أول هذه السورة أنزلت على محمد ﷺ بوصف جميع المؤمنين الذين ذلك صفتهم من العرب و العجم و أهل الكتابين سواهم" (تفسیر ابن جریر: ١/ ٧٨)

یعنی یہ چار آیات شروع سورہ سے آنحضرت ﷺ پر اُتری ہیں مومنین کے بیان میں جن کی یہ صفت ہے عرب سے ہوں یا عجم سے، خواہ ان کے سوا اہل کتاب یہود ونصاریٰ سے۔"

یہ تیسرا قول معقول ہے ہمارا بھی یہی پسندیدہ ہے کیونکہ "المطلق يجري على إطلاقه و العام يجري على عمومه"[1]

پادری صاحب! جس امر میں تین قول ہیں آپ نے کس دلیری سے اس پر اتفاق کا اظہار فرمادیا؟ ہاں اہل کتاب کو بے شک حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کے اتارے ہوئے احکام سے فیصلہ کریں۔ خدا کے اُتارے ہوئے احکام کی تفصیل پہلے ہم دکھا چکے ہیں۔ فافهم.

سورۂ بقرۃ: دوسرا رکوع:

﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَاۤ

[1] مطلق اپنے اطلاق پر اور عام اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔

اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ
اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ
الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ
وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ
لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ
بَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ
الْمَوْتِ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ
اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ
قَامُوْا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرة: ۸ تا ۲۰]

ترکیب نحوی:

﴿مِنَ النَّاسِ﴾ خبر مقدم۔ ﴿مَنْ﴾ موصولہ مبتدا موخر متضمن کثرت ﴿يُخٰدِعُوْنَ﴾ ایک جانب سے ہے جیسے "عاقبت اللص" مفعول اس کا محذوف ہے، یعنی "رسول اللہ" کیونکہ جہاں ان کی دھوکہ دہی کی تفصیل مذکور ہے وہاں رسول اللہ ﷺ ہی مذکور ہیں:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴾ [1] [البقرة: ٢٠٤]

اس آیت میں مذکور ہے کہ منافق آنحضرت ﷺ کو دھوکہ دیتے تھے۔ رسول سے بحیثیت رسالت جو برتاؤ ہوتا ہے وہ اللہ سے ہوتا ہے۔ ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء: ٨٠] انھی معنی کا اظہار کرتی ہے۔ ﴿مَرَضٌ﴾ سے مراد ہے اسلام کے برخلاف دلوں میں کھوٹ یا کینہ یا انکار۔ ﴿السُّفَهَآءُ﴾ جمع سفیہ کی ہے۔ منافق، صحابہ کو سفیہ کہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک عقلمندی کا اصول یہ تھا کہ انسان ہر طرف ملتا رہے ۔

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

"شیاطین" سے مراد ان کے سرکردہ لوگ ہیں جن کے دباؤ یا لحاظ سے وہ گمراہی اختیار کرتے تھے۔ ﴿مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ کے معنی ہیں مسخری کرنے والے۔ ﴿يَسْتَهْزِئُ﴾ مصدر استہزاء سے ماخوذ ہے۔ مگر اس کے معنی ہیں مسخری کی سزا دینا۔ عرب کہا کرتے ہیں: "کما تدین تدان" جیسے کرے گا ویسے بھرے گا۔ ﴿يَمُدُّهُمْ﴾ کے معنی ہیں ان کو مہلت دیتا ہے۔ ﴿يَعْمَهُوْنَ﴾ زندگی کے چکر میں گھومتے ہیں۔ ﴿صُمٌّ﴾ خبر مبتدا محذوف کی أي: هم صم. ﴿اَوْ كَصَيِّبٍ﴾ أي: مثلهم كأهل المطر النازل من السحاب. ﴿اَوْ﴾ برائے تنویع تفہیم کے لیے ہے۔ تردید کے لیے نہیں۔ یعنی مخاطب کو سمجھایا جاتا ہے کہ منافقوں کی مثال تم یوں سمجھو یا یوں۔ ﴿السَّمَآءِ﴾ سے مراد سحاب (بادل) ہے۔

ترجمہ: "بعض لوگ جن کو عرف شرع میں منافق کہا جاتا ہے وہ لوگ ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم حسب تعلیم قرآن اللہ پر اور پچھلے دن

---

1. ترجمہ: "بعض لوگوں کی باتیں تجھے اچھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنی دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔"

قیامت پر اور ان دو کے علاوہ ہر اس چیز پر ایمان لا چکے ہیں جس پر ایمان لانا اسلام میں ضروری ہے حالانکہ وہ دل سے مومن نہیں ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اظہار ایمان کر کے اللہ کے رسول کو اور ایمانداروں مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں تاکہ مسلمان ان کو مومن جان کر مسلمانوں کا سا برادرانہ برتاؤ کریں حالانکہ یہ خود اپنے نفسوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور سمجھتے نہیں اس لئے کہ اس کا وبال آخر انہی پر ہے۔ ان کے دلوں میں کفر و شرک کی بیماری ہے پس خدا ہر روز آیات جدیدہ اُتار کر ان کی بیماری کو بڑھاتا ہے کیونکہ جوں جوں قرآن اُترتا ہے یہ اُس سے انکار کرتے جاتے ہیں یہی ان کی بیماری میں ترقی ہے۔ اور بعد موت ان کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور ان کی ایک علامت سنو جب کبھی ان کو کہا جاتا ہے کہ تم اِدھر کی اُدھر، اُدھر کی اِدھر لگا کر ملک میں فساد مت کرو کہتے ہیں ہم ہی تو مصلح ہیں ۔ برخلاف تمہارے کہ تم مسلمان ایک ہی طرف کے ہو رہے ہو جس سے فرقہ وار جنگ کا احتمال بلکہ گمان غالب ہے۔ سنو لوگو! یقیناً یہی لوگ مفسد ہیں کیونکہ وہ جماعتوں میں لڑائی ڈلواتے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ میاں تم جو ایمان کا اظہار کرتے ہو سیدھے سادے بھلے انسانوں کی طرح ایمان لاؤ یہ کیا بات ہے کہ تم ایمان کا اظہار بھی کرتے ہو اور کافروں سے میل جول بھی رکھتے ہو۔ اس کے جواب میں کہتے ہیں کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں اور ان کی طرح مسلمان ہوں جو دنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر ہیں۔ سنو! دراصل یہی منافق لوگ بے وقوف ہیں لیکن یہ لوگ دین و مذہب کی غرض و غایت نہیں جانتے اور باوجود اس کے جب یہ منافق ایماندار لوگوں سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم باقاعدہ مومن ہیں اور جب اپنے گمراہ کرنے والے شیاطین کی طرف جاتے ہیں تو اُن سے

کہتے ہیں یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں مسلمانوں سے تو ہم محض دل لگی اور خوش طبعی کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اتنا کہنے سے (کہ ہم خدا کو اور قیامت کو مانتے ہیں) خوش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم بھی اُن کو بتاتے ہیں اللہ ان کو اس مسخری کی سزا دے گا اور سردست چند روز ان کی گمراہی میں مہلت دیتا ہے اس لئے یہ لوگ بہکے پھرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو استعارہ کے رنگ میں یہ کہنا بجا ہے کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے ساتھ خرید کیا ہے سو نہ ان کا یہ سودا نفع بخش ہوا نہ یہ سودے میں ڈھب سیکھے یعنی ان کو یہ سمجھ نہ آئی کہ اچھی چیز کو دے کر بُری چیز لینا اصول تجارت کے سراسر خلاف ہے۔ یا استعارہ کے رنگ ان کی دوسری مثال ان قافلے کے لوگوں کی طرح ہے جنھوں نے بوجہ اندھیرے کے جنگل میں آگ جلائی جس سے روشنی پیدا ہوئی پھر جب اُس آگ کے اردگرد کی سب چیزیں روشن ہوئیں تو ان کی بے پرواہی کی وجہ سے خدا نے ان کی روشن آگ بجھادی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا اب اس اندھیرے میں وہ کچھ نہیں دیکھتے یہ قافلے والوں کی مثال ان منافقوں کے حسب حال ہے۔ یہ بھی مجلس نبوی میں آئے نور نبوت کی چمک ان پر پڑی پھر روگردانی کر کے استغنا کر گئے اس لیے (کلام حق سننے سے بہرے اور) حق گوئی سے گونگے ہیں اور آثار صداقت دیکھنے سے اندھے ہیں پس یہ لوگ حق کی طرف رجوع نہیں کرتے ان کی حالت اس مثال سے سمجھو یا دوسری مثال ان کی مینہ والوں کی طرح ہے جو بادلوں سے اُترتا ہے اُس میں یعنی اُس کے اُترنے کے وقت کئی طرح کے اندھیرے ہیں۔ سفید بادل سے، سیاہ بادل سے، رات کی وجہ سے، کڑک ہے اور چمک ہے وہ مینہ والے لوگ ان کڑکوں کی وجہ سے موت سے ڈرتے ہوئے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں تا کہ کانوں کے پردے نہ پھٹ

جائیں اور اللہ مومنوں کافروں سب کو گھیرے ہوئے ہے اس کے احاطہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہوسکتی۔ مطلب اس مثال کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ہوا و ہوس میں گرفتار ہیں۔مجلس نبوی میں برق ہدایت کی روشنی ان پر چمکتی ہے تو یہ لوگ اس سے اپنی اعتقادی موت جان کر اس سے بے التفاتی اور روگردانی کرتے ہیں کیونکہ برق نبوی ایسی ہے کہ فوراً ان کی بینائی کو اچک لے یعنی ان کے سابقہ عقائد پر اثر کرے جب کبھی ان پر روشنی ہوتی ہے تو اُس میں چند قدم چلتے ہیں اور جب ان پر نفسانی ظلمت سے اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے ہوجاتے ہیں یہ سب اُن کی نفسیات کی کیفیات ہیں یہ لوگ ہدایت الٰہیہ کے متعلق آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں جڑ سے برباد کردے یعنی قوت بینائی اور شنوائی بند کردے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر کام پر قادر ہے۔''

نوٹ:یہ مثالیں کچھ ایسی نہیں جو اُسی زمانہ کے منافقوں سے مخصوص ہوں بلکہ آج کل بھی ان کا صدق بحال ہے۔

ناظرین کرام! آپ کو ایسے مواقع دیکھنے کو ملے ہونگے۔کئی لوگ ایسے ہیں جو وعظ کی مجلس میں اثر قبول کرتے بلکہ روتے ہیں مگر وہاں سے نکل کر سب بھول جاتے ہیں۔بعض لوگ اپنی نفسانی ہوا وہوس سے مغلوب کسی موقع مجلسِ وعظ میں اگر پھنس جائیں تو ایسے غافل بیٹھتے ہیں گویا وہ چاہتے نہیں کہ کوئی کلمہ خیر اُن کے کانوں میں آئے۔اس لیے یہ دونوں مثالیں آج بھی مختلف انسانوں پر صادق ہیں۔ اللہ اعلم

﴿یُخٰدِعُوْنَ﴾ کے متعلق ایک سوال:

پادری صاحب نے ﴿یُخٰدِعُوْنَ﴾ کے متعلق ایک سوال تفسیر کبیر سے نقل کیا ہے جو یہ ہے:

''امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو اس موقع میں اس لفظ کے

استعمال پر اعتراض ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کو دھوکہ دینا دو وجہ سے محال ہے اوّل یہ کہ خدا دلوں اور ان کی تمام پوشیدہ باتوں سے واقف ہے۔ پس جب انسان خدا سے کوئی بات چھپا نہیں سکتا تو وہ خدا کو کس طرح دھوکہ دے سکتا ہے؟ دوم یہ کہ منافقین کو کبھی اس بات کا یقین نہ تھا کہ خدا نے اُن کے پاس رسول بھیجا ہے پس اُن کی منافقت سے کبھی ان کا یہ قصد نہ تھا کہ وہ خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس لفظ کا استعمال اس موقع پر مناسب نہیں تاوقتیکہ اس کی تاویل نہ کی جائے۔ (سلطان التفاسیر، ص:۵۰)

پادری صاحب نے تفسیر کبیر سے سوال نقل کیا ہے کہ منافق دل سے خدا کو فریب نہ دیتے تھے۔ پھر یہ کیوں کہا گیا؟

یہ سوال واقعی تفسیر کبیر میں ہے۔ مگر پادری صاحب کی عادت ہورہی ہے کہ اسلامی تفسیروں سے سوال نقل کر کے عیسائیوں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن جواب نقل نہیں کرتے۔ امام ممدوح نے اس سوال کے دو جواب دیے ہیں۔ ایک جواب وہی ہے جو ہم نے حل لغات میں ذکر کیا ہے۔ یعنی ''اللہ'' سے پہلے ''رسول'' کا لفظ محذوف ہے۔ اس تاویل کی دلیل امام ممدوح نے وہ آیت لکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾ [الفتح: ۱۰]

یعنی جو تجھ (رسول) سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے کرتے ہیں۔

امام ممدوح نے جو آیت نقل کی ہے اس دعوے کی دلیل بے شک ہے۔ مگر ہم نے جو لکھی ہے وہ اس سے اُوضح اور اُصرح ہے۔

پادری صاحب اگر کہیں کہ میں نے نقل سوال میں دھوکہ نہیں کیا پھر اس میں مجھ پر الزام کیا؟ جواباً گزارش ہے کہ آپ کا اس سوال کو نقل کرنا محض نقل نہیں بلکہ باصطلاح علم مناظرہ ''غصب'' ہے۔ کیونکہ آپ نے اس اعتراض کو نقل کر کے اشارۃً

اس سوال کو لاینحل قرار دیا ہے۔ اس لیے آپ پر الزام وارد ہے۔ ہاں آپ اس اعتراض کا جواب نقل کر کے جواب کو کمزور ثابت کرتے تو ہم یہ الزام آپ پر نہ لگاتے۔ اب تو ہمارا الزام آپ پر قوی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں ؎

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانہ میں دستور نکلا

پادری صاحب نے ان دونوں تمثیلوں پر جو جو اعتراض کیے ہیں وہ ہمارے حل لغات اور تفسیری ترجمہ ہی سے دفع ہو جاتے ہیں۔

عربیت کی رو سے:

پادری صاحب نے یہاں عربیت کی رو سے بھی اعتراض کیے ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرة: ۱۷]

یہاں پر ﴿الَّذِى﴾ کا استعمال غلط ہے۔ "الذین" کہنا چاہیے تھا۔"

(سلطان التفاسیر، ص:۵۹)

برہان:

عربی زبان میں "الذي" اور "من" دونوں موصول ہیں۔ اور دونوں ایک ہی معنی کے لیے ہیں اور ان کا حکم بھی ایک ہے۔ یعنی صورتاً مفرد ہیں اور جمع کے معنی ان کے اندر داخل ہیں۔ "من" کی مثال پہلے آچکی ہے۔

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرة: ۸]

اس آیت میں ﴿مَنْ﴾ کی صورت کے لحاظ سے ﴿يَقُوْلُ﴾ مفرد ہے۔ اور شمول جمع کے لحاظ سے ﴿هُمْ﴾ جمع آیا ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں

﴿الَّذِیْ﴾ کو سمجھیے۔ جس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا گیا ہے جو ﴿مَنْ﴾ کے ساتھ یعنی ﴿اسْتَوْقَدَ﴾ صیغہ مفرد ہے اور ﴿ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ﴾ میں ''ھِمْ'' جمع ہے۔ پس یہ ﴿الَّذِیْ﴾ صورتاً مفرد ہے معناً جمع، بمعنی ''الذین'' ہے۔ اس جواب سے آپ کا دوسرا سوال بھی دفع ہو جاتا ہے جو یہ ہے:

''﴿فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَہٗ﴾ میں جو لفظ ﴿فَلَمَّآ﴾ ہے اس کے جواب کا مذکور ہونا واجب ہے۔ حالانکہ اس کا جواب کہیں بھی نہیں ہے۔ علامہ زمخشری ﴿ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ﴾ کو اس کا جواب بتلاتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے جواب ہونے میں دو مانع ہیں: ایک لفظی اور دوسرا معنوی۔

''مانع لفظی یہ ہے کہ ﴿اسْتَوْقَدَ﴾ میں اور ﴿حَوْلَہٗ﴾ میں ضمیر واحد ہے اور ﴿بِنُوْرِھِمْ﴾ میں ضمیر جمع ہے۔ لہٰذا ﴿ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ﴾، **فلما** کا جواب نہیں ہوسکتا۔ مانع معنوی یہ ہے کہ **مستوقد نارا** یعنی آگ سلگانے والے کا کوئی قصور نہیں۔ قصور اگر ہے تو منافق کا ہے۔ پس اس کی آگ کیوں بجھائی جاتی ہے؟'' (ص:۵۹)

جواب:

لفظی مانع کا جواب یہ ہے کہ ''نورھم'' اسی طرح جمع ہے جیسے ﴿وَمَا ھُمْ﴾.
معنوی مانع کا جواب یہ ہے کہ ﴿اسْتَوْقَدَ﴾ کے بعد ''غفل'' فعل محذوف ہے یعنی آگ جلانے والے نے اپنے فعل کو جاری نہ رکھا۔ قرینہ اس حذف کا ہم آپ کو بتاتے ہیں مگر خطرہ ہے کہ آپ کو اس کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔ خیر جو بھی ہو۔ سنیے! علم اصول کا مسئلہ ہے:

''الفعل لا یدل علی التکرار''

''کوئی فعل بھی (مثلاً اسْتَوْقَدَ) تکرار پر دلالت نہیں کرتا۔''

باصطلاح فارسی یوں کہئے کہ فعل ماضی مطلق (آمد) ماضی استمراری (می آمد)

کے معنی نہیں دیتا۔ پس ﴿اسْتَوْقَدَ﴾ کے معنی ہیں ''آگ جلائی۔'' مگر ''جلائی'' استمرار فعل ''جلاتا رہا'' کو مستلزم نہیں۔ استمرار اسی صورت میں ہوگا کہ آگ جلانے والا لکڑیوں سے آگ کو مدد دیتا رہے۔ جب یہ اس نے نہ کیا تو آگ بجھنے میں اُس کا قصور ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ میں ان سب باتوں کو کھول دیا ہے۔

علاوہ اس کے تشبیہ میں کسی قصور بے قصور پر نظر نہیں ہوتی بلکہ دونوں میں ہیئت کذائی پر نظر ہوتی ہے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ تشبیہ غلط ہے: زید عمرو دو بھائی ہیں، زید بیماری کی وجہ سے فیل ہوا۔ عمرو غفلت اور کھیل کی وجہ سے۔ اُن کے باپ سے کوئی پوچھتا ہے لڑکوں کا امتحان کیسے رہا؟ وہ کہتا ہے: ''جیسے زید فیل ہوا ویسے عمرو فیل ہوا۔'' حالانکہ ان میں ایک کا قصور ہے دوسرے کا نہیں۔ مگر متکلم کو اس سے غرض نہیں وہ صرف نتیجہ بتاتا ہے۔ فاندفع ما أورد.

تیسرا سوال:

﴿أَصَابِعَهُمْ﴾ أصابع کا استعمال یہاں پر معیوب ہے ''أناملهم'' کا مستحسن تھا۔ کیونکہ ''أصابع'' کا اطلاق پوری اُنگلیوں پر ہوتا ہے۔ اور کوئی شخص اپنی پوری اُنگلیوں کو اپنے کان میں نہیں ڈالتا ہے۔ بلکہ اپنی اُنگلیوں کے سروں کو اپنے کانوں میں ڈالتا ہے۔ اور اُنگلیوں کے سروں کے لیے ''أنامل'' استعمال ہوتا ہے۔'' (ص:۵۹)

برہان:

پادری صاحب نے غور نہیں فرمایا یہاں خوف کی شدت بطور مبالغہ کے بتانا مقصود ہے۔ معمولی آواز کے لیے ''أنامل'' کام دے سکتی ہیں مگر جب سخت شدت کی آواز ہو (جیسی ریلوے انجن کے قریب) تو اُس وقت انسان اُس مکروہ آواز سے بچنے کے لیے اتنی کوشش کرتا ہے کہ ہو سکے تو ساری اُنگلی کان میں داخل کر دے۔

آہ! اس کی پوری مثال ہم آپ کو اُس وقت بتائیں گے جب آپ جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد غازی (دھرم پال) کی طرح ہم سے ملاقی ہوں گے تو ہم آپ کو بزور بھینچتے ہوئے یہ شعر پڑھیں گے ۔

جذبۂ عشق بحد یست میانِ من وتو

کہ رقیب آمد و نشناخت نشانِ من و تو ❶

کیا آپ اُس وقت بھی فرمائیں گے کہ نہیں ہم ایک نہیں دو ہیں۔ واللہ! اگر ایسا کہیں گے تو بامذاق حاضرین بیک زبان آپ کو کہیں گے ۔

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست ❷

چوتھا یا نچواں سوال:

﴿فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ﴾ [البقرة: ١٩] میں چونکہ ﴿ظُلُمٰتٌ﴾ کو بصیغہ جمع ذکر کیا ہے لہٰذا مناسب تھا کہ ﴿رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ﴾ کو بھی بصیغہ جمع ذکر کرتا۔ یعنی "رعود وبروق."

۵۔ ﴿لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ﴾ میں لفظ "سمع" کو واحد لایا گیا ہے اور "أبصار" کو جمع۔ مناسب یہ تھا کہ یا تو دونوں کو جمع لاتے یا دونوں کو واحد۔ چنانچہ ابن ابی عبلہ کی قراءت میں لفظ سمع بجائے واحد کے بصیغہ جمع "بأسماعهم" آیا ہے جو ابصار کے بالمقابل صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

برہان:

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ حسب قاعدہ ان کی جمع بنا سکتے ہیں مگر ہمیشہ ایسا یا اکثر استعمال میں جمع مستعمل نہیں ہوتی بلکہ مفرد ہی استعمال ہوتا ہے۔ ''رعد'' اور

❶ جذبہ عشق ہمارے اور تمھارے درمیان رہے کہ رقیب آئے اور میرے اور تمھارے نشان پہچان نہ سکے۔
❷ دلبر تم سخن شناس نہیں، یہی غلطی ہے۔

''برق'' اور ''سمع'' اسی قسم سے ہیں۔ ''رعد'' اور ''برق'' قلیل الاستعمال ہیں۔ نیز ان میں اضافت بھی نہیں ہوتی۔ ہاں ''سمع'' کا لفظ کثیر الاستعمال ہے اور اضافت سے آتا ہے۔ باوجودیکہ اس کا مضاف الیہ جمع ہوتا ہے تاہم یہ مفرد آتا ہے۔ غور سے سنیے:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ ﴾ [الأنعام: ٤٦]

پادری صاحب! اس کی مثال اُردو میں یہ ہے۔ مال کی جمع اموال یا مالوں اور پیسہ کی جمع پیسے، روپیہ کی جمع روپے آتی ہے۔ مگر بولنے میں کہا جاتا ہے: زید کا مال تباہ ہوگیا۔ زید کا پیسہ لٹ گیا۔ زید کا روپیہ تجارت میں پھنس گیا۔ کیا یہ محاورات غلط ہیں؟ ٹھیک اسی طرح یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہیں۔

نوٹ: یہ سوالات تفسیر کبیر، بیضاوی، وغیرہ میں مع جوابات درج ہیں (گو ہمارے جوابات کی نوعیت اور ہے) لیکن پادری صاحب محض سوالات نقل کرکے اپنا کمال دکھاتے ہیں اور جوابات اپنے ناظرین تک نہیں پہنچاتے۔ آپ سے پہلے بھی ایک صاحب گزرے ہیں جن کے بارے میں ان کے مظلوم نے کہا ہے۔

خونِ ناحق بھی چھپائے سے کہیں چھپتا ہے
کیوں وہ بیٹھے ہیں مری نعش پہ دامن ڈالے

(اس رکوع پر بحث ختم)

رکوع سوم:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
وَ الْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ
قَبْلُ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً
فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَ
اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ
كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ
يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ
اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝
كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ
سَمٰوٰتٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ [البقرۃ: ۲۱ تا ۲۹]

حل لغات:

خالق: وجود دینے والا۔ رب: اس وجود کو بذریعہ پرورش موجود رکھنے والا۔
السماء: (یہاں) مراد بادل ہے۔ ثمرات: (پھل) پیداوار زمین۔ انداد:

(جمع ند) شریک۔ ریب: شک۔ سورة: حصہ قرآن بقدر جواب مضمون۔ شهداء: جمع شہید کی ہے بمعنی راست گو گواہ۔ وقود: ایندھن۔ الحجارة: (جمع حجر) بمعنی پتھر۔ أزواج: (جمع زوج کی ہے) بیوی بمقابلہ خاوند یا خاوند بمقابلہ بیوی۔ مطهرة: پاک اخلاق والیاں۔ بعوضة: مچھر۔ فوق: اوپر (بڑائی میں)۔ یضل: اضلال سے مشتق ہے۔ اضلال گمراہ کرنا یا ہدایت سے ہٹادینا یا محروم کرنا۔ فاسق: بدکار بدعمل۔ ینقضون: نقض سے ہے بمعنی توڑنا۔ أمواتا: (جمع میت) بغیر جان یعنی بے زندگی۔ استویٰ: مصدر استوا سے ہے۔ متوجہ ہونا منہ سے یا ارادہ سے۔[1]

ترکیب:

﴿الَّذِیْ﴾ موصوف، صفت ﴿رَبَّكُمُ﴾۔ ﴿وَ الَّذِیْنَ﴾ عطف ضمیر منصوب "کم" پر۔ "لعل" بمعنی امید ہے، راجع الیٰ فاعل ﴿اُعْبُدُوْا﴾ أي: اعبدوا ربكم راجين التقوى. یعنی اللہ کی عبادت بامید حصول تقویٰ کرو۔ ﴿فِرَاشًا﴾ مفعول بہ ثانی ﴿جَعَلَ﴾ مرکب ہے جو دو مفعول بہ چاہتا ہے۔ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ شرط۔ ﴿فَاتَّقُوْا﴾ جزاء۔ ﴿وَ لَنْ تَفْعَلُوْا﴾ جملہ معترضہ برائے تنبیہ۔ ﴿رِزْقًا﴾ مفعول بہ ثانی۔ ﴿رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ﴾ بیان۔ ﴿مَثَلًا﴾ مفعول بہ۔ ﴿مَا﴾ صفت ﴿مَثَلًا﴾۔ ﴿بَعُوْضَةً﴾ بدل۔ ﴿مَثَلًا﴾ تمیز عن "ہذا"۔ ﴿اَنْ یُّوْصَلَ﴾ بدل اشتمال عن الضمیر المجرور۔ أي: أمر الله بوصله. ﴿لَكُمْ﴾ میں لام للانتفاع، ﴿جَمِیْعًا﴾ حال مقدرہ۔ "سواهن": صیر. ﴿بِكُلِّ﴾ متعلق بعلیم۔

ترجمہ: "اے دنیا میں رہنے والے انسانو! کچھ شک نہیں کہ تم مخلوق اور مربوب ہو۔ مخلوق اپنے خالق کا جتنا محتاج ہوتا ہے مربوب اس سے زیادہ

[1] استواء کا معنی ارتفاع اور علو ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: كتاب العلو للإمام الذهبي رحمه الله (ص: ٢٠٥)

محتاج ہے۔ صیغہ خلقت وجود میں آنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد مربوبیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے تم اس وقت مخاطب ہو۔ پس تم اپنے پرورش کرنے والے رب کی عبادت کیا کرو جس نے تم کو عدم سے وجود دے کر پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو جو تمہارے بزرگ تھے اُن سب کو بھی اُسی نے پیدا کیا ہے۔ اس حکم کی تعمیل اس امید سے کرو کہ تم متقی بن جاؤ۔ سنو! جس رب کی طرف تم کو بلایا جاتا ہے ایک صفت تو اُس کی یہ ہے کہ وہ تمہارا خالق اور رب ہے دوسری صفت عامہ اُس کی یہ ہے کہ وہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو وسیع فرش بنادیا ہے اور تمہارے سروں پر نیلگوں آسمان کو مثل مکان کی چھت کے بنایا ہے اب تم زمین پر بیٹھ کر اوپر کو نظر کرو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے وسیع گنبد کے اندر بستے ہو اور سنو! اُس نے تمہاری پرورش کا سامان ایسا کر رکھا ہے جو تم خود بھی دیکھتے ہو کہ بادلوں سے تمہارے لئے بارش اُتارتا ہے۔ بارش ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے سب جانداروں کی غذا بنتی ہے تمہارے لئے رزق پیدا کرنے کو بارش اُتارتا ہے پھر اُس پانی کے ساتھ زمینی پیداوار سے تمہارے لئے رزق پیدا کرتا ہے یہ ایسے واقعات ہیں کہ تم لوگ خود دیکھ رہے ہو پس ایسے مالک خالق اللہ کے ساتھ شریک نہ بناؤ جیسے مشرک لوگ بناتے ہیں، کوئی دیوی دیوتاؤں کو پوجتا ہے تو کوئی مسیح اور پیروں کو پکارتا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمہاری خلقت اور پرورش میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہیں، پھر تم کیوں کسی کے پجاری بنو؟ یہ تعلیم تم لوگوں کو جس کلام کے ذریعہ دی جاتی ہے وہ ہمارا (خدا کا) کلام اور ہدایت نامہ ہے اگر تم اس کلام کی صداقت سے شک میں ہو جو ہم (خدا) نے

اپنے بندے محمد رسول اللہ ﷺ پر بذریعہ وحی کے نازل کیا ہے یعنی تم اس کلام کو کلام خدا نہیں مانتے بلکہ کلام محمد جانتے ہو اور اسی پر مصر ہو کہ محمد (علیہ السلام) کا بنایا ہوا کلام ہے تو فیصلہ آسان ہے تم اس کلام جیسا ایک حصہ بنا لاؤ جسے لوگ دیکھ کر کہہ سکیں کہ یہ کلام اُس کلام (قرآن) جیسا ہے اور اس فیصلے کے لئے اللہ کے سوا اپنے گواہ بلا لو جو تمہارے دعوے کے ثبوت کی شہادت دیں۔ ہاں یہ مت کہنا جیسے جھوٹے لوگ کہا کرتے ہیں اللہ ہمارا گواہ ہے کہ یہ اُس کی مثل ہے کیونکہ ایسا کرنے سے فیصلہ نہیں ہوگا پھر اس نوٹس کے بعد بھی اگر تم لوگ یہ کام نہ کرو اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہرگز نہیں کرو گے پس اس صورت میں بھی مخالفت اور انکار کرنے میں اُس آگ کے عذاب سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ یعنی وہ ایسی آگ ہے کہ دنیا کی آگ پتھروں سے بجھ جاتی ہے وہ پتھروں کو بھی بھسم کر جاتی ہے وہ کلام الٰہی کے منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے اے پیغمبر! یہ نوٹس تو سُنا دے کافروں کو اور جو لوگ کلام الٰہی (قرآن) پر ایمان لائے ہیں اس کی ہدایت کے مطابق نیک کام ہی کئے ہیں اُن کو اس مضمون کی خوش خبری سنا دے کہ بعد الموت اُن کے رہنے کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے (انڈرگراونڈ) نہریں جاری ہیں جن میں سے ہر ایک جنتی کے مکان میں پانی پہنچے گا مہذب عیش و عشرت کے سامان تو وہاں اتنے ہوں گے کہ انسان کے تصور سے باہر ہیں جب کبھی اُن باغوں میں سے کوئی پھل انہیں کھانے کو ملے گا تو اس کی صورت کذائی دیکھ کر کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ابھی پہلے ہمیں ملا تھا۔ کیونکہ صورت اور شباہت میں یکساں ہوں گے اور اُن کو ملتا جلتا ملے گا جو صورت شکل میں ایک دوسرے کے

مشابہ ہوگا مگر لطف اور ذائقہ میں مختلف۔ یہ نہ ہوگا کہ اس عیش وعشرت اور راحت میں اُن کو تجرد کی تکلیف ہو بلکہ ان کے لئے پاک بیویاں ہوں گی جو ان کی آسائش اور راحت کی موجب بنیں گی ایسی راحت اور آسائش اگر چند روزہ ہو تو کہا جاتا ہے ۔

چلنا ہے رہنا نہیں چلنا بسوے بیش
ایسی سیج سہاگ پر کون گندھاوے سیس

مگر جنتی لوگوں کا عیش چند روزہ نہ ہوگا اور نہ وہ کسی مدت بعد ان باغوں سے نکالے جائیں گے بلکہ وہ اُن باغات میں بعیش وعشرت ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ تو ہوا دونوں گروہوں منکروں اور مومنوں کا انجام، چونکہ لوگوں کو سمجھانے میں بعض مرتبہ کسی قسم کی مثال بھی دینی پڑتی ہے جو مفید ہوتی ہے اس لئے اس ہدایت نامہ (قرآن شریف) میں بھی مثال دی جاتی ہے اور آیندہ بھی دی جائے گی اس لئے اللہ تعالیٰ جو اس ہدایت نامہ کا بھیجنے والا ہے بغرض تفہیم کسی قسم کی مثال[1] دینے سے نہیں رکتا وہ مثال مچھر جیسے حقیر جانور کی ہو یا اس سے زیادہ کسی بڑے کی، کیونکہ مثال میں خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ مضمون سمجھنے میں مفید ہو۔ یہ نہیں کہ وہ چیز حقیر ہے اس لیے قابل ذکر نہیں۔ اس لیے خدا کی تمثیل دینے کا نتیجہ بھی وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہئے۔ یعنی پھر جو لوگ ایماندار ہوتے ہیں اُن کا مقصد چونکہ کلام کا سمجھنا ہوتا ہے اس لئے وہ مثال کو سنتے ہی جانتے ہیں کہ یہ مثال بالکل ٹھیک سچ اور خدا کی طرف سے ہے ۔ کیونکہ اس سے ان کو مضمون خوب سمجھ میں آتا ہے[2]

[1] شان نزول: کفار نے قرآن مجید کی تمثیلات پر اعتراض کئے ان کے جواب میں یہ آیت اُتری۔ [مؤلف]

[2] سورہ عنکبوت میں فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ ←

اور جو منکر لوگ ہیں چونکہ ان کے دلوں میں عناد ہے اس لیے وہ فہم کلام کی طرف رخ نہیں کرتے بلکہ معترضانہ شکل میں کہتے ہیں خدا کو اس مثال سے کیا مطلب۔ چونکہ ایسا کہنا محض عناد سے ہے نہ فہم مطلب کی نیت سے اس لئے اس کا نتیجہ ان کے حق میں یہ ہوتا ہے کہ خدا اس مثال کی وجہ سے بہتوں پر گمراہی کا حکم لگا دیتا ہے اور اسی کے ساتھ بہتوں کو سمجھ عنایت کرتا ہے۔ یعنی جو لوگ مضمون سمجھنے کی طرف رخ کرتے ہیں ان کو سمجھ بخشتا ہے، اور جو کج بحثی اور ضد کرتے ہیں ان کو گمراہ کرتا ہے اس لئے کہ خدا کے ہاں یہ قانون ہے کہ وہ گمراہی کا حکم بدکاروں ہی پر لگایا کرتا ہے جو ناراستی کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ خدا کے ساتھ بندگی کا وعدہ پختہ کرنے کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں یعنی بوقت تنگی اور ضرورت خدا کے سامنے اظہار بندگی کرتے ہیں مگر بوقت فراخی سب بھول جاتے ہیں۔ یہ تو خدا کے ساتھ ان کا معاملہ ہے اور مخلوق کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ اسی قسم کا ہے کہ جس جس تعلق کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے توڑتے ہیں۔ مثلاً تعلق رشتہ،❶ تعلق اسلام،❷ تعلق انسانیت،❸ ان سب تعلقات کو حسب موقع

الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ یعنی جو لوگ اللہ کے سوا اور لوگوں کو حاجت روا جانتے ہیں ان کی مثال بالکل مکڑی کی ہے جو تاروں کا گھر بناتی ہے پھر اس میں اپنے آپ کو محفوظ جانتی ہے، حالانکہ سب گھروں سے کمزور تر مکڑی کا گھر ہے۔"
اس مثال میں یہ سمجھانا منظور ہے کہ مشرک لوگ اللہ کے سوا جتنے سہارے بنائے بیٹھے ہیں یہ سب ہیچ ہیں جیسا مکڑی کا گھر پناہ دینے کی حیثیت میں ہیچ۔ اسی طرح کی اور بھی مثالیں ہیں۔ [مؤلف]

❶ ﴿اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [الانفال: ۷۵] "رشتہ دار ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔" [مؤلف]

❷ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات: ۱۰] "سب مومن آپس میں بھائی ہیں۔" [مؤلف]

❸ ﴿قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ [البقرة: ۸۳] "سب انسانوں سے اچھا سلوک کیا کرو۔" [مؤلف]

ملائے رکھنا اور ملاتے رہنا خدا کا حکم ہے۔

جولوگ ان تعلقات کو توڑتے ہیں۔ اس توڑنے میں وہ اِدھر اُدھر آگ لگاتے ہوئے زمین پر فساد کرتے ہیں وہی خدا کے نزدیک نقصان اٹھانے والے ہیں۔ سنو! خدا کے حکم سے انکار کرنا دراصل خدا سے انکار کرنا ہے۔ تم لوگ اللہ سے کیسے منکر ہوتے ہو حالانکہ تم چاروں طرف سے خدا کے احاطۂ قدرت میں گھرے ہو اور کچھ نہیں اتنا تو تمہارے سمجھنے کو کافی ہے کہ تم پہلے بصورت منی بے جان تھے پھر اس (خدا) نے تم کو رحم مادر میں زندگی بخشی پھر دنیا میں مقررہ مدت تک رہتے ہو یہاں تک کہ تمہیں یعنی تم میں سے جن کی موت آجاتی ہے ان کو ماردیتا ہے۔ یہ بھی تمہارے مشاہدہ میں روزمرہ آتا ہے پھر ایک وقت روز قیامت آئے گا کہ تمہیں زندہ کرے گا پھر تم سب میدان محشر میں اُس کی طرف حاضری کے لئے پھیرے جاؤ گے یہ تو تمہارے اندر وجدانی ثبوت ہے، اب آفاقی ثبوت سنو وہی خدا ہے جس نے زمین کی سب چیزیں تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیں پھر آسمان کی طرف اس کا ارادہ متوجہ ہوا[1] تو ان کو سات طبقے بنا دیے اور ان میں عجیب عجیب صنعتیں رکھیں جن کی حقیقت بھی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ وہ خود ہی سمجھتا ہے کیونکہ وہ خدا ہر ایک کو جانتا ہے۔

---

[1] قرآن مجید میں زمین کی دو حالتیں بتائی ہیں ایک پہلی دوسری پچھلی، درمیان میں آسمان، پہلی حالت مشکل آٹے کے پیڑے کے ہے دوسری حالت چوڑی روٹی کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾ [سورۃ النازعات:۲۷-۳۰] یعنی خدا نے آسمان کو بلند پیدا کیا اس کی وجہ سے رات اور دن کا ظہور کیا پھر زمین کو پھیلایا۔ زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے اور پھیلاوٹ پیچھے۔ ناظرین اس نکتہ کو یاد رکھیں آگے کام آئے گا۔ [مؤلف]

اعتراضات:

پادری صاحب نے اس رکوع میں پہلا اعتراض یہ کیا ہے:

"لعل" کلمہ ترجی اور اشفاق ہے۔ اور ترجی اور اشفاق حاصل نہیں ہوتے مگر اُس وقت جبکہ ان کا انجام معلوم نہ ہو۔ لہٰذا اس لفظ کو خدا کے لیے استعمال کرنا محال ہے۔" (ص:۶۲)

برہان:

اس کا جواب ہم ترکیب ہی میں دے آئے ہیں کہ لعل مخاطب کی تلقین کے لیے ہے۔ اس کے بعد پادری صاحب نے مثلیتِ قرآن پر مفصل بحث کی ہے چنانچہ شروع اس کا یوں کیا ہے۔

مثلیت قرآن:

"اس آیت کے متعلق مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ اس میں قرآن شریف کی کسی سورۃ کی طرح ایک فصیح اور بلیغ سورت بنا کر پیش کرنے کی تحدی کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر نہ تو کبھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہوا ہے اور نہ ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔" (ص:۶۳)

برہان:

اس بحث میں مقدم امر یہ ہے کہ اس مثلیت سے مراد خود قرآن مجید نے کیا بتائی ہے؟ اس امر کی تحقیق کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں کیا کیا چیزیں ہیں؟ پھر یہ پتہ آسانی سے مل سکتا ہے کہ کس امر میں مثلیت چاہی گئی ہے۔

① قرآن مجید کی صحیح تعلیم مثلاً عقائد صحیحہ، توحید، حشر و نشر وغیرہ۔

② قرآن مجید میں اخبار گزشتہ اور آئندہ صحیحہ بھی ہیں جن کو پیش گوئیاں کہتے ہیں،

جیسے رومیوں کا مغلوب ہونا اور مغلوب ہو کر پھر غالب ہونا وغیرہ۔

③ قرآن مجید کی خوش اسلوبی اور فصاحت و بلاغت وغیرہ۔

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ مثلیت خوش اسلوبی میں مراد ہے۔ یعنی مشرکین منکرین کو کہا گیا کہ قرآن چونکہ عربی زبان میں ہے تم بھی عرب ہو اس جیسا عربی فصیح کلام بنا کر لے آؤ۔

بعض لوگ (مثل سر سید احمد خان) کہتے ہیں مثلیت پاک تعلیم میں مراد ہے۔

ایک جماعت ایسی بھی ہے جو کہتی ہے مثلیت اخبار غیب میں مراد ہے۔

انصاف یہ ہے کہ یہ اختلاف کچھ بھی محل خوف یا قابل التفات نہیں کیونکہ ان سب نے ان امور ثلاثہ میں سے ایک امر لیا ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ اس لیے پادری صاحب کا یہ کہنا کہ ''مسلمانوں کا اتفاق نہیں'' بھی قابل التفات نہیں۔ کیونکہ اس معمولی اختلاف سے عیسائیوں کا اختلاف متعلق الوہیت مریم اور الوہیت مسیح بہت زیادہ اشد اور اضر ہے۔ جسے پادری صاحب نظر انداز کر جاتے ہیں۔

اب ہم قرآن مجید سے شہادت لیتے ہیں کہ مثلیت سے مراد وہ کیا بتاتا ہے؟ کچھ شک نہیں کہ اخبار غیب سارے قرآن میں نہیں ہیں، یہ تو بہت تھوڑی آیات ہیں، حالانکہ مثلیت قرآن عام ہے۔ رہی تعلیم سو وہ تو منکرین کو ایسی کڑوی لگتی تھی کہ اسی تعلیم کی وجہ سے وہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کو معاذ اللہ مجنون اور مخبوط کہتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾ [السبا: ۷، ۸]

''منکرین قرآن کہتے ہیں آؤ لوگو! تمھیں ایک ایسا آدمی بتائیں جو کہتا ہے کہ جب مر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گے تو پھر پیدا ہو گے۔ کیا وہ اللہ پر

جھوٹ باندھتا ہے یا اُس کو جنون ہے۔"

اسی طرح ایک اور مقام میں فرمایا ہے:

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ﴾ [یونس: ۱۵]

"منکرین جو ہماری (خدا کی) ملاقات کا شوق اور تمنا نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا اور قرآن لا، یا اس میں تبدیلی کر دے۔ اے رسول آپ ان کو کہیے مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ میں باختیار خود اِس کو بدل سکوں۔"

اس قسم کی آیات بکثرت ہیں جن میں منکرین کا قرآن کی تعلیم کو ناپسند کرنا مذکور ہے۔ پھر ایسے لوگوں کو جو محض تعلیم کی وجہ سے شدید منکر ہوں یہ کہنا کہ "قرآن کی تعلیم جیسی تعلیم دینے والی کتاب لاؤ" کچھ معقول مطالبہ نہیں، کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو قرآن کے منکر اُس کی ناپسندیدہ تعلیم کی وجہ سے ہیں، پھر ہم بھی اس جیسی تعلیم سے پُر کتاب کیوں بنا کر لائیں؟

قرآنی شہادت:

اس لیے سب سے پہلے قرآن میں ثبوت دیکھنا چاہیے کہ مثلیت سے کیا مراد ہے؟ شکر ہے کہ اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں مشرکین کے اس مطالبہ کا جواب مذکور ہے:

﴿ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الأنفال: ۳۱]

"جب ہماری آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس قرآن کی مثل بنالیں۔ یہ تو صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کی نظر مثلیت میں تعلیم یا اخبار غیبیہ پر نہ تھی، بلکہ ان کی نظر محض طرز بیان پر تھی۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنے قادر الکلام ہونے

کی دلیل میں یہ بتایا کہ اس میں رکھا ہی کیا ہے؟ یہ کہ پہلے لوگوں کی حکایات ہیں اور بس۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص کسی شاعر سے کہے کہ ''مسدس حالیؔ' ایک بے مثل کتاب ہے۔ وہ اس کے جواب میں کہے کہ ایسی مسدس تو میں بھی بنا سکتا ہوں، اس میں کوئی نیا خیال تو ہے نہیں، مسلمانوں کی ترقی و تنزلی کی ایک ادھوری سی تاریخ ہے اور بس۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قادرالکلامی کا اظہار شاعرانہ طرز سے کرتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن مجید میں منکرین کو پہلے مثل قرآن لانے کی دعوت دی گئی، پھر دس سورتوں کی دعوت دی گئی۔ پھر ایک سورت کی دی گئی تو وہ اسی کمی تعداد کو اپنے حق میں تعجیز سمجھے۔ جس طرح کسی شاعر کو کہا جائے کہ اُستاد غالب کے دیوان جیسا دیوان بنا کر دکھا۔ نہ دکھائے تو کہا جائے اس کے ایک قصیدے جیسا قصیدہ بنا لا۔ نہ لائے تو کہا جائے اچھا ایک شعر ہی اس جیسا بنا لا۔ اس قسم کے مطالبات میں اسلوب کلام کی مثلیت مراد ہوتی ہے دگر ہیچ۔

پس امام ابوبکر باقلانی اور امام فخرالدین رازی مرحومین کا قول بالکل صحیح ہے جو آپ نے نقل کیا ہے:

> ''قرآن اس لیے معجزہ ہے کہ اس میں نظم و تالیف اور الفاظ کی نشست اس ڈھنگ پر واقع ہوئی ہے کہ اُن تمام اسالیب نظم سے جو بھی اس میں رائج تھے خارج اور اُن کے لیکچروں کے طرز سے بالکل مخالف، اس لیے اہل عرب کے لیے قرآن کا معارضہ کرنا ناممکن ہوگیا۔'' (باقلانی)

> ''قرآن اپنی فصاحت اور نادر اسلوب کی وجہ سے معجزہ ہے اور اس لیے کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہے۔ (رازی)۔'' (سلطان، ص:۶۴،۶۵)

رہی یہ بحث کہ عرب کا مقابلہ میں مثل قرآن نہ لانا کس وجہ سے تھا؟ آیا ان

کی قدرت میں نہ تھا یا قدرت کاملہ نے ان پر تصرف کر کے روک رکھا تھا؟ بے شک یہ دونوں قول علماءِ اسلام کے ہیں۔ حافظ ابن حزم جیسے محدث متکلم دوسرے قول کی طرف گئے ہیں۔ تحدی کے موقع پر فرمان خداوندی ﴿لَنْ تَفْعَلُوْا﴾ سے اس گروہ نے استدلال کیا ہے۔ کچھ بھی ہو بہر حال اعجاز کے دونوں فریق قائل ہیں۔

مخالفات فصاحت:

پادری صاحب نے چند مثالیں قرآن مجید کی خلاف فصاحت بتائی ہیں جو دراصل ان کی ایجاد نہیں بلکہ علم نحو اور علم معانی کی کتابوں میں اُن پر بحث آئی ہے۔ مگر بحث کر کے ان کو رد کر دیا ہے۔ پادری صاحب نے فصاحت کی تعریف میں کتاب ''مختصر معانی'' کی عبارت نقل کر کے ترجمہ کیا ہے جو یہ ہے:

> ''کلام فصیح وہ ہے جو ضعف تالیف اور تنافر کلمات اور تعقید سے پاک ہو۔ ضعف تالیف کے معنی یہ ہیں کہ کلام کی تالیف نحو کے قانون کے برخلاف ہو، مثلاً ضمیر کو مرجع سے پہلے لے آنا، مثلاً "ضرب غلامه زیدا" میں۔ تنافر کے یہ معنی ہیں کلمات زبان پر بھاری ہوں۔ مثلاً اس شعر میں کہ "ولیس قرب قبر حرب قبر "یعنی حرب کی قبر کے پاس کوئی اور قبر نہیں ہے۔ تعقید کے یہ معنی ہیں کہ کلام کسی نقص کی وجہ سے اپنے مقصد پر صاف دلالت نہ کرے۔'' (ص: ٦٥)

برہان:

بے شک یہ حوالہ صحیح ہے مگر ہمیں مضر نہیں۔ آپ نے اس تعریف پر نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن مجید پانچ وجہ سے فصاحت کے خلاف ہے۔

قرآن میں ضعف تالیف کا اعتراض:

چنانچہ لکھا ہے:

''قرآن شریف میں یہ پانچوں عیب کثرت کے ساتھ موجود ہیں جن کا حوالہ ہم آداب لغت عربیہ کے تحت میں دیتے آئے ہیں۔یہاں پر صرف ایک ایک مثال پر ہی اکتفا کریں گے۔

① ضعف تالیف کی مثال ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ [الاخلاص: ١] اس جملہ میں اضمار قبل الذکر ہے، یعنی ''ھو'' کو جو ضمیر ہے اللہ پر، جو اس کا مرجع ہے، مقدم کیا ہے۔''

برہان:

پادری صاحب کی محنت کی ہم داد دیتے ہیں مگر چونکہ آپ کی محنت مخالفانہ ہے مخلصانہ نہیں، اس لئے شیخ سعدی مرحوم کا قول جلوی نما ہوجاتا ہے ؎

''گل است سعدی و درچشم دشمناں خارست''[1]

پادری صاحب! ہم آپ کی محنت اور لیاقت کی داد دیتے ہیں، لیکن سوتیلی ماں کی طرح۔ آپ کی شکایت بھی ہے کہ آپ اپنے علم کو قرآن کے بگاڑنے میں خرچ کرتے ہیں اور دل میں جانتے ہیں کہ کون دیکھتا ہے؟ دیکھیے اس سوال کا جواب اگر آپ حاصل کرنا چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا۔علم نحو کی درسی کتابیں پانچ ہیں۔ ① نحو میر۔ ② شرح مائۃ عامل۔ ③ ہدایۃ النحو۔ ④ کافیہ۔ ⑤ شرح ملا جامی۔ ان کے سوا مطولات برائے مطالعہ ہیں۔ میں ان میں سے کسی اونچی کتاب دیکھنے کی آپ کو تکلیف نہیں دیتا، بلکہ محض ہدایۃ النحو کی بابت تکلیف رساں ہوں۔ اس میں ضمیر شان کی بحث دیکھیے۔مصنف نے لکھا ہے:

''اعلم أن لهم ضميرا يقع قبل جملة تفسره ويسمىٰ ضمير الشأن، نحو قل هو الله أحد'' (ص: ٤٦)

[1] سعدی پھول ہے اور دشمنوں کی آنکھ میں کانٹا۔

''پادری صاحب! جانیے کہ عربوں کے لیے ایک ضمیر شان ہے جو جملہ سے پہلے آیا کرتی ہے، جملہ اس کی تفسیر کرتا ہے جیسے: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾''

قرآن کی ترکیب کرنے والے ''اعراب القرآن'' کے مصنف نے بھی اس کو ضمیر شان لکھا ہے۔ تفسیر کے حوالے کی ضرورت ہے تو تفسیر جامع البیان وغیرہ میں بھی ضمیر شان لکھا ہے۔ ❶ ضمیر شان کے لیے مرجع تلاش کرنا ''شیر خان'' کی دم تلاش کرنے کے مشابہ ہے۔ کیونکہ اس کا ترجمہ وہ نہیں ہوتا بلکہ یوں ہوتا ہے:

''اے رسول تو کہہ کہ بات یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔'' فاندفع ما أورد.

قرآن میں تنافر کلمات کا اعتراض:

۲۔ دوسری خرابی پادری صاحب نے یہ لکھی ہے:

''تنافر کی مثال: ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ﴾ علماء علم بیان نے بھی کوشش کی ہے کہ اس کی کچھ تاویل کریں لیکن نہ کر سکے، اور یہ کہہ کر خاموش ہوگئے:

"الكلام الطويل المشتمل على كلمة غير فصيحة لا يخرج عن الفصاحة"

یعنی اگر ایک لمبے کلام میں ایک غیر فصیح کلمہ ہو تو اس سے وہ کلام فصاحت سے خارج نہیں ہوسکتا۔

پھر آگے چل کر خود یہی شارح کہتے ہیں:

"ولو سلم عدم خروج السورة عن الفصاحة فمجرد اشتمال القرآن على كلام غير فصيح بل على كلمة غير فصيحة مما يقود إلى نسبة الجهل أو العجز إلى الله، تعالىٰ الله عن ذٰلك علوا كبيرا." ❷

❶ تفسير جامع البيان (٤/ ٥٤١)

❷ مختصر المعاني (ص: ١٠)

یعنی اگرچہ یہ سچ ہے کہ ایک غیر فصیح کلمہ کی وجہ سے پوری سورت درجہ فصاحت سے خارج نہیں ہوتی لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآن میں کلمات غیر فصیح کا ہونا تو درکنار رہا اگر قرآن میں ایک کلمہ بھی غیر فصیح ہو تو اس سے خدا کا جہل اور عجز ثابت ہوگا۔ حالانکہ خدا اس سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ (مختصر معانی)۔ (سلطان التفاسیر، ص: ۶۵، ۶۶)

<u>برہان:</u>

بے شک یہ عبارت مختصر معانی میں ہے لیکن اگر آپ کو معلوم ہوتا یا آپ انصاف سے اس قول کو دیکھتے یا اس کے متعلق ''مختصر'' کے بعد ''مطول'' دیکھنے کی تکلیف فرماتے تو تصویر کا رخ یہ نہ ہوتا۔ خیر آپ سے جو ہو سکا آپ نے کیا۔ ہمارا جو فرض ہے ہم کرتے ہیں۔ صاحب مطول اس قول کو مردود قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قد سبق إلی بعض الأوهام أن اجتماع الحروف المتقاربة سبب للثقل المخل بفصاحة الكلمة، وأنه لا يخرج الكلام المشتمل على كلمة غير فصيحة عن الفصاحة كما لا يخرج الكلام المشتمل على كلمة غير عربية عن كونه عربيا فلا تخرج سورة فيها ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ﴾ عن الفصاحة... الخ'' (مطول بحث فصاحت)

''بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے کہ قریب المخرج حروف کا کسی جگہ جمع ہونے سے فصاحت میں خلل آتا ہے، پس جس کلام میں کوئی ایک آدھ کلمہ ایسا غیر فصیح ہو تو سارا کلام فصاحت سے نکل نہ جائے گا۔ جیسے وہ عربی کلام عربیت سے نکل نہیں جاتا جس میں کوئی ایک آدھ کلمہ غیر عربی ہو۔ پس جس سورۃ میں ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ﴾ آیا ہے وہ فصاحت سے خارج نہ ہوگی۔''

اصل بات یہ ہے کہ جملہ علمائے معانی کے برخلاف ایک متاخر نے یہ بات کہی کہ قریب المخرج دوحرفوں کا جمع ہونا مخل فصاحت ہے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ یہ تو قرآن میں بھی ہے جو آپ کے نزدیک بھی فصیح بلیغ ہے۔ تو اسی قائل نے اپنے اصول کو بحال رکھنے کے لیے یہ بات بنائی کہ ایک لفظ غیر فصیح آنے سے سارا کلام غیر فصیح نہیں ہوتا۔

علامہ تفتازانی (صاحب مطول) اس قول کو ''وہم'' سے تعبیر کر کے تردید کرتے ہیں۔ مگر پادری صاحب اسی کو اصول قرار دے کر قرآن پر معترض ہوتے ہیں جو خود قائل کے بھی خلاف منشا ہے اور علماء معانی کے بھی مخالف!

اس کی مثال:

انجیل میں ایک لفظ ''سردار'' آیا ہے۔ (یوحنا باب ۱۶)

اس سردار سے مراد عیسائی لوگ شیطان کہتے ہیں۔ مسلمان آنحضرت ﷺ کو سردار مانتے ہیں اور اس انجیلی لفظ کے مصداق جانتے ہیں۔[1] پادری فنڈر اس (اسلامی) خیال کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے کہ اس سردار کے لفظ سے پیغمبر اسلام مراد ہیں۔ (مفہوم)'' (میزان الحق، ص: ۲۴۹)

اب اس قول کو کوئی مخالف مسیحیت یوں پیش کرے کہ سارے مسیحیوں کا یہ مذہب سمجھا جائے تو پادری صاحب بتادیں کہ وہ ایسے شخص کا نام کیا رکھیں گے؟ تاکہ ہم بھی آپ کو اسی نام سے یاد کیا کریں۔

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم تامن ہماں گویم[2]

---

[1] یعنی اہل اسلام انجیل میں وارد لفظ ''سردار'' بشارت کے طور پر آنحضرت ﷺ کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں جبکہ نصاریٰ ضد وعدوان کی بدولت اس حقیقت کے منکر ہیں۔

[2] روز حشر اگر پوچھا کہ خسرو کو کیوں قتل کیا تھا تو کیا کہو گے تاکہ ہم بھی وہی کہیں؟

قرآن میں کثرتِ تکرار کا اعتراض:

۳۔ تیسری خرابی آپ نے یہ بتائی ہے:

"کثرتِ تکرار کی مثال:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾

[الشمس: ۷، ۸]

ایک ہی ضمیر کو کئی بار دُہرایا ہے۔" (ص:۶۶)

اس کا جواب صاحب "مطول" نے خود دیا ہے:

"لا شك في ثقل ذلك في الأكثر، لكنه إذا سلم من الاستكراه ملح ولطف." [1] (مطول)

"اس میں شک نہیں کہ کثرتِ تکرار سے اکثر اوقات ثقل پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر کراہت پیدا نہ ہوتو بہت خوب اور کلام لطیف ہوجاتا ہے۔"

آیئے! ہم آپ کو کثرت تکرار کے ہوتے ہوئے بھی کلام لطیف کی مثال بتادیں:

أخي والله خير من أخيكم　　إذا ما لم يجد بطل مقاما
أخي والله خير من أخيكم　　إذا ما لم يجد راع مساما
أخي والله خير من أخيكم　　إذا الخفرات أبدين الخداما [2]

(أمثال المفضل الضبي مطبوعه جوانب، ص: ۳۹)

دیکھیے پہلا مصرع مجسم تکرار ہے تاہم ساری نظم لطیف ہے۔ آپ کی خاطر ہم اُردو کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے ایک

[1] المطول على التلخيص (ص: ۲۳)

[2] أمثال العرب للمفضل الضبي (ص: ۱۰۳) تحقيق إحسان عباس۔ طبعة دار الرائد العربي۔ لبنان

مثلث اُردو پنجابی کا مرکب لکھا ہے جس کے چند ابیات یہ ہیں ؎

ناحق مارے دھیان طبیباں انہاندی سمجھ نہ آوے
عشق کا مینوں روگ ادہ لگیا جنہوں کوئی نہ پاوے
حالِ غم میرا کوئی کیا جانے

جو جو ساڈے دل پر گذرے رب جانڑے یا دل
کاسوں آنکھاں حال میں اپنا کہنا ہے مشکل
حالِ غم میرا کوئی کیا جانے

اپنی اپنی لوکاں کہندے مینڈی سنے نہ بات
جو جو مجھ پر بیتے ہے سو مونہہ تھیں کہے نجات
حالِ غم میرا کوئی کیا جانے

(کلیاتِ ظفر، ص: ۳۸۷)

اضافات کی تکرار:

۴۔ چوتھی خرابی پادری صاحب نے یہ لکھی ہے:

''لگا تار اضافتوں کی مثال: ﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ﴾ [مریم: ۲]
(ص:٦٦)

برہان:

اس کا جواب بھی صاحب ''مطول'' نے یہی دیا ہے:

''لأن كلا من كثرة التكرار وتتابع الإضافات إن ثقل اللفظ بسببه على اللسان فقد حصل الاحتراز عنه بالتنافر وإلا فلا يخل بالفصاحة... الخ.''[1]

---

[1] المطول على التلخيص (ص: ۲۳)

یعنی کثرتِ اضافات ہر حال میں مخل نہیں بلکہ جب ان کی وجہ سے ثقل پیدا ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی مناظرے میں کسی فریق کی غلطی سے بدمزگی ہو جائے تو ایک ثالث جس نے یہی مناظرہ دیکھا ہو یہ کہے گا کہ مناظرہ موجب فساد ہے، لیکن جو لوگ مناظرات سے خوب واقف ہوں گے وہ کہیں گے کہ مناظرہ میں بدمزگی لازمی نہیں عارضی ہے، جہاں ہو وہاں کا مناظرہ اچھا نہ ہوگا، عام مناظرے بُرے نہیں۔ اسی طرح جہاں کلام میں جس وجہ سے بھی ثقل پیدا ہو وہ مخل فصاحت ہے۔ جیسے آپ نے خود مثال نقل کی ہے: "لیس قرب قبر حرب قبر" حالانکہ قرب فصیح قبر فصیح حرب فصیح۔ مگر مل کر ثقیل ہونے سے غیر فصیح ہو گئے۔

قرآن سے جو مثال ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ﴾ آپ نے پیش کی ہے، آپ ہی انصاف فرمائیں اس میں کچھ ثقل ہے؟

پادری صاحب! قرآن مجید کی پیش کردہ آیت میں تین اضافتیں ہیں:

ذکر ① رحمۃ۔ ② رب۔ ③ ک۔ اسی کے برابر ہم ایک مسلّمہ فصیح کتاب ''گلستاں'' میں آپ کو دکھاتے ہیں۔ غور سے سنیے!

''بلوغ در حقیقت یک نشان دارد وبس آنکہ در رضائے خدائے عزوجل بیش ازاں باشی کہ در بندِ'' ① حظِّ۔ ② نفسِ۔ ③ خویش۔'' (باب:۷)[1]

فرمایئے! گلستاں بھی غیر فصیح ہے؟ غالبًا اپنی مادری زبان (فارسی) کا تو لحاظ ضرور ہی کریں گے!!

قرآن میں تعقید کا اعتراض:

۵۔ پانچویں خرابی آپ نے یہ بتائی ہے:

''تعقید کی مثال خود یہی آیت زیر تفسیر ہے یعنی ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ

---

[1] حقیقت میں پہنچنے کا ایک ہی نشان ہے جو خدا کی رضا میں ہے جلدی کر اس سے پہلے کہ در بند ہو جائے۔

مِّثْلِهٖ﴾ اس آیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ قرآن کے کس امر کی مثل لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے؟ چنانچہ اتقان والی عبارت سے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علما نے بہت کوشش کی ہے تا کہ اس امر کو دریافت کریں کہ کس امر میں مثل لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس امر میں کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ جس کسی نے جو کچھ کہا ہے اپنے خیال اور قیاس پر کہا۔ اس آیت سے کسی کے قول کی تائید اور تصدیق نہیں ہوتی۔'' (ص:٦٦)

برہان:

اس کا جواب ہم پہلے بتا آئے ہیں اور مزید بتاتے ہیں کہ مثلیت مطلوبہ مبہم ہوتی تو سوال کرنا اہل عرب کا حق تھا۔ اسی لیے امام فن معانی شیخ عبد القاہر جرجانی فرماتے ہیں:

''أیجوز أن یکون تعالیٰ قد أمر نبیهﷺ بأن یتحدی العرب إلی أن یعارضوا القرآن بمثله من غیر أن یکونوا قد عرفوا الوصف الذي إذا أتوا بکلام علی ذلك الوصف کانوا قد أتوا بمثله؟ ولا بد من ''لا'' لأنهم إن قالوا: ''یجوز'' أبطلوا التحدي من حیث أن التحدي، کما لا یخفی، مطالبة بأن یأتوا بکلام علی وصف، ولا تصح المطالبة بالإتیان به علی وصف من غیر أن یکون ذلك الوصف معلوما للمطالَب، ویبطل بذلك دعوی الإعجاز أیضا. وذلك لأنه لا یتصور أن یقال إنه کان عجز حتیٰ یثبت معجوز عنه معلوم، فلا یقوم في عقل عاقل أن یقول لخصم له: قد أعجزك أن تفعل

مثل فعلي. وهو لا يشير له إلى وصف يعلمه في فعله، ويراه قد وقع عليه، أفلا ترى أنه لو قال رجل لآخر: إني قد أحدثت في خاتم عملته صنعة أنت لا تستطيع مثلها. لم تتجه له عليه حجة، ولم يثبت به أنه قد أتى بما يعجزه إلا من بعد أن يريه الخاتم و يشير له إلى ما زعم أنه أبدعه فيه من الصنعة لأنه لا يصح وصف الإنسان بأنه قد عجز عن شيء حتى يريد ذلك الشيء ويقصد إليه ثم لا يتأتى له، وليس يتصور أن يقصد إلى شيء لا يعلمه وأن تكون منه إرادة لأمر لم يعلمه في جملة و لا تفصيل"[1] (دلائل الإعجاز، ص: ٢٩٤، ٢٩٥)

مذکورہ عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''کیا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا اپنے نبی کو حکم دے کہ اہل عرب کو قرآن کی مثل لانے کا چیلنج دیں، حالانکہ مخاطبوں کو اس کلام کا وہ وصف معلوم نہ ہو جس میں ان کا کلام کلامِ نبی کے مشابہ ہو۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر کہنے والے کہیں کہ بغیر وصف مطلوب معلوم نہ ہونے کے بھی چیلنج جائز ہے تو اس صورت میں اُنھوں نے تحدی کو خود ہی باطل کردیا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ تحدی اُس مطالبہ کا نام ہے کہ کلام کی مثل لاؤ۔ اور مطالبہ بغیر اس کے صحیح نہیں ہوسکتا کہ جس وصف میں کلام مثل چاہا گیا ہو وہ وصف مخاطب کو معلوم ہو۔ اور بغیر وصف معلوم کرنے کے اعجاز کا دعویٰ بھی باطل ہوجاتا ہے، اس لیے کہ ممکن نہ ہوگا کہ درصورت عجز مخاطب کے کہا جائے کہ وہ مقابلے سے عاجز آگیا جب تک کہ وہ وصف مطلوب معلوم نہ ہو۔ یہ بات کسی عاقل کی عقل میں

[1] دلائل الإعجاز (ص: ٣٨٥) تحقيق محمود محمد شاكر، طبعة مكتبة الخانجي بالقاهرة.

نہیں آسکتی کہ اپنے مخالف کو کہے میں اپنے جیسا کام کرنے سے تجھے عاجز کردوں گا حالانکہ وہ اپنے کام کا وہ وصف نہیں بتاتا جس کو مخالف جانتا ہو اور سمجھتا ہو کہ فعل واقعی اس وصف پر ہوا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی شخص اگر کسی کو کہے میں نے انگوٹھی میں ایک ایسی صنعت کی ہے تو اس جیسی نہیں کرسکتا تو اس کا کمال ثابت نہ ہوگا جب تک وہ اس کو انگوٹھی دکھا کر اپنی صنعت کی طرف اشارہ کر کے نہ دکھادے۔ کیونکہ یہ صحیح نہیں ہوسکتا کہ کسی انسان کے حق میں کہا جائے کہ وہ فلاں کام کرنے سے عاجز آگیا ہے جب تک کہ وہ اس کام کا قصد کرے اور نہ کر سکے۔ اور ایسی صورت تحدی غیر معلوم الوصف میں نہیں ہوسکتی ۔ نہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ایسے امر کا ارادہ کرے جسے نہ مجمل جانتا ہو نہ مفصل۔" (ص:۱۹۴، ۱۹۵)

پادری صاحب کو شاعروں کی اصطلاح معلوم ہوگی جو کہا کرتے ہیں: "فلاں قصیدہ فلاں کا جواب ہے۔" اس سے اُن کی مراد نہ واقعات صحیحہ ہوتے ہیں نہ اخلاقی یا مذہبی تعلیم کا مقابلہ۔ بلکہ محض اسلوب کلام میں مقابلہ ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی بھی کسی نظم ونثر میں تحدی (چیلنج) کی جائے تو مخاطب کو متکلم کی مراد سمجھنے میں دقت نہیں۔

دوسرا پہلو:

پادری صاحب نے اس آیت پر ایک اور طرح سے بھی اعتراض کیا ہے وہ بھی ہماری اس تقریر سے رفع ہوگیا۔ وہ اعتراض یہ ہے:

"اس آیت میں دوسرا عیب یہ ہے کہ یہ بات صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی کہ کس کی مثل کا مطالبہ ہے۔ آیا قرآن شریف کی مثل کا یا آنحضرت ﷺ کی مثل کا۔ کیونکہ ﴿مِثْلِهٖ﴾ میں جو ضمیر ہے وہ قرآن اور آنحضرت ﷺ دونوں کی طرف راجع ہوسکتی ہے۔" (ص:٦٦)

برہان:

بے شک بعض مفسروں نے احتمال پیدا کیا ہے کہ ﴿مِنْ مِّثْلِهٖ﴾ میں ضمیر مجرور آنحضرت ﷺ کی طرف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت سے پہلی آیات کو زیرِ نظر رکھا جائے تو یہ احتمال پیدا نہیں ہوسکتا۔ ہم ان آیات کو ترتیب نزول سے یہاں لکھتے ہیں:

① ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ [الإسراء: ٨٨]

ذیل کی آیت میں مثل کو قرآن کی طرف صاف الفاظ میں مضاف کرکے دس آیات مثل قرآن طلب کی ہیں:

② ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [هود: ١٣]

③ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ [يونس: ٣٨]

④ ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ [البقرة: ٢٣]

پہلی اور دوسری تحدی میں مثل کو قرآن کی طرف اضافت کیا۔ تیسری میں بھی، جو دراصل آخری تحدی ہے، مثل کو قرآن کی طرف مضاف کیا۔ چوتھی تحدی تیسری کی تشریح میں آئی ہے اس میں مثل پر حرف ﴿مِنْ﴾ بڑھایا گیا ہے۔ جو فی نفسہ گو ذواحتمالین ہے مگر پہلی شہادتوں کے ساتھ اس کا دوسرا احتمال جاتا رہا۔ اس لیے آیت بذاتہا اور بقراء تہا اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہے۔

انجیل کی مثال:

مناسب ہے کہ ہم پادری صاحب کو ایک دو مثالیں انجیل سے بتادیں تاکہ مضمون اچھی طرح ان کی اور ان کے ناظرین کی سمجھ میں آجائے۔ امید ہے پادری صاحب غور سے سنیں گے۔

1 ''ابتدا میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ (شروع انجیل یوحنا)

2 ''ہم خدا کے فرزند ہیں۔ اور فرزند ہوئے تو وارث بھی یعنی خدا کے وارث اور میراث میں مسیح کے شریک۔'' (رومیون ۸: ۱۸)

دونوں حوالے اہم مسائل (الہیات) کے متعلق ہیں مگر کیا کوئی پادری، ہاں اہل علم اور با انصاف پادری، ہمیں ان کا مضمون خود ان حوالوں کے الفاظ سے بتا سکتا ہے؟ ہم اپنے معزز مخاطب کو زیادہ تکلیف نہیں دیتے، پہلے حوالے کی بابت اتنا بتادیں کہ کلام کا خدا کے ساتھ ہونے سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں۔ اور کلام خدا تھا'' سے وحدت پائی جاتی ہے۔ پھر ''یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا'' سے دوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو صریح اجتماع ضدین ہے۔

دوسرے حوالے میں ''ہم خدا کے فرزند۔ مسیح کی طرح وارث۔'' اس کا کیا مطلب؟ کیا مسیح خدا کا اکلوتا بیٹا نہیں؟ وراثت کے کیا معنی؟

ناظرین! یہ دو مقام معمولی نہیں بلکہ عیسائی مذہب کے بنیادی پتھر ہیں۔ جب بنیادی پتھر ہی سیدھا اور ٹھیک نہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج [1]

---

[1] اگر معمار پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دے تو تا ثریا دیوار ٹیڑھی ہی جائے گی۔

پادری صاحب کی کمال ہوشیاری:

یہ تو ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ پادری صاحب علماءِ اسلام کی فراخ حوصلگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیسے؟ اس طرح کہ علماء اسلام نے اپنی تصانیف میں ملحدین کے اعتراضات نقل کر کے جواب دیے ہیں۔ پادری صاحب وہ اعتراضات تو نقل کر دیتے ہیں مگر جواب نقل نہیں کرتے۔ ہاں ہمارے ٹوکنے پر اب سرخروئی کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔

علم کلام کی کتاب ''شرح مواقف'' سے ملحدین کے چند اعتراض نقل کیے ہیں۔ چونکہ ہم نے ایک دو مرتبہ اس پر ٹوکا ہے کہ آپ جہاں سے اعتراض نقل کرتے ہیں وہاں ہی ان کے جواب بھی ہوتے ہیں، وہ کیوں اپنے ناظرین تک نہیں پہنچاتے؟ شاید اس ٹوکنے کا یہ اثر ہوا کہ ''شرح مواقف'' کے اعتراجات نقل کر کے آپ نے بمشکل اتنا لکھا ہے:

> ''شرح مواقف'' میں ان سوالات کے جوابات بھی مذکور ہیں لیکن وہ اس قدر کمزور ہیں کہ ان کے نقل کرنے سے بجز اس کے کہ کتاب کا حجم بڑھ جائے اور کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ تاہم میں اپنی تفسیر پڑھنے والوں سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ اصل کتاب میں ان سوالوں کے جوابوں کو بھی ضرور پڑھیں۔'' (ص:۷۲)

برہان:

ہم پادری صاحب کے بے حد مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنے اُردو خوان ناظرین کو عربی کی مشکل کتاب (شرح مواقف) پڑھنے کا مشورہ دیا۔ مرحبا ؎

ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند [1]

لیکن پادری صاحب کیا آپ از راہ انصاف بتا سکتے ہیں کہ آپ کی تفسیر کے

[1] یہ کام تم ہی کر سکتے ہو، مرد ایسے ہی کرتے ہیں!!

ناظرین میں سے کتنے لوگوں کے پاس شرح مواقف ہے اور کتنے ایسے ہیں جو ''شرح مواقف'' (عربی کتاب) کو پڑھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں؟ ہاں ایسا مشورہ اس صورت میں قدرے وزن رکھتا جس صورت میں کتاب مذکور اُردو میں ہوتی یا آپ اتنے حصہ کا اُردو ترجمہ ساتھ لگا دیتے۔ کیا ایسی بھول بُھلیاں پرانے تجربہ کار مصنفوں سے مخفی رہ سکتی ہیں؟

ہم نظر بازوں سے تو چھپ نہ سکا جان جہاں
تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا

چونکہ ''شرح مواقف'' کے جوابات پادری صاحب کو پسند نہیں اس لیے ہم بھی وہ جواب پیش نہیں کرتے بلکہ از خود جواب دیں گے۔ پادری صاحب نے جو شرح مواقف سے ملحدین کے اعتراضات نقل کیے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اعتراض اول:

''یہ کہ وجہ اعجاز نہایت واضح ہونی چاہیے تاکہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے تاکہ دلیل پیش کرنے والا اس کو بطور دلیل کے پیش کر سکے۔ اس کی وجہ اعجاز میں تمھارے اختلاف کا ہونا کہ وجہ اعجاز کیا ہے؟ وجہ اعجاز کے مخفی ہونے کی دلیل ہے۔ پس کس طرح ایک پوشیدہ امر سے اس کے معجزہ ہونے پر دلیل پیش کی جاسکتی ہے؟'' (ص:٦٩)

جواب نمبر ①:

ہم بتا آئے ہیں اور دلائل الاعجاز سے ثبوت دے آئے ہیں کہ قرآن کی وجہ اعجاز بالکل ظاہر بلکہ بدیہی ہے۔ اختلاف بدیہیات میں بھی ہو جاتا ہے۔ کیا خدا کی ہستی کے برابر بھی کوئی بدیہی امر ہے؟ پھر کیا ہستی الٰہی کے ماننے پر سب لوگ متفق ہیں؟ ہرگز نہیں۔ معلوم ہوا کہ ظاہر، باہر ہونے سے اختلاف معدوم ہونا ضروری نہیں۔

دوسرا اعتراض:

''یہ ہے کہ اعجاز کی جو وجوہ تم بیان کرتے ہو اس میں تو صلاحیتِ اعجاز ہی نہیں۔ اگر نظم غریب کا خیال کیا جائے تو یہ آسان امر ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ ایک بار سن کر اس کے طرز سے واقف ہو جائے۔ پس اس کی عجیب وغریب نظم موجب اعجاز نہیں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسیلمہ کی حماقتیں اسی ڈھنگ کی ہیں۔ اگر بلاغت کا خیال کیا جائے تو وزن اور نظم مخصوصہ سے قطع نظر کر کے ہم کسی بلیغ ترین خطبہ یا قصیدہ سے قرآن کی کسی ایسی چھوٹی سورت کو جس کو تم تحدی کے لیے موزوں سمجھتے ہو اور آیت ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ کے تحت میں سمجھتے ہو مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو ان دونوں کے درمیان کوئی بین فرق معلوم نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثر غیر قرآن جملے قرآنی جملوں سے فصیح تر معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ معجزہ کے لیے لازم ہے کہ فرق ایسا بین ہو کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش تک باقی نہ رہے تاکہ مدعیٔ معجزہ کے صدق پر وثوق کے ساتھ یقین ہو جائے۔ نیز قرآن کی بعض سورتوں کے متعلق کہ آیا وہ قرآن میں سے ہیں یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے درمیان اختلاف تھا۔ حتیٰ کہ عبداللہ ابن مسعود سورہ فاتحہ و معوذتین کو جو قرآن کی بہت مشہور سورتوں میں سے ہیں قرآن کے جز نہیں مانتے تھے۔ پس اگر ان سورتوں کی فصاحت و بلاغت اعجاز کی حد تک پہنچی ہوئی ہوتیں تو وہ غیر قرآن سے علیحدہ پہچانی جاتیں اور ان میں یہ اختلاف نہ ہوتا کہ وہ قرآن میں سے ہیں یا نہیں ہیں۔''

(ص:۶۹،۷۰)

جواب نمبر ②:

ہر کسی معترض کے اعتراض کو نقل کر دینا کچھ مفید کام نہیں بلکہ اُس کا وزن بھی کرنا چاہیے۔ ورنہ "بائبل کے مضامین متناقضہ" مصنفہ مسٹر بریڈ لا (دہریہ فرنگی) سے ہم بھی بہت کچھ نقل کر سکتے ہیں۔ بھلا یہ آپ کا منقولہ اعتراض کیا وزن رکھتا ہے جب کہ قرآن بلند آواز سے مخاطبوں کو للکارتا رہا اور وہ سن کر اپنی مستعدی ظاہر کرتے رہے اور کہتے رہے:

﴿لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾

[الأنفال: ٣١]

"ہم چاہیں تو اس جیسا بنالیں یہ تو صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔"

پہلے جواب میں اور اس سے پہلے بھی ہم مفصل بتا چکے ہیں کہ وجہ تحدی اسلوب کلام ہے اور بس۔

اب تک فصاحتِ قرآن پر بحث چلی آ رہی ہے، قرآن کے مثل لانے پر عرب کی آمادگی کا ذکر ہوا ہے، اس کے بعد ملاحظہ ہو۔

سورت سے کیا مراد ہے؟

نوٹ: اس اعتراض میں سورۃ کا لفظ آیا ہے۔ غالباً اصل معترض اور نقال نے بھی تحقیق نہیں کیا ہوگا کہ مقام تحدی میں سورۃ سے کیا مراد ہے؟ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سورۃ سے مراد اتنا ٹکڑا ہے جس کو ایک خطبہ، لیکچر یا باصطلاح تعلیم جواب مضمون کہتے ہیں۔ قرآنی سورتوں کو سورۃ کہنا الگ اصطلاح ہے اور سورۃ متحدیہ الگ اصطلاح ہے۔ فافهم فإنه دقيق۔ پس کسی ایک آدھ جملے کا ذکر کرنا اصل مبحث سے دور ہے۔

سورت فاتحہ وغیرہا کا قرآن سے ہونا اور ان غیر قائلین کا اپنے خیال سے رجوع کرنا ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں۔[1] فانظر هناك

[1] دیکھیں: (ص: ٨١)

تیسرا اعتراض:

’’یہ ہے کہ قرآن کو جمع کرتے وقت جب کوئی شخص قرآن کا کوئی حصہ لے کر آتا اور اگر وہ عدالت میں مشہور نہ ہوتا تو اس وقت تک اس حصہ کو قرآن میں شامل نہ کرتے جب تک اس شخص سے گواہی اور قسم نہ لی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر قرآن کی بلاغت حد اعجاز تک پہنچی ہوئی ہوتی تو بلا تکلف اس کو پہچان لیتے اور اس کو قرآن میں شامل کرنے کے لیے کسی کی گواہی اور قسم کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔‘‘ (ص: ۷۰)

جواب نمبر ③:

قانون معدلت ہے کہ حاکم اپنے علم اور رؤیت کو فیصلے میں دخل نہ دے بلکہ شہادت کی بنا پر فیصلہ کرے۔ نیز قانونِ شہادت میں نصابِ شہادت صرف دو اشخاص کو رکھا ہے۔ با ایں ہمہ دو گواہوں سے زیادہ اہم معاملات میں سیکڑوں تک عدد شہادت پہنچتا ہے۔ یہ سب احتیاط ہے۔ کمیشن قرآن کی کارروائی احتیاط پر مبنی تھی ورنہ قرآن تو خود ممبران کمیشن کو بھی یاد تھا۔ فاندفع ما أورد

چوتھا اعتراض:

’’یہ ہے کہ جو امور صنعت کے متعلق ہوتے ہیں ان کے کمال کے مراتب ہوتے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر اور اس کی کوئی ایسی حد مقرر نہیں کی جاسکتی جس سے آگے بڑھنا ناممکن ہو۔ پس ہر زمانہ کے لیے لازم ہے کہ کوئی شخص کسی خاص صنعت میں اپنے ابنائے زمانہ سے بڑھ جائے اور ایسے مرتبہ پر پہنچ جائے جس تک کوئی اور شخص نہ پہنچ سکے۔ پس یہی کہا جائے گا کہ شاید محمد علیہ السلام اپنے زمانہ میں سب سے فصیح تر تھے اور ان کے کلام

سے ان کے زمانہ کے لوگ عاجز تھے۔ پس اگر یہی معجزہ ہے تو ہر ایک وہ شخص جو اپنے زمانہ میں اپنی صنعت کے لحاظ سے ممتاز ہو اس قسم کا معجزہ پیش کرسکتا ہے۔ اور اس قسم کے معجزہ کا باطل ہونا ظاہر ہے۔'' (ص: ۷۰)

جواب نمبر ④:

اس اعتراض میں منکرین عرب کا عجز تو تسلیم کیا گیا۔ رہا یہ امر کہ ہر ترقی یافتہ پیش کرسکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بغیر الہامی تائید کے ایسا ابدی دعوے نہیں کرسکتا۔ جیسا قرآن نے کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ غور سے سنیے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ﴾ [البقرة: ٢٤]

''ہرگز مقابلہ نہ کروگے۔ پس جہنم کی آگ سے بچ جاؤ۔''

ایک اور پہلو سے اعتراض:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اختلاف اور تناقض کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ معجزہ ہے، یہ بھی غلط ہے کیونکہ:

① اس میں تناقض بھی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ ''ہم نے آنحضرت کو شعر نہیں سکھایا۔'' حالانکہ قرآن میں شعر بھی ہے۔ مثلاً

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: ۲، ۳]

اگر اس آیت سے لفظ ﴿مَخْرَجًا﴾ کو علیحدہ کیا جائے تو بحر متقارب میں سے پورا شعر بن جائے گا جس کا وزن یہ ہوگا: ''فعولن فعولن فعولن فعل۔

اور قرآن کی یہ آیت بھی پورا مصرعہ ہے:

﴿وَ اُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ [الأعراف: ١٨٣]

نیز یہ آیت:

﴿ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [التوبة: ١٤]

"اگر اس آیت میں ﴿يُخْزِهِمْ﴾ کے میم کے زیر کو اور مومنین کے نون کے زبر کو کھینچ کر پڑھا جائے تو بلاشبہ موزوں شعر ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیتوں میں ذرہ تغیر کرنے سے بہت سے اشعار نکل آئیں گے۔" (ص: ۷۰، ۷۱)

جواب نمبر ①:

اس قسم کے اعتراضات سے سوامی دیانند کے اعتراضات بھی مات ہو گئے۔ ناظرین غور کریں کہ اصل معترض ملحد کی بے سمجھی کہاں تک ترقی کر گئی ہے کہ وہ کھینچ تان کر بھی قرآن شریف کو شعر نہ بنا سکا۔ کمی بیشی کر کے بمشکل ایک مصرعہ بنا۔ معترض نے تو تصرف بے جا کر کے کہیں ایک آدھ مصرعہ بنایا۔ ہم اسے مکمل مصرعہ قرآن میں دکھاتے ہیں۔

فردوسی کو بادشاہ نے کہا تھا کہ شاہنامہ فارسی زبان میں لکھو جس میں عربی لفظ نہ آئے، فردوسی نے لکھ کر پیش کیا تو اس میں ایک شعر آنحضرت ﷺ کے معراج شریف کے ذکر میں تھا۔

چناں سبوحیاں گردوں صلادہ
کہ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ[1]

(سورۃ الاسراء:۱)

بادشاہ نے کہا اُس میں تو دوسرا مصرعہ پورا عربی ہے۔ فردوسی نے کہا یہ میرا

[1] اسی طرح آسمان سے فرشتے نے صدا دی کہ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾

کلام نہیں بلکہ سبوحی (ملائکہ) نے ایسا کہا تھا۔ میں نے تو ان کا کلام نقل کیا ہے۔ پس ایک جواب تو یہی ہے کہ باوجود معترض اور ناقل کی صد کوشش کے پورا شعر جس کو بیت کہتے ہیں ایک بھی نہیں بنا۔ ہاں کچھ کم و بیش کر کے ایک مصرعہ بنا جو شعر نہیں۔ اصل جواب جو فردوسی کے قصہ سے ماخوذ ہے یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ دراصل خدا کے ہیں آنحضرت کے نہیں۔ اور قرآن مجید کی آیت زیر بحث میں آنحضرت کی شعر گوئی کی نفی ہے خدا کی صفت (شعر گوئی) کی نفی نہیں۔ یعنی آیت میں یہ ذکر نہیں کہ خدا کو شعر کہنا نہیں آتا۔ خدا کو تو ہر قسم کے علوم حاصل ہیں بلکہ دنیا میں جتنے علوم مروج ہیں سب خدا کی تعلیم سے ہیں۔ غور سے سنیے!

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ [البقرة: ۲۵۵]

''دنیا کے لوگ کچھ نہیں جان سکتے مگر وہی جو خدا چاہے۔''

پس اصل معترض اور ناقل کو لازم ہے کہ آیت موصوفہ پر غور کر کے اپنے اعتراض کو واپس لیں۔

اعتراض (ب)

قرآن میں جھوٹ بھی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ ہم نے قرآن میں کسی بات کے متعلق تفریط سے کام نہیں لیا ہے، اور دوسری جگہ لکھا ہوا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو ہم نے قرآن میں بیان نہ کیا ہو۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر تک قرآن میں نہیں ہے۔ مثلا مسائل اصولیہ، طبعیہ، ریاضیہ، طبیہ اور حوادث یومیہ کا ذکر قرآن میں واقع نہیں ہے۔ پس قرآن نے جس بات کا دعویٰ کیا ہے وہ مطابق واقع نہیں ہے۔'' (ص:۱۷)

جواب (ب)

خدا تعصب کا بُرا کرے، کیسی کیسی بیجا حرکتیں کراتا ہے، پادری صاحب نے بالفاظ ملحدین جن الفاظ کا ترجمہ کر کے قرآن کے ذمہ لگایا ہے وہ الفاظ مع سیاق وسباق کے یوں ہیں:

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ﴾ [الأنعام: ٣٨]

اس جگہ ﴿الْكِتٰبِ﴾ سے مراد لوح محفوظ ہے۔ چنانچہ تفسیر جلالین وغیرہ میں بھی یہی لکھا ہے: ﴿فِي الْكِتٰبِ﴾: "اللوح المحفوظ"[1]

پس ترجمہ آیت کا یہ ہے:

"زمین پر جو چلنے والے یا اُڑنے والے جانور ہیں یہ سب تمہاری طرح انواع ہیں ان سب کا شمار ہمیں (خدا کو) معلوم ہے۔ ہم نے کتاب (لوح محفوظ) میں کوئی کمی نہیں رکھی۔"

دوسری آیت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الأنعام: ٥٩]

تفسیر جلالین وغیرہ میں یہاں بھی لوح محفوظ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔[2] مگر ہماری

---

[1] تفسير الجلالين (ص: ١٦٨)

[2] تفسير الجلالين (ص: ١٧١)

تحقیق یہ ہے کہ یہاں کتاب مبین سے مراد علم باری تعالیٰ ہے۔ کیونکہ آیت کے سیاق وسباق میں علم الٰہی کا ذکر ہے۔ پس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

"خدا ہی کے پاس غیب کے خزانے ہیں ان کو وہی جانتا ہے۔ اور وہ (خدا) جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی پر ہے اور جو دریاؤں میں ہے، جو کوئی پتہ گرتا ہے خدا اسے جانتا ہے کوئی دانہ بھی اندھیری زمین میں ہو کوئی تر ہو یا خشک سب کچھ کتاب مبین (لوح محفوظ میں مرقوم یا علم باری تعالیٰ) میں درج ہے۔"

پس ان آیات میں کتاب مبین سے مراد قرآن مجید لینا ملحد معترض کا الحاد اور ناقل کی بے پروائی اور ناانصافی ہے۔

علاوہ اس کے آیئے ہم آپ کی خاطر مانے لیتے ہیں کہ کتاب مبین سے مراد یہاں قرآن مجید ہے تاہم اعتراض نہیں۔ مگر اس کے سمجھنے کو ایک اصول کلام سمجھنا چاہیے۔ وہ یہ ہے۔

ہر مصنف اپنی تصنیف میں ایک ہی علم کے مسائل لکھتا ہے، اسے دوسرے فن سے مطلب نہیں ہوتا۔ مثلاً کافیہ جو علم نحو کی ایک مستند کتاب ہے اس کو جامع کتاب کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں علم نحو کے ضروری مسائل سب لکھے گئے ہیں۔ لیکن منطق کا ایک مسئلہ بھی اس میں مذکور نہیں۔ تو کیا "کافیہ" کا منطق سے خالی ہونا اس کی جامعیت کے خلاف ہے؟ آپ کے سوا کوئی کہے گا؟ ٹھیک اسی طرح قرآن ایک دینی کتاب ہے اس میں دینی مسائل مذکور ہوں گے۔ ان ہی کے لحاظ سے وہ جامع کتاب ہے۔ اس میں طبعیات یا فلکیات یا طبیات کا مذکور نہ ہونا اسے جامعیت سے گرا نہیں سکتا۔ ایسا کہنا ملحدوں کے منہ سے تو تعجب نہیں مگر ایک مذہبی ماہر کے قلم سے نکلنا سخت تعجب خیز ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہی بلکہ اس سے زیادہ زور دار لفظ

تورات کے لیے آئے ہیں:

﴿ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [الأعراف: ١٤٥]

''ہم نے حضرت موسیٰ کے لیے الواح میں ہر قسم کی نصیحت اور سب چیزوں کی تفصیل لکھ دی ہے۔''

اعتراض (ج)

اس کے آگے وہی ملحدانہ سوال ملا لیجیے جو کسی ملحد سے قرآن پر آپ نے نقل کیا ہے:

''ج۔ قرآن میں غلطی کے ہونے اور نہ ہونے کا بھی اختلاف ہے۔ مثلاً ﴿اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ میں نحوی غلطی ہے۔ اور جب حضرت عثمان کے پاس قرآن کو مرتب کر کے پیش کیا گیا تو آپ نے کہا کہ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں لیکن عرب ان کو اپنی زبان سے درست کریں گے۔'' (ص:۷۱)

جواب (ج)

اس اعتراض کو نقل کرنے سے ہمیں رنج کے ساتھ مسرت بھی ہوئی۔ رنج تو اس بات کا ہوا کہ پادری سلطان محمد خان صاحب کے حق میں ہم کو تو نیک گمان ہیں کہ آپ عربی جانتے ہیں مگر قادیان سے آواز اُٹھی تھی کہ ''پادری سلطان محمد مرتد کو عربی میں بالکل معمولی لیاقت حاصل ہے۔'' (الفضل ۱۵/اگست ۳۱ء، ص: ۵)

ہم آج تک اس (قادیانی) رائے کو مخالفانہ رائے جانتے ہیں۔ خطرہ ہے کہ اہل قادیان پادری صاحب کے اس اعتراض کو دیکھ کر اپنے خیال پر اڑ نہ جائیں، یہ تو ہے وجہ رنج۔ مسرّت کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں خدا نے کئی ایک مقامات پر قرآن میں غور وفکر اور تدبر وتفکر کرنے کا حکم دیا ہے اور تدبر کرنے کے بغیر نکتہ چینی کرنے والوں کے حق میں جو فرمایا ہے وہ قرآن کے الفاظ میں ہم سُنا دیتے ہیں:

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْاٰنَ أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ أَقْفَالُهَا ﴾ [محمد: ٢٤]

''کیا یہ منکر لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر غفلت کے تالے لگ چکے ہیں؟''

ہم نے جب سے سوامی دیانند کی ''ستیارتھ پرکارش'' کا جواب ''حق پرکاش'' اور مہاشہ دھرمپال کے ''ترک اسلام'' کا جواب ''ترک اسلام'' اور مہاشہ راجپال کی کتاب ''رنگیلہ رسول'' کا جواب ''مقدس رسول'' اور مہاشہ دھرم بھکشو کی کتاب کا جواب ''کتاب الرحمٰن'' وغیرہ لکھا ہے اس وقت سے اب تک ہم نے اس آیت کا جلوئی مختلف شکلوں میں پایا ہے۔ افسوس ہے کہ آج ہم اپنے عزیز برادر پادری سلطان محمد خان کے قلم سے بھی ایسے اعتراض سنتے ہیں جن کو سن کر ہمیں بلحاظ تصدیق قرآن مسرّت ہوتی ہے۔

سنیے! ہم یہ نہیں کہتے کہ پادری صاحب نے علم نحو میں ''کافیہ'' نہیں پڑھا ہوگا۔ ضرور پڑھا ہوگا مگر قرآن پر اعتراض کرنے کے وقت کافیہ کیا ہر ایک فن سے ذہول ہو جانا لازمی ہے۔ جیسے عشق میں جنوں!

کافیہ میں ''اِنَّ'' کی بحث میں لکھا ہے:

''تخفف المكسورة فتلزمها اللام، ويجوز إلغاؤها''[1]

یعنی ''اِنَّ'' (مکسورہ) مخفف کیا جاتا ہے تو اس کی خبر میں لام کا آنا ضروری ہے اور اس کو بے عمل کر دینا جائز ہے۔

پادری صاحب! اس قانون کے مطابق ﴿إِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ بالکل صحیح ہے۔ پس قرآن آپ کو مخاطب کر کے بڑے نرم لہجہ میں کہتا ہے ؎

میرے دل کو دیکھ کر میری وفا کو دیکھ کر
بندہ پرور! منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر

[1] شرح الرضي على الكافية (٤/ ٣٤٠)

پادری صاحب مرزا صاحب قادیانی کی گود میں:

ہم حیران تھے کہ پادری صاحب نے ایسا اعتراض کر کے قادیانیوں کے خیال کی تائید کیوں کی جنھوں نے شائع کیا تھا کہ پادری سلطان محمد خان کو عربی میں لیاقت نہیں؟ دیکھتے دیکھتے معلوم ہوا کہ ایسا کرنے میں مرزا صاحب قادیانی ان کو محرک ہوئے ہیں۔ ناظرین حیران ہو کر کہیں گے ایں چہ؟ اس لیے ہم اصل حقیقت بتاتے ہیں۔ پادری صاحب نے مرزا صاحب کو بطور گواہ پیش کیا ہے مگر پیش کرنے سے پہلے ان کی عزت اور قدر بھی ظاہر کردی ہے جو شاید ہم نہ کرتے۔ چنانچہ پادری صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"اگرچہ مسلمانوں کے نزدیک مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی قدر و قیمت دمڑی کے برابر بھی نہیں۔ لیکن خود ان کے مریدوں کے نزدیک مرزا صاحب کی منزلت آنحضرت سے بوجوہ چند بڑھ کر ہے۔ اس لیے قرآن کی فصاحت و بلاغت کے متعلق ان کے قول کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ خدائے تعالیٰ انسانی محاورات کا پابند نہیں ہوتا۔ یا کسی اور زمانہ کے متروکہ محاورات کو اختیار کرتا ہے، اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ بعض جگہ انسانی گرامر یعنی صرف ونحو کے ماتحت نہیں چلتا۔ اس کی نظیریں قرآن میں بہت پائی جاتی ہیں مثلاً یہ آیت ﴿اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ انسانی نحو کی رو سے "إن هٰذين" چاہیے۔"

(حقیقۃ الوحی، ص: ۳۰۴ کا حاشیہ، سلطان التفاسیر، ص: ۷۴)

اصل حقیقت:

مرزا صاحب کو ایک دفعہ انگریزی میں الہام ہوا جو شاید حسب محاورہ نہ تھا۔

اس پر انھوں نے یہ عذر کیا:

''چونکہ یہ غیر زبان میں الہام ہے اور الہام الٰہی میں ایک سرعت ہوتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ بعض الفاظ کے ادا کرنے میں کچھ فرق ہو۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ خدا تعالیٰ انسانی محاورات کا پابند نہیں ہوتا یا کسی اور زمانہ کے متروکہ محاورہ کو اختیار کرتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ بعض جگہ انسانی گریمر یعنی صرف ونحو کے ماتحت نہیں چلتا۔ اس کی نظیریں قرآن شریف میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ آیت ﴿اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ انسانی صرف ونحو میں ''ان ھذین'' چاہیے۔''

(حاشیہ حقیقۃ الوحی، ص:۳۰۴)

بس یہ قول مرزا صاحب کا پادری صاحب نے غنیمت جانا اور اسے عدم فصاحتِ قرآن کے دعوے پر پیش کردیا۔ آخر معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اپنے الہام کو داغ غلطی سے بچانے کے لیے قرآن شریف کو اس کے ہمرنگ بنا کر خوش ہوئے کہ ؎

ہمرنگ ہاتھ آیا اک مفلسی میں

امید ہے کہ ہمارا جواب سن کر پادری صاحب مرزا کو مخاطب کر کے کہتے ہونگے ؎

ساحری کرد و درچشمِ تو دگرنہ زیں پیش
بود ہشیار تر از تو دلِ دیوانۂ ما![1]

پس ہم پادری صاحب کی معرفت مرزا صاحب کو پہنچاتے ہیں کہ مرقومہ بالا قانون کافیہ میں پڑھیں تو ہم یقین کرتے ہیں کہ بے ساختہ ان کے منہ سے نکل جائے گا ؎

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم[2]

[1] تم جادوگری کرتے ہو اور تمھاری آنکھ میں یہ نہیں تھا، ہمارا دیوانہ دل تجھ سے زیادہ ہوشیار ہے!

[2] خود غلط تھے جو ہمیں نصیحت کرتے رہے۔

اعتراض (د)

قرآن میں تکرار لفظی بھی ہے جس سے کچھ فائدہ نہیں مثلاً سورۃ رحمٰن میں، اور تکرار معنوی بھی ہے مثلاً موسیٰ وعیسیٰ کا قصہ۔'' (ص:۱۷)

جواب (د):

سورۃ الرحمٰن پر بہت سے معترضوں نے اعتراض کیے ہیں جو درحقیقت زبان دانی سے بعید ہیں۔ شعراء کے محاورہ میں ایک صنعت خاص ''ترجیع بند'' ہوتی ہے۔ اس میں ایک مصرعہ یا جزء مصرعہ بار بار آتا ہے۔ اس کی دو تین مثالیں اہلحدیث ۹ رستمبر کے پرچے میں ہم بتا چکے ہیں۔[1] ان میں عربی مثال میں پورا مصرعہ مکرر آیا ہے۔ آج دو تین مثالیں اور بتاتے ہیں جن میں سے پہلی میں مصرعہ سالم نہیں بلکہ جزء مصرعہ مکرر لایا گیا ہے۔ پس دیکھئے!

أنا للعبد أرحم من أخيه
ومن أبويه فاطلبني تجدني
تجدني في سواد الليل عبدي
قريبا منك فاطلبني تجدني
تجدني في سجودك حين تدعو
وحين تقوم فاطلبني تجدني

(أمثال المفضل الضبي مطبوعه جوائب)

دہلی کا آخری بادشاہ (شاہ ظفر) کہتا ہے:

ستم کرتا ہے بے مہری سے کیا کیا آسماں پیہم
دل اس کے ہاتھ سے پُر درد ہے اور چشم ہے پُر نم

---

[1] دیکھیں: (ص: ۱۸۷)

کروں گا پر نہ شکوئی گرچہ ہوں گے لاکھ غم پر غم
کہے جاؤں گا میں ہر دم یہی جب تک ہے دم میں دم
خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

فلک کے ہاتھ سے کیا کیا مرا دل رنج سہتا ہے
کہ اک اشکوں کا دریا رات دن آنکھوں سے بہتا ہے
نہیں فرصت ذرہ غم سے اسی کے غم میں رہتا ہے
مگر تائید حق پر جب نظر کرتا ہے کہتا ہے
خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

غم و اندوہ سے حالت ہوئی ہے اس قدر میری
کہ ہوتا غم ہے غمگیں آپ صورت دیکھ کر میری
اگرچہ بارِ غم سے اب شکستہ ہے کمر میری
نہیں پر دل شکستہ میں خدا پر ہے نظر میری
خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

یہ طرز کلام بہت پرانا ہوکر آج تک بھی متروک نہیں بلکہ مقبول ہے۔ اخبار ''زمیندار''[1] میں اسی طرز پر ''مستزاد بیضوی'' کے عنوان سے ایک فارسی نظم چھپی ہے جس کے چند بند درج ذیل ہیں:

خیز اے قومِ حزیں از بندِ غم آزاد باش — شاد باش — در جہاں آباد باش
قطع منزل ساز وخود خضر رہِ ارشاد باش — شاد باش — در جہاں آباد باش
یاد ایامے کہ بودی فاتح ملک جہاں — قہرماں — مالک تاج ونشاں
باز زآنساں آہوئے اقبال را صیاد باش — شاد باش — در جہاں آباد باش

[1] ۱۴/ستمبر ۱۹۳۲ء

خواہی از متبوع باشی تابع اسلام شو	رام شو	پیروِ احکام شو
ہم بہ خصمِ خویشتن دارائے عدل و داد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش
جان و دل را کن فدا پروانہ ساں بر شمع دیں	خوش نشیں	برسرِ صدرِ یقیں
در گلستانِ طلب ماندن سرو آزاد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش
خون باطل ریز د اندر راہِ حق فرما جہاد	زاجتہاد	ایزدت یاری کناد
چارۂ جوشِ جنونِ نشترِ فصاد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش
ماسوائے را مگرداں مصدرِ نفع وضرر	بے خبر!	باتو گویم مختصر
از خدائے ذوالمنن در بند استمداد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش
ہمنشیں مے باش با اخیار و ارباب کرم	دم بدم	شامگاہ وصبح دم
مجتنب از ہر شرارت پیشہ وکیاد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش
در رہ تخریب خود کردی زمانہائے دراز	ترکتاز	توبہ را باب ست باز
حالیا برخیزد وقف کوشش بہباد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش
مومنی بیضا اگر، پس سُست ومحزونی چرا	بے خطا	غلبہ باشد مرترا
توشہ گیر مژدہ لایخلف المیعاد باش	شاد باش	در جہاں آباد باش

پادری صاحب! یہ تو آپ کی مادری زبان (فارسی) ہے۔ کیا یہ بھی غلط ہے؟ یا اس پر بھی کوئی اعتراض ہے؟ غالباً نہیں۔

اعتراض (۶)

''قرآن میں ایضاحِ واضح بھی ہے مثلاً ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ اور اس سے زیادہ خلل اور کیا ہوسکتا ہے کہ کلام غیر مفید کو بھرتی کیا جائے۔'' (ص:۷۱)

جواب (۶):

یہ اعتراض خود قواعد نحویہ کے خلاف ہے۔ کافیہ میں ہے:

❶ مرزا بیضا خان مردی، امرتسر ۱۲ منہ۔

"قد يكون النعت بمجرد الثناء أو الذم أو التأكيد مثل نفخة واحدة"[1] (کافیہ بحث نعت)

یعنی صفت کبھی محض تعریف یا مذمت کے لیے ہوتی ہے اور کبھی محض تاکید کے لیے۔ جیسے نفخة واحدة۔

اسی طرح آپ کی پیش کردہ عبارت میں عشرہ کی صفت کاملہ آئی ہے۔

اعتراض (و)

''قرآن میں بطور احتجاج کے کہا گیا ہے کہ ''اگر قرآن کسی اور کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو اس میں کثرت سے اختلاف پائے جاتے۔'' گویا کہ قرآن میں اختلاف نہ ہونے کو اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل ٹھہرایا گیا ہے حالانکہ اس میں کثرت سے اختلاف ہے۔ اختلاف یا تو لفظ میں ہوتا ہے یا معنی میں۔ اختلاف لفظی کی یہ صورتیں ہیں: ① لفظ کے تبدیل کرنے سے۔ ② ترکیب کے تبدیل کرنے سے۔ ③ کوئی لفظ زیادہ کرنے سے۔ ④ کوئی لفظ کم کرنے سے اور یہ سب قرآن میں موجود ہیں۔

① تبدیل لفظی کی مثال: ''کالصوف المنفوش'' بدل ہے: ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ کا۔ اور ''فامضوا إلی ذکر اللّٰه'' بدل ہے: ﴿فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ کا۔ اور ''فکانت کالحجارة'' بدل ہے: ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ کا۔ اور ''السارقون والسارقات'' بدل ہے: ﴿السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ﴾ کا۔'' (ص:۷۱)

جواب (و):

معلوم ہوتا ہے اس سوال کا مضمون فی بطن القائل ہے۔ اصل ملحد معترض کی تو

[1] شرح الرضي علی الکافیة (۲/ ۲۸۷)

شکایت نہیں، ناقل صاحب سے سوال ہے کہ اس اعتراض کا مطلب کیا ہے؟ مگر سوال کا مضمون واضح کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں جو اختلاف کی نفی کی گئی ہے اس کا مطلب کیا ہے؟

سنیے! قرآن میں منفی اختلاف سے مراد ہے:

① واقعات کے ذکر میں اختلاف۔ یعنی ایک ہی واقعہ دو یا زیادہ مقام میں مذکور ہو تو ان میں ایسا اختلاف ہو جس کو تضاد یا تناقض کہتے ہیں۔ اس کی دو مثالیں ہم آپ کو سناتے ہیں۔ ایک ناپسند۔ دوسری پسندیدہ۔ توجہ سے سنیے!

[۱] حضرت مسیح کا سلسلۂ نسب دو انجیلوں میں مرقوم ہے، دونوں کا درمیانی مرکز حضرت داود ہیں۔ حضرت داود کے دو بیٹے تھے سلیمان اور ناتن۔ ایک انجیل میں سلیمان کے ذریعہ سے حضرت داود تک سلسلۂ نسب پہنچایا ہے دوسری میں ناتن کے ذریعہ سے۔ غور فرمایئے!

① داود بادشاہ سے سلیمان آگے مسیح تک۔ (انجیل متی باب:۱)

② مسیح سے لے کر اوپر تک گنتے ہوئے کہا: مسیح یوسف کا وہ ہیلی کا ...وہ ناتن کا وہ داود کا۔ (انجیل لوقا باب:۳)

اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ایک لڑکا دو شخصوں (باپ اور چچا) کی نسل سے نہیں ہوسکتا۔ واقعہ ایک ہی ہے اور بیان مختلف!!

نوٹ: غالباً یہ مثال آپ کو ناخوش کن ہوگی، معاف فرمایئے، اس کی تلافی میں دوسری مثال دل خوش کن پیش کرتے ہیں۔

[۲] دوسری مثال: مرزا صاحب کہتے ہیں جس سے آپ خوش ہوں گے:

① ''حدیث سے ثابت ہے حضرت عیسیٰ کی ایک سو بیس برس کی عمر تھی، لیکن تمام یہود و نصاریٰ کے اتفاق سے صلیب کا واقعہ اس وقت پیش آیا

تھا جبکہ ممدوح کی عمر تینتیس برس کی تھی۔ اس دلیل سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب سے بفضلہ تعالیٰ نجات پا کر باقی عمر سیاحت میں گزاری تھی۔'' (راز حقیقت حاشیہ، ص:۲،۳)

اس اقتباس کا مضمون اتنا ہے کہ بقول مرزا صاحب حضرت عیسیٰ کی ساری عمر دنیا میں ایک سو بیس برس کی ہوئی۔

② مرزا صاحب کا دوسرا بیان:

''احادیث میں آیا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد عیسیٰ بن مریم نے ایک سو بیس سال عمر پائی۔'' (تذکرۃ الشہادتین، ص: ۲۷)

پہلی عبارت میں از پیدائش تا وفات ساری عمر ایک سو بیس سال لکھی۔ دوسری عبارت میں بعد واقعہ صلیب ایک سو بیس سال لکھی، جو پہلے (۳۳ سال) ملا کر ایک سو ترپن سال ہوتی ہے۔

نوٹ: یہ مثال پادری صاحب کے لیے خوش کن ہوگی۔ کیونکہ پادری صاحب اس مثال سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ مرزا صاحب صاحبِ الہام نہ تھے۔ ہم پادری صاحب کے اس نتیجہ میں شریک حال ہو کر یہی حکم مصنفین اناجیل پر لگائیں گے کہ وہ بھی صاحب الہام نہ تھے۔ پادری صاحب اس میں ہم سے اختلاف کریں گے تو ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اصل کو مان کر فرع سے انکار کرنا اس مصرعہ کا مصداق ہے ؎

''منکرِ مے بودن وہمرنگ مستاں زیستن''[1]

دوسری صورت:

② اسلوب کلام میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو مصنف لوگ خوب سمجھ

[1] شراب کا منکر ہونا اور ہمرنگ مستاں ہونا۔

سکتے ہیں جن کی ابتدائی اور آخری عمر کی تصنیفات میں وہی فرق ہوتا ہے جو اُن کی جوانی اور بڑھاپے کے چہرے سے نمایاں ہوتا ہے۔ قرآن مجید ۲۳ سال میں ختم ہوا مگر اس کے اسلوب کلام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس آیت میں اختلافِ واقعات کے علاوہ اس قسم کے اختلاف کی بھی نفی کی گئی ہے۔ اس مضمون کو ملحوظ رکھ کر آپ ہی انصاف سے فرمایئے کہ آپ کے پیش کردہ فقروں کو اس منفی اختلاف سے کیا تعلق؟ آپ کی پیش کردہ مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی کہے: ''سلطان احمد خان بدل ہے سلطان محمد خان کا۔ اور عیسیٰ خان بدل ہے موسیٰ خان کا اور مرزا غلام احمد بدل ہے مرزا غلام محمد کا۔''

نوٹ: شیخ سعدی کا قصہ مشہور ہے۔ ایک شخص سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ نام پوچھنے پر اس نے اپنا نام حاجی بتایا۔ پس شیخ صاحب کو لطفِ سخن کا موقع ہاتھ آ گیا۔ فرمایا:

''حاجی و چاچی تجنیس خطی دارد۔ چاچی کمان را گویند۔ کمان وگمان تجنیس خطی دارد۔ گمان شک را گویند۔ شک و سگ تجنیس خطی دارد۔ ومعلوم شد کہ تو سگ ہستی۔''[1]

جس رنگ میں سعدی مرحوم نے یہ کلام کیا اس میں تو وہ موجب تفریح ہے۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر میں ایسی کوشش موجب تضحیک ہے۔ ہر نقطہ مکانے دارد۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پادری صاحب کی اس کوشش سے قرآن بے عیب ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس فقرہ سے آگے کا فقرہ بھی ہمارے خیال کی تاکید کرتا ہے جو یہ ہے:

قرآن میں تبدیل ترکیبی کی مثال:

''② تبدیل ترکیبی کی مثال: ''ضربت علیهم المسکنة والذلة'' بدل

---

[1] حاجی اور چاچی خط میں ایک طرح لکھے جاتے ہیں، چاچی کمان کو کہتے ہیں، کمان اور گمان لفظوں میں ایک طرح لکھے جاتے ہیں، گمان شک کو کہتے ہیں، شک اور سگ ایک طرح لکھے جاتے ہیں، سگ کتے کو کہتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ تم کتے ہو۔

ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ﴾ کا۔ "جاءت سكرة الحق بالموت" بدل ہے: ﴿جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ کا۔"
(ص:۷۱)

جواب:

اس کا جواب بھی پہلے آچکا ہے کہ بدل سدل تو آپ کے الفاظ ہیں، قرآن میں ان کا کیا دخل؟ اسی طرح اس سے آگے کے فقرے بھی ملاحظہ ہوں:

زیادتی اور کمی کی مثال:

"(۳،۴) زیادتی اور کمی کی مثال: "النبي أولى بالمؤمنين من أنفسهم وأزواجه أمهاتهم و هو أب لهم"۔ اس قراءت میں اس کی زیادتی ہے اور قراءت مشہورہ میں کمی۔ اور یہی کیفیت ہے اس آیت کی کہ "له تسع و تسعون نعجة أنثىٰ۔" (ص:۷۲)

جواب:

یاد رہے قرآن اس کتاب کا نام ہے جو بازار سے اس نام پر ملتی ہے اور حافظوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ کسی قراءت شاذہ کا نام قرآن نہیں۔ آپ اگر ہمت کر سکتے ہیں تو قرآن کا نسخہ بازار سے خرید کر ایک ہی مضمون اس کی دو جگہ سے نقل کر کے اختلاف دکھائیں۔ یہی جواب آپ کے مندرجہ ذیل فقرات کا ہے جو یہ ہیں:

اختلافِ معنوی کی مثال:

"اختلاف معنوی کی مثال: ﴿رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَا اَسْفَارِنَا﴾ اس میں ﴿بَاعِدْ﴾ بصیغہ امر ہے اور "رَبّ" منادیٰ ہے۔ لیکن دوسری قراءت میں یوں ہے کہ "ربنا بَاعَدَ بين اسفارنا" اس میں "بَاعَدَ" بصیغہ ماضی ہے اور "رب" اس کا فاعل ہے۔ اول جملہ انشائیہ ہے اور دوم جملہ خبریہ۔

''اسی طرح اس جملہ کو کہ ﴿هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ﴾ کو دو طرح سے پڑھتے ہیں۔ ﴿هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ﴾ ''وهل تستطيع ربک'' جملہ اول خدا کے متعلق استخبار ہے اور جملہ دوم حضرت عیسیٰ کے متعلق۔'' (ص:۷۳)

جواب:

اس کا جواب گزشتہ سطور سے حاصل ہو سکتا ہے بلکہ آ چکا ہے۔

امام رازی کی عبارت:

شرح مواقف کے بعد پادری صاحب نے امام رازی کا دامن پکڑا ہے جن کی عبارت نقل کی ہے:

''جانو کہ قرآن میں کثرت کے ساتھ ایسی باتیں ہیں جو قرآن کی فصاحت کے نقصان کی متقاضی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ معجزہ کے انتہائی درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن معجزہ ہے۔'' (ص:۷۲)

جواب:

امام رازی رحمہ اللہ کی نظر ملحدین کے ان اعتراضات پر ہے جن کو اُنہوں نے وجوہات سے تعبیر کیا ہے اور ہم نے ہر ایک کا جواب دیا ہے۔ امام صاحب یا پادری صاحب کی نظر میں قرآنی فصاحت کے نقصان کی اور وجوہات بھی اگر ہیں تو ان کو روشنی میں لائیں تا کہ غور ہو سکے۔

اسی ضمن میں پادری صاحب نے سر سید احمد خان مرحوم۔ مرزا صاحب قادیانی۔ مولوی محمد علی صاحب احمدی لاہوری اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کا ذکر کیا ہے جس سے ہمیں سروکار نہیں۔ ہاں سر سید کے ذکر میں جو آپ نے یہ لکھا ہے:

''سر سید کے بعد تمام مفسرین ان ہی کے خوشہ چین اور فضلہ نوش ہیں۔''

(ص:۷۳)

ہم نہیں کہہ سکتے یہ دروغ ہے یا مبالغہ۔ بحالیکہ تفسیر حقانی ان سے بعد بنی۔ اس میں سرسید کا رد۔ تفسیر ثنائی اس کے بھی بعد بنی، اس میں تو بالاستیعاب اُن پر تعاقبات۔ احسن التفاسیر دہلی میں بنی اس میں ان کا رد۔ ہم تو جہاں تک دیکھتے ہیں پادری صاحب کے خلاف پاتے ہیں۔ معلوم نہیں آپ نے ایسا کیوں لکھ دیا؟

سرسید کا قول:

پادری صاحب نے سرسید اور مولوی محمد علی کا قول اپنی تائید میں نقل کیا ہے۔ حالانکہ وہ دونوں قول ہماری تائید میں ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔ سرسید فرماتے ہیں:

> ''کسی کلام کی نظیر نہ ہونا اس بات کی تو بلا شبہ دلیل ہے کہ اس کی مانند کوئی دوسرا کلام موجود نہیں۔ مگر اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ بہت سے انسانوں کے کلام دنیا میں ایسے موجود ہیں کہ ان کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہوا۔ مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے۔ نہ ان آیتوں میں کوئی ایسا اشارہ ہے جس سے فصاحت و بلاغت میں معارضہ چاہا گیا ہو۔ بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ جو ہدایت قرآن سے ہوتی ہے اس میں معارضہ چاہا گیا ہے کہ اگر قرآن کے خدا سے ہونے میں شبہ ہے تو کوئی ایک سورۃ یا دس سورتیں یا کوئی کتاب مثل قرآن کے بنا لاؤ جو ایسی ہادی ہو۔'' (ص:۷۳)

اس اقتباس میں سرسید مرحوم کو بلاغتِ قرآن تسلیم ہے جو پادری صاحب کو نہیں، اس لیے اس حصہ میں سرسید ہمارے مؤید ہیں۔

ہاں سرسید کا یہ کہنا کہ ''بے مثل کلام ہونا خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔'' قابل ترمیم ہے۔ بے شک محض فصاحت دلیلِ الہام نہیں لیکن دعوی الہام کے ساتھ تحدی اور تحدی کے ساتھ عدم جواب لاریب دلیل صداقت ہوسکتا

ہے۔ قرآن مجید میں اسی طرف اشارہ ہے۔ غور فرمایئے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [هود: ١٣، ١٤]

یعنی کافر کہتے ہیں اس (نبی) نے قرآن بنالیا ہے تو کہہ کہ اس جیسی دس سورتیں بنالاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو چاہو مدد کے لیے بلالو اگر سچے ہوتو ایسا ہی کرو۔ پھر اگر یہ لوگ تمھارے اس چیلنج کا جواب نہ دیں تو تم (سرسید احمد خان اور پادری سلطان محمد خان وغیرہ) جان لو کہ یہ قرآن اللہ کے علم کے ساتھ اُترا ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کیا پھر بھی تم (معترضین) مسلمان ہوگے یا نہیں؟

غور فرمایئے! اس آیت نے سرسید کو اور اُن کے ساتھ ان سب کو جو اُن کی توجیہ کو صحیح مانیں جواب دیا۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ کلام بے مثل بے شک علتِ الہام نہیں مگر جس وقت اس کے ساتھ دعویٰ اور چیلنج مل جائے تو بعد دعویٰ جو چیلنج ہوگا اس سے اس کلام کا الہامی ہونا ثابت ہوجائے گا۔ فافھم

مولوی محمد علی کا قول:

اس سے آگے بھی پڑھیے۔ اسی طرح مولوی محمد علی صاحب کا قول ہمارے خلاف نہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

''قرآن شریف عربی تصانیف میں ایک بے نظیر کتاب ہے اور ہمیشہ عربی زبان کی فصاحت کا معیار مانا گیا ہے۔ لیکن اس پاک کتاب کی بڑی خصوصیت جس میں کوئی دوسری کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی

اس کی وہ عجیب کایا پلٹ کرنے والی طاقت ہے جو اس کے کام سے ظاہر ہوئی۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے کہ جس کی مدعی خود یہ پاک کتاب اپنے آغاز ہی میں ہے۔ یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔'' (ص:۷۵)

یہ قول ہمارا مؤید ہے۔ ان دونوں صاحبوں نے قرآن شریف کو اعلی درجہ کا فصیح و بلیغ مانا ہے۔ رہا اصل مسئلہ کہ تحدی (چیلنج) کس میں ہے؟ اس کا ثبوت ہم بشہادت قرآن پہلے نمبروں میں دے چکے ہیں۔[1] فتذکر.

مولوی محمد علی صاحب نے جو قرآن مجید کی کشش کا ذکر کیا ہے سونے سے لکھنے کے قابل ہے۔ جو لوگ ذوق سلیم کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھتے ہیں وجد میں قرآن کو مخاطب کر کے ان کی زبان سے نکل جاتا ہے ؎

کیا جانے تجھ میں کیا ہے کہ لوٹے ہے تجھ پہ جی
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں

مرزا صاحب قادیانی کا قول پہلے نقل ہو چکا ہے۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی کا قول نہ آپ کو مفید نہ ہمیں مضر، نہ قابل ذکر نہ لائق فہم۔

قرآن اور بائیل:

پادری صاحب جو اس بات پر زور دے رہے تھے کہ قرآن مجید کا چیلنج تعلیم کی حیثیت سے ہے، اس میں ان کی ذاتی غرض تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے اس کو ظاہر کر دیا۔ یعنی تعلیم کے لحاظ سے بائیل اصل ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''قرآن شریف میں کوئی ہدایت کی بات ایسی نہیں ہے جو الکتاب بائبل سے ماخوذ نہ ہو۔'' (ص:۷۶)

---

[1] دیکھیں: (ص: ۱۷۸)

برہان:

بنائے تحدی تو ہم بتا آئے ہیں کہ بلاغتِ قرآن ہے مگر پادری صاحب کے اس قول سے بھی ہم خوش ہیں۔ اس لیے پادری صاحب سے دو تین ہدایتوں کا پتہ پوچھتے ہیں کہ بائبل میں بتائیں۔

① ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ [المائدة: ۷۳]

''کافر ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ تین میں سے ایک ہے۔''

② ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [المائدة: ۷۲]

''کافر ہیں جو کہتے ہیں اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے۔''

③ ﴿لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا﴾ [البقرة: ٤٨]

''کوئی نفس کسی نفس کو (بطور کفارہ) کام نہ آئے گا۔''

میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ آپ بائبل میں تلاش کریں گے تو کامیابی کی صورت میں ظاہر نہ کرسکیں گے۔ خدا کرے میری یہ پیشگوئی غلط ثابت ہو۔ یعنی آپ کھلم کھلا اعلان فرمائیں:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [الأخلاص: 1 تا ٤]

یعنی تثلیث خلاف بائبل ہے۔ الوہیتِ مسیح خلاف بائبل ہے۔ ابنیتِ مسیح خلاف بائبل ہے۔ کفارہ مسیح خلاف بائبل ہے۔ قرآن مجید کی یہ تینوں ہدایتیں بائبل کی فلاں فلاں جگہ سے ماخوذ ہیں۔ اس روز ہم آپ کو یہ شعر نذر کریں گے ؎

شکر للہ کہ میان من و تو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں سجدۂ شکرانہ زدند[1]

[1] شکر خدا ہے کہ میرے اور تمھارے درمیان صلح ہوگئی ہے، حوریں سجدہ شکر بجالاتے ہوئے رقص کناں ہیں۔

بلاغت کے تین فنون:

نوٹ: علم بلاغت کی کتابوں میں تین فنون ذکر ہوئے ہیں:

1. ''معانی'' جس میں مناسبتِ الفاظ کا ذکر ہوتا ہے۔
2. ''بیان'' جس میں مجازات اور استعارات کا ذکر ہوتا ہے۔
3. ''بدائع'' جس میں کلام کی بیرونی خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے۔

ان تینوں کی مثالیں دے کر ہم اصل مقصد پر آئیں گے۔ ان شاء اللہ

(الف) انسانی حسن کیا ہے۔ متناسب اعضاء، آنکھیں بادامی وضع کی، ناک اونچی اور پتلی، رخسارے بھرے ہوئے، چہرہ گول۔ یہ ہے مثال علم معانی کی جس سے کلام میں تناسب ہوتا ہے۔

(ب) اس تناسبِ اعضاء کے بعد گوری رنگت ہو تو حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ یہ مثال ہے علم بیان کی۔

(ج) اس کے بعد خوش پوشاک حسن لباس ہو تو سابق حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ مثال ہے بدیع کی جس میں عبارت مقفّٰی مسجع ہوتی ہے۔ اس مثال کا نتیجہ یہ ہے کہ خالی بدیع سے حسن پیدا نہیں ہوتا۔ جیسے خالی پوشاک سے حسن پیدا نہیں ہوتا، ہاں حسن خوش لباسی کا محتاج ہے۔ انہی معنی میں یہ شعر ہے ؎

ہمہ خوبان عالم را بزیورہا بیارائند
تو سیمی تن چناں ہستی کہ زیور را بیارائی[1]

قرآن مجید میں یہ تینوں مراتب ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ پادری صاحب پہلے دو فنون (معانی اور بیان) سے فارغ ہو کر اب بدیع پر آئے ہیں۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

---

[1] تمام خوبان عالم کو زیور سے آراستہ کیا جاتا ہے تم تو ایسی سیمی بدن ہو کہ جو زیور کو آرائش بخشتی ہے۔

قرآن شریف کی چند مشہور بدائع والی آیتوں کا مقابلہ:

''میرا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ میں ان دقیق فنون پر اپنی اس تفسیر میں بحث کروں جن کو فن بیان اور فن بدیع کہتے ہیں۔ کیونکہ ان علموں کا جاننے والا عیسائیوں میں تو ایک بھی آپ کو نہیں مل سکے گا۔ البتہ ممکن ہے کہ مسلمانوں میں فی دس ہزار آپ کو ایک شخص مل جائے۔ وہ بھی ایسا جس کی وسعتِ معلومات صرف ان دو ایک درسی کتابوں میں محدود ہوگی جو اس فن کی ابتدائی کتابیں ہیں۔ لیکن قرآن شریف کے ان دوست نما دشمنوں کی خاطر جن کی تعلّی اور نافہمی کی وجہ سے قرآن شریف کی عزت اور وقار کو صدمہ پہنچ رہا ہے میں بادل ناخواستہ ان چند آیتوں کو جن کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ صنائع اور بدائع کوٹ کوٹ کر ان میں بھری ہوئی ہیں اور تشبیہات و استعارات کے اعلیٰ مدارج تک پہنچی ہوئی ہیں ان عربی عبارات کے ساتھ مقابلہ کروں گا جو استعارات و تشبیہات اور بدائع و صنائع کے لحاظ سے قرآن شریف کی اس قسم کی آیتوں سے بدرجہا آگے بڑھی ہوئی ہیں۔'' (ص:۷۶)

برہان:

اس اقتباس کے دو حصے ہیں: ① عیسائیوں میں اس فن سے ناواقفی ۔ اور ② مسلمانوں کی فی الجملہ واقفی ۔ ہم صاف لفظوں میں دونوں حصے تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھیے آپ کے ہم مذہب عیسائی بھی ہماری طرح تصدیق کرتے ہیں یا نہیں جن کا دعویٰ ہے:

''مسیحی تو سب علامہ ہیں، مسلمانوں میں پادری سلطان پال کے پلّہ کا ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گا۔'' (نور افشاں یکم مئی ۱۹۲۹ء)

نوٹ: پادری صاحب سے امید ہے کہ بعد اس کے ہمیں اطلاع دیں گے کہ مسیحی علامہ زماں ہیں یا علامہ دہلی!![1]

اس اقتباس میں پادری صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ عربی عبارات قرآن کی آیات سے بدرجہا آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ ناظرین اس دعویٰ کو دل پر نوٹ کر کے پادری صاحب کا ثبوت سنیں۔

پادری صاحب کے دلائل:

اس دعوے کے ثبوت میں پادری صاحب نے آیات قرآنیہ سے کچھ مثالیں دی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کا ذکر کیا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

1. ﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ [الإسراء: ٢٤]
2. ﴿وَ اشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ [المريم: ٤]
3. ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ [النور: ٣٥]
4. ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ﴾ [يٰس: ٣٧]

''کہتے ہیں کہ ان آیتوں میں ﴿جَنَاحَ الذُّلِّ﴾ اور ﴿اشْتَعَلَ الرَّأْسُ﴾ اور ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ میں استعارہ ہے۔ استعارہ سے چونکہ کلام میں ایک خاص قسم کی ملاحت اور زینت حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کو بھی بدائع میں شمار کرتے ہیں۔

استعارہ کیا ہے؟

''استعارہ کے لغوی معنی مانگنے کے ہیں۔ جس چیز کو مانگتے ہیں اس کو مستعار کہتے ہیں، اور جس کے لیے مانگتے ہیں اس کو مستعار لہ کہتے ہیں۔ اور جس سے مانگتے ہیں اس کو مستعار منہ کہتے ہیں۔ مثلاً اس مثال

[1] دہلی میں علامہ خاص اصطلاح ہے۔ [مؤلف]

میں کہ ''زید شیر ہے۔'' لفظ ''شیر'' مستعار ہے۔ یعنی مانگا ہوا۔ اور ''زید'' مستعار لہ ہے۔ یعنی مانگا ہوا اُس کے لیے۔ اور لفظ شیر کے معنی مستعار منہ ہے۔ یعنی مانگا ہوا اُس سے۔

''اور اصطلاح میں استعارہ معنہائے مجازی اور حقیقی کے اس علاقہ کو کہتے ہیں جو بر سبیل تشبیہ ہو۔ اور اگر یہ علاقہ بر سبیل تشبیہ نہ ہو تو اس کو مجاز مرسل کہتے ہیں۔''

استعارہ کی مشہور اقسام:

''پس اگر مشبہ بہ مذکور ہو اور مشبہ متروک تو اس کو استعارہ تصریحیہ کہتے ہیں۔ مثلاً ماہ اور آفتاب کہیں اور اس سے معشوق یا اس کا رخسار مراد لیں۔ اور اگر مشبہ بہ کو ترک کر دیں اور مشبہ کو ذکر کر دیں تو اس کو استعارہ بالکنایہ کہتے ہیں۔

''اس امر کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ استعارہ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مشبہ مشبہ بہ کا عین ہوتا ہے۔ خواہ مشبہ بہ مذکور ہو جیسا استعارہ تصریحیہ میں، یا متروک ہو جیسا استعارہ بالکنایہ میں، اور دونوں صورتوں میں مشبہ بہ کو مستعار منہ کہتے ہیں اور اس لفظ کو جو مشبہ بہ کے معنی پر دلالت کرے مستعار، اور مشبہ کے معنی کو مستعار لہ کہتے ہیں۔'' (ص: ۷۷)

برہان:

اس اقتباس میں بحیثیت مصنف پادری صاحب سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ استعارہ کا ذکر پہلے کیا اور تشبیہ کا ذکر پیچھے کیا ہے۔ حالانکہ تشبیہ کا مقام مقدم ہے۔ بہت خوب! استعارہ اور تشبیہ کی یہ تعریف ہمیں منظور ہے۔ آگے چلیے:

تقابل:

''اس قدر سمجھنے کے بعد اب ذیل کے اشعار کو قرآن شریف کے استعارات سے مقابلہ کر کے دیکھو کہ غرابت کے اعتبار سے قرآن شریف کی آیتوں سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ کثیر عزہ کہتا ہے کہ ؎

أخذنا بأطراف الأحاديث بيننا
وسالت بأعناق المطي الأباطح

ترجمہ: ''جب کہ ہم طرح طرح کی گفتگو میں باہم مشغول تھے تو اسی وقت ہماری سواریاں سیلاب کی طرح تیز دوڑنے لگیں۔'' اس شعر میں مستعار ''سالت'' ہے اور مستعار منہ سیلان السیول ہے (یعنی سیلاب کا بہنا) اور مستعار لہ اونٹوں کا چلنا ہے اور وجہ جامع غایت سرعت اور سہولت ہے۔ اس شعر کے استعارہ میں بعینہٖ وہی غرابت ہے جو قرآن کی آیات بالا کے ﴿اشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ اور ﴿جَنَاحَ الذُّلِّ﴾ میں ہے۔ یعنی اگر آیات بالا میں ''اشتعال'' کو ''شیب'' کی طرف نسبت دیا جاتا اور ''جناح'' کو شخص مخاطب کی طرف تو اس استعارہ میں کوئی غرابت پیدا نہ ہوجاتی اور مبتذل سمجھا جاتا۔ لیکن ''اشتعال'' کو ''رأس'' کی طرف اور ''جناح'' کو ''ذل'' کی طرف نسبت دینے سے غرابت پیدا ہوگئی۔ یعنی یہ کہ ''بال سارے کے سارے سفید ہوگئے'' اور ''تمام دل سے عاجزی اختیار کر''۔ اسی طرح اگر شعر بالا میں ''سالت'' کو ''المطي وأعناقها'' کی طرف منسوب کرتا اور کرنا چاہیے تھا تو اس استعارہ میں کوئی خوبی (غرابت) پیدا نہ ہوتی بلکہ مبتذل سمجھا جاتا۔ لیکن ''سالت'' کو ''أباطح'' کی طرف نسبت دے کر اس میں یہ خوبی پیدا کردی کہ گویا اونٹوں سے تمام روڈ بھر گئے۔'' (ص: ۷۷، ۷۸)

برہان:

ناظرین ملاحظہ کریں کہ اس اقتباس سے پادری صاحب کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ سابقہ عربی کلام قرآن سے بڑھ کر ہیں؟ بحالیکہ خود آپ کو اعتراف ہے:

''اس شعر کے استعارہ میں بعینہٖ وہی غرابت ہے جو قرآن کی آیات بالا کے ﴿اشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ اور ﴿جَنَاحَ الذُّلِّ﴾ میں ہے۔''

غایت ما فی الباب:

اس کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں وہی محاورات اور استعارات آئے ہیں جو عرب کے بڑے فصیح و بلیغ اشعار میں بولے گئے تھے۔ قرآن مجید بقول پادری صاحب ان سے اعلیٰ نہیں تو کم بھی نہیں حالانکہ دعویٰ آپ کا قرآن کی کمی اور اشعار عرب کی برتری کا ہے جو ثابت نہیں۔ اتنا امر تو پادری صاحب کو بھی مسلم ہے، اور کیوں نہ ہوتا جبکہ ہر اہل زبان اس کی شہادت دیتا ہے، کہ قرآن مجید میں بدائع وغیرہ سب کچھ ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی مزیت کا ثبوت دینا رہ گیا جو ہمارے ذمہ ہے۔ خاتمہ پر ہم اس کی مثال دیں گے۔ ان شاء اللہ۔

اس بحث میں پادری صاحب نے بہت وقت لگایا ہے مگر نتیجہ اُن کے حق میں نہیں ہوا۔ کیونکہ کسی دلیل سے وہ ثابت نہیں کر سکے کہ کلامِ عرب قرآن سے بدرجہا افضل ہے۔ تشبیہ کی تعریف لکھ کر قرآن سے کچھ آیات متضمنہ تشبیہات نقل کی ہیں، ان کے ساتھ اشعار عرب بھی نقل کیے ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ پادری صاحب اپنے دعوے کی تردید خود ہی کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ کا دعویٰ کلام عرب کی برتری کا ہے جو ثابت نہیں۔ آپ کی ساری کوشش اس بات میں ہے کہ قرآن سابقہ اساتذہ عرب کے کلام کے مساوی ہے۔ مخالف کا اتنا اعتراف بھی ہمیں مفید ہے۔

صنعت تدبیج:

اس بحث میں پادری صاحب نے ایک ایسی بات بھی کہی ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔آپ نے ایک صنعت تدبیج لکھی ہے۔جس کے متعلق آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''صنعت تدبیج: تدبیج بھی صنعت طباق کی ایک قسم ہے۔اس کی تعریف یہ ہے کہ تعریف یا ہجو میں کئی رنگ ذکر کریں۔بقصد کنایہ یا توریہ وایہام کے۔...افسوس ہے کہ قرآن شریف اس صنعت سے خالی ہے۔اور یہ ایک ایسی صنعت ہے جس کے نہ ہونے سے کلام کی زینت جاتی رہتی ہے۔'' (ص:۸۳،۸۴)

برہان:

یہاں پہنچ کر تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ پادری صاحب نے یہ صنعت کتب فن میں نہیں دیکھی کسی سے سُنی ہوگی۔وجہ یہ کہ ایک تو اس کا نام یہ نہیں، دوم اس کی تعریف یہ نہیں۔تیسرے قرآن میں اس کے وجود سے انکار صحیح نہیں۔بغور سنیے ''مطوّل''[1] میں اس کا نام اور تعریف یوں ہے:

"الإدماج: هو أن يضمن كلام سيق بمعنى (مدحا كان أو غيره) معنى آخر."[2]

یعنی صنعت ادماج یہ ہے کہ کلام جس غرض کے لیے چلایا جائے اس کی تہہ میں دوسرے معنی بھی مراد ہوں۔

وہ دوسرے معنی لفظوں میں مذکور نہ ہوں۔چنانچہ صاحب مطوّل نے اس کی صاف تصریح کی ہے:

---

❶ صاحب تذکرۃ البلاغہ نے بھی یہی نام اور یہی تعریف کی ہے۔[مؤلف]

❷ مختصر المعاني (ص: ٢٦٩) المطول (ص: ٤٤٢)

"والمعنى الثاني يجب أن لا يكون مصرحا به."[1]

یعنی دوسرے مرادی معنی لفظوں میں بالکل مذکور نہ ہوں۔

یہ ہے صنعت ''ادماج'' جس کو آپ تدبیج کہتے ہیں۔ اس صنعت کو علمائے اصول فقہ "اقتضاء النص" کہتے ہیں، یعنی ایسے معنی جو الفاظ سے مفہوم ہوں مگر مذکور نہ ہوں۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ ہم یہاں دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

① ﴿لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾ [الإسراء: ٢٣] ''ماں باپ کو اُف نہ کہو۔''

اس آیت میں ماں باپ کو اُف (ہوں؟) کہنے سے منع ہے مگر صنعت ''ادماج'' (اقتضاء النص) یہ ہے کہ گالی بھی نہ دو، مارو بھی نہیں، بے ادبی بھی مت کرو وغیرہ۔

② دوسری مثال اس کی یہ ہے:

﴿وَ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ﴾ [النساء: ١١]

''جس میت کے ماں باپ ہی وارث ہوں اس کی ماں کا ثلث ہے۔''

اس آیت کے صریح الفاظ میں ماں کا ثلث حصہ بتایا ہے۔ صنعت ادماج سے باقی باپ کا ہوا جو مذکور نہیں۔ قرآن مجید میں اس صنعت کی مثالیں بکثرت ہیں۔ نصاب شہادت کے ماتحت ہم دو پر کفایت کرتے ہیں۔

صنعت تجنیس:

پادری صاحب نے اس صنعت پر بھی توجہ فرمائی ہے اور بڑے تبحر علمی سے قرآن میں اس کے ہونے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''صنعت تجنیس: اس کی تعریف یہ ہے کہ دو لفظ یا اس سے زیادہ باہم ہم شکل ہوں اور معنی کے لحاظ سے باہم مختلف ہوں، یہ صنعت بھی قرآن

---

[1] المطول (ص: ٤٤٢)

میں نہیں ہے۔ البتہ بہت تلاش کے بعد ایک جملہ تجنیس زائد۔ اور تین چار جملے حسن اشتقاق کے جس کو بعض لوگ تجنیس میں داخل سمجھتے ہیں ہمیں مل گئے ہیں جو از قرار ذیل ہیں:

① ﴿ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ﴾ [القيامة: ٢٩، ٣٠]

''ساق'' اور ''مساق'' میں میم زائد ہے۔

② ﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ ﴾ [الروم: ٤٣]

③ ﴿ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ ﴾ [النمل: ٤٤]

④ ﴿ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ ﴾ [اليوسف: ٨٤]

⑤ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ﴾ [الأنعام: ٨٢]

ان جملوں کے خط کشیدہ الفاظ میں حسن اشتقاق اور بقول بعض تجنیس ہے۔'' (ص:۸۴)

برہان:

پادری صاحب نے تو اس عبارت کو مجمل چھوڑا ہے۔ ہم اس کو مفصل بنانے کے لیے ''بوستان'' سے مثال پیش کرتے ہیں ؎

گدا را چو حاصل شود نانِ شام
بخسپد چناں خوش کہ سلطانِ شام [1]

اس شعر میں پہلے شام سے مراد رات ہے دوسرے شام سے مراد ملک شام ہے۔

[1] فقیر کو جب شام کی روٹی مل جائے۔ اس طرح خوش ہو کر سوتا ہے کہ وہ شام کا بادشاہ بن گیا ہے۔

قرآن مجید میں پادری صاحب کو اس کی مثالیں نہیں ملیں حالانکہ بکثرت ہیں۔

چند اُمثلہ معروض ہیں:

1 ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشورىٰ: ٤٠]

پہلی سیئہ بُرائی ہے۔ دوسری اس کا بدلہ جو بُرا نہیں بلکہ اچھا ہے۔

2 ﴿ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ [الأعراف: ٢٦]

اس آیت میں پہلے لباس سے مراد معمولی کپڑے ہیں دوسرے سے مراد اعمال صالحہ۔

3 ﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾ [المائدة: ٦٤]

اللہ کا ہاتھ اور یہود کے ہاتھ مختلف الحقیقت ہیں اس لیے یہ صنعتِ تجنیس ہے۔

4 ﴿ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ [الأنفال: ١٧]

مخاطب کی رمی سے مراد ہاتھ سے مارنا اور خدا کی رمی سے مراد پہنچانا۔

ایک اور مثال بھی سن لیجیے۔ چونکہ وہ آپ کے خداوند یسوع اور ہمارے حضرت مسیح کے الفاظ میں ہے اس لیے بہت مفید ہوگی، بروز حشر سوال الٰہی کے جواب میں عرض کریں گے:

5 ﴿ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ﴾ [المائدة: ١١٦]

اس آیت میں ﴿نفسی﴾ مضاف اِلی المتکلم سے جو مراد ہے وہ مضاف الی اللہ سے مراد نہیں بلکہ غیر ہے۔ فافہم

پادری صاحب! قرآن دانوں کے سامنے ایسے دعوے کرنا اور قادیان سے خلاف[1] آواز آئے تو خفا ہونا اس شعر کا مصداق نہیں ؎

[1] اہلحدیث مورخہ ۲۳/ ستمبر ۳۲ء (ص: ۱۲ سطر اخیر) کی طرف اشارہ ہے۔ [مؤلف]

آفت کی تاک جھانک قیامت کی شوخیاں؟
پھر چاہتے ہو ہم سے کوئی بدگماں نہ ہو

اس کے بعد پادری صاحب نے چند صنعات (صنعت ترصیع ۔ صنعت مقلوب۔ صنعت عکس۔وغیرہ) لکھی ہیں۔ جن کی بابت صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ صنعتیں قرآن میں بھی ہیں، اس لیے ان کا ذکر کرنا اور جواب دینا ہم پر واجب نہیں۔ پادری صاحب کو ان کے ذکر سے کوئی خاص غرض ہوگی۔ ہماری غرض تو اعتراض کا جواب دینا ہے۔ جب اعتراض ہی نہیں تو جواب کیا؟

امام باقلانی کا قول:

ہاں پادری صاحب نے کمال دلیری سے ایک سرخی لکھی ہے:

''امام باقلانی[1] کے نزدیک بھی قرآن فن بدیع کے لحاظ سے بے مثل نہیں ہے۔''

(ص:۸۶)

اتنے زبردست دعوے کا ثبوت مندرجہ ذیل عبارت ہے جو پادری صاحب نے عربی کا ترجمہ کیا ہے ہم اُسے پورا نقل کرتے ہیں۔ امام موصوف کا مافی الضمیر یہ ہے کہ فصحاء اور شعراء کی فصاحت و بلاغت کسبی ہوتی ہے جو قرآن کی بلاغت کو نہیں پہنچ سکتی۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

ترجمہ: ''قرآن شریف کے اعجاز کے پہچاننے کا طریقہ وہ علم بدیع نہیں ہے جسے وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس فن میں وہ بات نہیں ہے جو عادت کے برخلاف ہو یا روزمرہ کی گفتگو سے خارج ہو، بلکہ یہ وہ فن ہے جو تعلم و تدرب سے حاصل ہو سکتا ہے اور محنت کرنے سے آجاتا ہے۔ مثلاً شعر کہنا، لیکچر دینا، کتاب لکھنا۔ یہ ایسے امور

[1] قاضی ابوبکر باقلانی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے خاص اعجاز قرآن میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام بھی ''اعجاز القرآن'' ہے۔ یہ کتاب اتقان مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر طبع ہے۔ [مؤلف]

ہیں جن کے خاص راستے ہوتے ہیں اور سیڑھی ہوتی ہے۔ جس پر چل کر اور جس پر چڑھ کر انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان جب عادت ڈالتا ہے تو وہ بلا تکلف اپنے تمام کلام کو نظم کر سکتا ہے اور بلا تکلف اپنے تمام کلام کو مسجع کر سکتا ہے، یا ایسے متصل صنائع استعمال کر سکتا ہے جس کے کلام کا ایک حرف بھی اس سے خالی نہیں ہوتا ہے اور یہ سب عادت پر موقوف ہے۔ آپ ہمارے زمانے کے ادیبوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک کتاب میں تمام محاسن کو جمع کرتے ہیں اور اسی طرح براعت کے تمام اقسام کو لکھ لیتے ہیں، پھر جب وہ کوئی قصیدہ، لکچر یا رسالہ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اپنی اس تصنیف سے فائدہ اٹھا کر اپنے کلام کو اس سے آراستہ اور پیراستہ کرتے ہیں۔ لیکن اس شخص کے لیے جو اس علم کو یاد کرنے میں آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے اس قسم کی تصانیف کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ جس شخص کو اس علم میں زیادہ اقتدار حاصل ہوتا ہے اسی قدر اس کا کلام زیادہ آراستہ اور پیراستہ ہوتا ہے۔ پس یہ وہ راستہ نہیں جس پر کوئی چل نہ سکے اور نہ وہ دروازہ ہے جو بند ہو، بلکہ ہر ایک شخص اپنی طبیعت کی استعداد کی مناسبت سے اس سے فائدہ اخذ کر سکتا ہے۔"

(اعجاز قرآن باقلانی جلد اول ص: ۱۴۸، ۱۴۹ برحاشیہ اتقان)

مذکورہ عبارت امام باقلانی کی ہے جس کی بابت پادری صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ باقلانی کے نزدیک بھی قرآن بے مثل نہیں۔ اس کا جواب ملاحظہ ہو۔

جواب:

ناظرین! پادری صاحب کا دعویٰ اور دلیل ملاحظہ کریں کہ اس عبارت سے جو آپ نے نقل کی ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام باقلانی کے نزدیک قرآن بے مثل نہیں؟ مکرر ملاحظہ فرمائیں۔

اصل بات یہ ہے کہ امام موصوف کا مافی الضمیر یہ ہے کہ شعراء اور خطباء کا دستور ہے کہ اپنے سابق اساتذہ کے کلاموں کو سامنے رکھ کر ان کی طرح پر نظم ونثر لکھتے ہیں، مگر قرآن کا طرز بیان ایسا نہیں۔ ہمارے زمانے میں اس کی دو مثالیں ملتی ہیں۔

امرؤ القیس کا معلقہ بڑا مقبول قصیدہ ہے۔ اس کا مطلع یوں ہے:

قفا نبك من ذكرىٰ حبيب و منزل
بسقط اللوى بين الدخول فحومل ❶

اس کو سامنے رکھ کر نواب صدیق حسن خان مرحوم نے قصیدہ لکھا۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے ۔

لسلمة دار بالدخول فحومل
عفى أيها نسبح الجنوب وشمال

پھر اسی وزن پر سارا قصیدہ لکھا جو عربیت کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ ان کے بعد مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اسی معلقہ کو سامنے رکھ کر ایک قصیدہ لکھا جس کا نام ''اعجازی قصیدہ'' رکھا۔ اس کا مطلع یوں ہے ۔

أيا أرض مدّ قد أتاك مدمر
وأرداك ضليل و أغراك موغر ❷

(اعجاز احمدی)

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں قصیدے امرؤ القیس کے قصیدے کو سامنے رکھ کر اسی طرز پر اسی بحر میں لکھے گئے ہیں۔

امام باقلانی کہتے ہیں کہ شعراء اور خطباء سابقہ اساتذہ کے کلاموں کو زیر نظر

❶ آؤ دخول اور حومل نامی جگہ پر محبوب اور گھر کی یاد میں روئیں۔
❷ اے ارض مد تمھارے پاس تباہ کرنے والا آیا ہے اور تمھارے پیچھے ہے گم گشتہ راہ اور تجھے غصہ دلایا ہے غصہ دلانے والے نے۔

رکھ کر مشق کرتے ہیں اور ان کی طرح پر اپنا کلام لکھا کرتے ہیں مگر قرآن مجید کسی سابقہ طرح یا طرز کا شرمندۂ احسان نہیں۔ چنانچہ امام موصوف کے اپنے الفاظ اسی عبارت کے ساتھ ہی یوں ہیں:

"فأما شأن نظم القرآن فليس له مثال يحتذى إليه، ولا إمام يقتدى به" (ص: ١٤٩)

یعنی قرآن کی یہ شان ہے کہ اس کے لیے سابقہ نظیر اور مثال نہیں ہے، نہ اس کا کوئی امام (استاد کلام) ہے جس کی پیروی کی گئی ہو۔

فرمائیے! امام موصوف قرآن کی بے نظیری کے قائل ہیں یا منکر؟ اس کے علاوہ قاضی باقلانی نے قرآن کی بے نظیری کا ایک باب مستقل لکھا ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

"ونحن نبين تميز كلامه وانحطاط درجة قولهم ونزول طبقة نظمهم عن بديع نظم القرآن في باب مفرد يتصور به ذوالصنعة ما يجب تصوره و يتحقق وجه الإعجاز فيه بمشيئة الله وعونه" (ج ١ ص: ١١٧، ١١٨)

"(ہم باقلانی) قرآن کی تمیز اور ان اساتذہ کے کلام کا تنزل ایک مستقل باب میں بیان کریں گے جس سے اہل فن اصل حقیقت جان لیں گے اور قرآن کا اعجاز اللہ کے حکم سے ثابت ہو جائے گا۔"

یہ ہے امام باقلانی کی رائے جس کو پادری صاحب نے حذف کرنے کے ساتھ ہی ان کی رائے کو تبدیل کر کے اپنے حق میں بتایا ہے۔

پادری صاحب! آپ کا یہ حق تو تھا کہ امام باقلانی کی رائے کو اصل الفاظ میں بیان کر کے اس کی تردید کرتے، مگر یہ حق تو آپ کا کسی طرح نہیں کہ ان کی اصلی شہادت

کو چھپا کر مصنوعی شہادت پیش کریں۔ کیا یہ شان محققین کی ہے یا متعصبین کی؟ آہ ؎

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا

یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا

نوٹ: ایک امر ناظرین کے ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے۔ عرب کے کلام میں استعارات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قریب الفہم جیسے قمر یا سورج کو محبوب کے لئے استعارہ کیا جائے۔ جیسے محبوبہ کو متنبی کہتا ہے ؎

أمن ازديارك في الدجى الرقباء

إذ حيث كنت من الظلام ضياء [1]

''اے محبوبہ! کوئی رقیب تجھے اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ تو جہاں ہوگی وہاں سورج ہوگا۔''

یہ استعارہ قریب الفہم اور مستحسن بھی ہے۔ اُردو میں بھی اس قسم کا استعارہ ملتا ہے۔ چنانچہ شاعر اپنے دوست کو سورج قرار دے کر لکھتا ہے ؎

وہ نہ آئیں شب وعدہ تو تعجب کیا ہے

رات کو کس نے ہے خورشید درخشاں دیکھا

نمکینیٔ کلام کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ مگر دوسری قسم کا استعارہ اس سے بہت دور ہے جس میں اس قسم سے بہت زیادہ غرابت (لطافت) پیدا ہوجاتی ہے، جیسے یہی متنبی کہتا ہے ؎

لم تلق هذا الوجه شمس نهارنا

إلا بوجه ليس فيه حياء [2]

---

[1] شرح ديوان المتنبي (ص: ٩٧)

[2] أيضاً (ص: ١٠٢)

''میرے ممدوح کا چہرہ ایسا روشن ہے کہ یہ دن کو طلوع کرنے والا سورج جب کبھی اس (ممدوح کے چہرے) کو ملا ہے بے حیائی کے ساتھ ملا ہے۔''

یعنی سورج کا میرے ممدوح کے سامنے آنا کمال بے حیائی ہے۔ کیونکہ میرا ممدوح اس سورج سے بدرجہا روشن ہے۔

اردو شاعر نے بھی اس قسم کے استعارہ میں محبوب کے منہ کو جزء لایتجزی (غیر منقسم جزء) قرار دے کر لکھا ہے ؎

تقسیم جزء لا یتجزیٰ کی ہوگئی
سہواً سخن جو ان کے دہن سے نکل گیا

شاعرانہ رنگ میں ایسا استعارہ غرابت اور پسندیدگی کی انتہا کو پہنچا ہوتا ہے، یہاں تک کہ صاحب مطول بھی چٹخارے لے کر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر قرآن مجید چونکہ مذہبی کتاب ہے اس لیے ایسے صریح کذب آلود استعاروں سے اگر اجتناب کرے تو اس کا فرض ہے اور پادری صاحب اس پر اعتراض کریں تو بلحاظ منکر قرآن ہونے کے ان کا حق ہے۔ کیوں؟ ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیب است
گل است سعدی و در چشم دشمناں خارست [1]

قرآن کی مثال:

سچ تو یہ ہے کہ قرآن کی فصاحت علوم خادمہ قرآن کی پابندی میں قرآن کو اصل زبان میں پڑھنے سے معلوم ہوسکتی ہے بیان میں نہیں آسکتی۔ ہم اس کی مثال میں دو استادوں کے کلام کا مقابلہ دکھاتے ہیں۔ دونوں اعلیٰ پایہ کے شاعر بلکہ استاد، دونوں کا مضمون ایک، مگر لطافت اور شیرینی میں نمایاں فرق۔ استاد بدرالدین چاچی

[1] عداوت کی آنکھ میں ہنر سب سے بڑا عیب ہے، سعدی پھول ہے مگر دشمنوں کی آنکھ میں کانٹا۔

جن کے قصائد بدر چاچ درسی کتب میں ہیں۔ ''در مدح سلطان گوید''۔

دوش چو شاہد حبش آئنہ در وہاں گرفت　　مطربہ پنج شعری را مہرسہ خواہراں گرفت
باسفید شد نہاں زاغِ سیاہ از طرب　　پرزدہ بیضہائے زرجملہ در آشیاں گرفت
ترک نسیج پوش مہ ترک کلاہ زرد گفت　　قطب چوزا طلسِ سیہ خرقہ طیلساں گرفت
قرص شکستہ مے نہد برسر سُفرہ بیشتر　　دور فلک کہ طشت زر از سر ہفتخواں گرفت
کرد سپاہ ترک رالشکر ہند منہزم　　مہ چوں خدائگاں ازاں ملک ہمہ جہاں گرفت
خیز کہ باز باز زر برسر چتر نیلگوں　　گشت پدید باز مرغ از غم دل فغاں گرفت
داشت در آستیں نہاں پارہ زرد آسماں　　صبح دریدہ جیب ازاں دامن آسماں گرفت
صبح چو تاج زر گرفت از کف خازن فلک　　سوئے جناب شاہ شدو روئے بر آستاں گرفت
پادشہ جسم اعتلاء احمد موسیٰ لقا　　آنکہ ہمائے چتراوبرسرمہ مکاں گرفت

(از قصائد بدر چاچ، ص:۲۱ در مدح سلطان)

استاد شیخ سعدی مرحوم۔ ''در مدح شاہزادہ گوئد''

جوان وجواں بخت روشن ضمیر　　بدولت جوان و بتدبیر پیر
بدانش بزرگ و بہمت بلند　　ببازد دلیر و بدل ہوشمند
زہے دولت مادر روزگار　　کہ رود چنیں پرورد درکنار
بدست کرم آب دریابرد　　برفعت محل ثریا ببرد
زہے چشم دولت بروئے تو باز　　ہمہ شہر یاران گردن فراز
صدف راکہ بینی زدُردانہ پُر　　نہ آنقدر دارد کہ یک دانہ دُر
تو آں در مکنون یک دانۂ　　کہ پیرایہ سلطنت خانۂ
نگہدار یارب بچشم خودش　　پرہیز زآسیب چشم بدش
خدایا در آفاق نامی کنش　　بتوفیق طاعت گرامی کنش

(از بوستاں باب اول)

ناظرین! شیخ سعدی اور بدرچاچ کا کلام آپ کے سامنے ہے۔ شیخ کا کلام کیسا آسان اور کیسا سلیس ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ واضح فرق ہے اساتذہ عرب اور کلام اللہ میں۔ سچ تو یہ ہے کہ بلاغتِ قرآن کی تصویر کھینچی نہیں جاسکتی۔ کیوں؟ ؎

گر مصور صورت آں دلربا خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چناں خواہد کشید ❶

دوزخ:

بلاغت پر طویل بحث سے فرصت پاکر پادری صاحب نے دوزخ و بہشت کا ذکر کیا ہے۔ دوزخ کے ذکر میں صفحہ (۸۷) سے صفحہ (۹۴) تک آٹھ صفحات خرچ کر دیے ہیں حالانکہ بات کچھ نہ تھی۔ کچھ وقت تو اس پر لگایا کہ دوزخ کا ذکر جن الفاظ میں قرآن شریف نے کیا ہے عرب کے مسیحی شاعروں نے بھی اسی طرح کیا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہونا قرآن شریف کی صداقت ہے یا بطالت؟ مسیحی شاعروں کو چھوڑیے ہم تو یہ بھی مانتے ہیں کہ انجیل میں بھی نار، دوزخ کا ذکر ہے۔

(ملاحظہ ہو: انجیل متی باب: ۵)

اس سے قرآن پر کیا اعتراض ؟ ہاں دبی زبان سے چبھتا ہوا اعتراض پادری صاحب نے یہ کیا ہے:

”قرآن شریف اور احادیث میں دوزخ کے متعلق جو بیان مذکور ہوا ہے وہ بظاہر بے حد دہشت ناک اور بے انتہا اندوہناک معلوم ہوتا ہے، اور پڑھنے والے کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن خدا اپنی صفت رحمیت کو سلب کر لیتا ہے، اور صرف وہ خدا رہ جاتا ہے جو سراسر انتقام لینے والا ہو، اور جس کی سنگدلی کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے بندوں کی آہ وفغاں، نالہ و بکا اور ان کے ان مصائب اور تکالیف سے جن کا ہم تصور

❶ اگر مصور نے اس دلربا کی تصویر کھینچنا چاہی تو مجھے حیرت ہے کہ وہ اس کے ناز کی کس طرح تصویرکشی کرے گا؟

بھی نہیں کر سکتے ہیں، کچھ بھی متاثر نہ ہو۔ لیکن جس گردن کش اور قاسی القلب قوم سے آنحضرت کو پالا پڑا تھا، ان کے طبعی خصائص کے اعتبار سے دوزخ کے بیان کو دہشت ناک نہیں بلکہ عبرت ناک سمجھنا چاہیے۔" (سلطان التفاسیر، ص:۹۵)

برہان:

ہم مانتے ہیں کہ واقعی ایسا ہے۔ لیکن اس خصوص میں انجیل کا بیان قرآن مجید سے بڑھ کر سخت ہے۔ دو حوالے غور سے سنیے۔ مسیح فرماتے ہیں:

"تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تو زنا نہ کر، پر میں تمھیں کہتا ہوں کہ جو کوئی شہوت سے کسی عورت پر نگاہ کرے، وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ سو اگر تیری دہنی آنکھ تیری ٹھوکر کھانے کا باعث ہو اُسے نکال اور اپنے پاس سے پھینک دے۔ کیونکہ تیرے انگوں (اعضا) میں سے ایک کا نہ رہنا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ تیرا سارا بدن جہنم میں ڈالا جائے۔" (انجیل متی ۵:۲۸)

اس حوالے کو دیکھیے کہ ایک نظر کرنے سے سارا بدن جہنم میں سڑتا ہے جس کے سڑنے کی مدت بھی کوئی نہیں۔ تو جن لوگوں نے عمر بھر شرک، کفر اور بدکاریاں کی ہوں، اس ایک دفعہ نظر کرنے والے سے کتنے درجہ گناہ عظیم کے مرتکب اور عذاب شدید کے مستوجب ہوں گے؟!

دوسرا ثبوت:

مجرموں کو سزا دینے میں انجیل ایسی سخت ہے کہ (بقول عیسائیاں) خدا کے بیٹے یسوع مسیح نے گناہ نہیں کیا لیکن بمنشائے خدا اس کی رحمت پوری کرنے کو مجرموں کا کفارہ بنا۔ اس حالت میں بھی اس کو اتنی سخت سزا ملی جس کا ذکر انجیل میں یوں ہے:

''یسوع نے پھر بڑے شور سے چلا کر جان دی، اور دیکھو ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر لڑک گئے اور قبریں کھل گئیں، اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھے اُٹھیں اور اس کے اُٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر اور مقدس شہر میں جا کر بہتوں کو نظر آئیں۔'' (متی ۲۷:۵۰)

فرمایئے! جس صورت میں خداوند تعالیٰ نے (بقول نصاریٰ) اپنے حقیقی بیٹے کو ناکردہ گناہ کی صورت میں بھی ایسی سخت سزا دی جس کا ہیبت ناک نظارہ اس اقتباس میں ملتا ہے تو دوسروں کی بابت کیا کچھ نہ ہوگا؟ فافہم

جنت:

دوزخ کے بیان سے فارغ ہو کر پادری صاحب نے جنت کی طرف رخ کیا تو صفحہ (۱۰۱) سے صفحہ (۱۰۹) تک جنت کے متعلق سر سید احمد خان، مولوی عبداللہ چکڑالوی، مولوی محمد علی لاہوری، مولوی عبدالحق حقانی دہلوی، مرزا صاحب قادیانی، امام رازی کے اقوال نقل کیے ہیں۔ جیسا ان صاحبوں کا مذاق مختلف ہے، ان کے اقوال بھی مختلف ہونے لازمی ہیں۔ مثلاً سر سید وغیرہ جنت کی نعماء کو جسمانی نہیں بلکہ روحانی کہتے ہیں۔ ان کے برخلاف امام رازی وغیرہ علمائے اہل حق نعماءِ جنت کو مادی مانتے ہیں۔ چنانچہ امام ممدوح کا قول آپ نے خود نقل کیا ہے۔ جو فرماتے ہیں:

''ترجمہ: لذتیں تین چیزوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ① مکان کے ساتھ ② خورد و نوش کے ساتھ۔ ③ اور شادی بیاہ کے ساتھ۔ مکان کے متعلق خدا نے فرمایا کہ ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ خورد و نوش کے متعلق فرمایا کہ ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ شادی بیاہ کے متعلق فرمایا کہ ﴿وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ

مُطَهَّرَةٌ﴾ چونکہ ان اشیاء کے حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے زائل ہونے کا بھی خوف تھا جس کی وجہ سے خوشی خاک میں مل جاتی تھی، اس لیے فرمایا کہ تمھارا خوف کرنا بے کار ہے کیونکہ ﴿وَ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ پس یہ آیت کمالِ نعمت اور سرور پر ایک زبردست دلیل ہے۔"

(تفسیر کبیر: ۱/ ۲۲۷)

ہم نہیں کہہ سکتے ان اقوال کے نقل کرنے سے سوائے واقفی جتانے کے اور کیا غرض ہوسکتی ہے؟ ورنہ کون سا دین اور کون سا مذہب ہے جس میں اس مذہب کے علما کا باہمی اختلاف نہیں؟ عیسائیوں میں تو اصول ایمان میں بھی اختلاف ہے۔ کیا پادری صاحب پر مخفی ہے کہ مسیح کے حق میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یونیٹیرین وغیرہ کا کہاں تک اختلاف ہے؟ پادری صاحب اگر بھولے ہوں تو اپنے محترم پادری اکبر مسیح اور پادری فنڈر کی تحریرات ملاحظہ کریں۔

ہاں! ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ اسلام کی کتاب (قرآن) اصل زبان میں آج ہمارے پاس ہے، اس کے جس مسئلہ پر بحث منظور ہو عربی زبان کے قواعد سے آپ قرآن کا صحیح مضمون سمجھ سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ انجیل تورات کی طرح ترجمہ در ترجمہ ہی ہمارے ہاتھ میں ہو اور پتہ نہ چلے کہ انجیل کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ کیونکہ دنیا کی کسی لائبریری میں انجیل کا اصل نسخہ نہیں ملتا۔ (تفسیر متی از پادری عمادالدین)

پس پادری صاحب جنت کی تحقیق کرنا چاہیں تو اقوال مختلفہ سے درگزر کر کے الفاظ قرآنیہ پر نظر ڈالیں۔

جنت کا تصور:

شکر ہے پادری صاحب نے اقوال مختلفہ نقل کرنے کی وجہ خود بتائی ہے:

"میں نے دوزخ اور جنت کے تمام متعلقہ امور کو نہایت تفصیل کے ساتھ

بیان کیا ہے تاکہ وہ تمام باتیں جن سے واقف ہونا ضروری ہے پڑھنے والوں کے زیر نظر رہیں۔ اب صرف دو باتیں اور بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں، وہ دو باتیں یہ ہیں:

① قرآن شریف میں جنت کا خیال کہاں سے آیا؟

② اور کتب مطہرہ جنت کے متعلق کیا تعلیم دیتی ہیں؟'' (ص:۱۱۰)

برہان:

اس کے بعد پادری صاحب نے چند اشعار عرب کے مسیحی شاعروں کے نقل کر کے لکھا ہے:

''قرآن شریف میں جنت کے جتنے مشہور نام آئے ہیں۔ مثلاً جنت، عدن، نعیم، خلد، مقام صدق، یہ تمام نام اشعار بالا میں موجود ہیں۔ نہ صرف اسماء موجود ہیں بلکہ جنت کی بعض نعمتوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً درختوں کے سائے، انار، سبزے، تکلیف کا نہ ہونا، اور تمام خواہشوں کا بدرجہ کمال پورا ہونا، اور اس میں لغو اور گناہ کا نہ ہونا، موت اور تکلیف دہ چیز کا نہ ہونا، وغیرہ۔ صرف حور اور قصور کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن شریف اور ان اشعار میں صرف یہ فرق ہے کہ اُس میں تفصیل ہے اور ان میں اجمال۔'' (ص:۱۱۱)

اس اقتباس میں آپ نے دبی زبان سے قرآن مجید کے بیان متعلقہ جنت کو مسیحی شاعروں سے ماخوذ بتایا ہے فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اگر کسی سابق عقیدہ کی موافقت کرے تو محل اعتراض ہے۔ بہت خوب! آگے چلیے۔ فرماتے ہیں:

''صحف مطہرہ اور جنت: صحف مطہرہ میں جنت کے کئی نام آئے ہیں۔ مثلاً ① آسمان کی بادشاہت۔ ② آسمانی میراث۔ ③ آسمانی

ملک۔ ④ فردوس۔ ⑤ ابراہیم کی گود۔ ⑥ پرانے عہد نامے میں جنت۔
⑦ اور عدن بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کا اطلاق دنیاوی باغوں پر ہوا ہے۔
اس بات کے سمجھنے کے لیے کہ صحف مطہرہ اور بالتفصیل انجیل میں جنت کا مفہوم یا اس کی ماہیت کیا ہے؟ آیات ذیل سے اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔
① جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں، نہ کانوں نے سنیں، نہ آدمی کے دل میں آئیں، وہ سب خدا نے اپنے محبت رکھنے والوں کے لیے تیار کر دیں۔
(ا۔ کرنتھیون ۲:۹)
② کیونکہ جب لوگ مُردوں میں سے جی اُٹھیں گے تو اُن میں بیاہ شادی نہ ہوگی بلکہ آسمان پر فرشتوں کی مانند ہوں گے۔ (مرقس ۱۲:۲۵)''
(ص: ۱۱۱، ۱۱۲)

اضافہ:

اس کے ساتھ ہی آپ نے مکاشفات (۲۱: ۱۔۴) اور مکاشفات (۲۲: ۱۔۵) اور مکاشفات (۷: ۱۳- ۱۷) نقل کی ہیں۔ ہم پادری صاحب کے حوالجات میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں۔ مسیح کے پاس منکرین قیامت نے آکر سوال کیے جن کے سوال و جواب کا ذکر یوں ہے:

''اسی دن صدوقی جو قیامت کے منکر ہیں اس کے پاس آئے اور اس سے سوال کیا کہ اے استاد موسیٰ نے کہا جب کوئی بے اولاد مر جائے تو اُس کا بھائی اس کی جورو کو بیاہ لے تاکہ اپنے بھائی کے لیے نسل جاری کرے۔ سو ہمارے درمیان سات بھائی تھے۔ پہلا بیاہ کر کے مر گیا اور اس سبب کہ اُس کی اولاد نہ تھی اپنی جورو اپنے بھائی کے واسطے چھوڑ گیا۔ یونہی دوسرا اور تیسرا بھی ساتویں تک۔ سب کے بعد وہ عورت بھی مر گئی۔ پس وہ قیامت میں ان ساتوں میں سے کس کی جورو ہوگی۔ کیونکہ سبھوں

نے اس سے بیاہ کیا۔ یسوع نے جواب میں ان سے کہا تم نوشتوں اور خدا کی قدرت کو نہ جان کر غلطی کرتے ہو۔ کیونکہ قیامت میں لوگ نہ بیاہ کرتے نہ بیاہے جاتے ہیں بلکہ آسمان پر خدا کے فرشتوں کی مانند ہیں۔"

(متی باب:۲۲، آیت:۲۳۔ تا ۳۰)

اس کے بعد پادری صاحب نے اپنا مافی الضمیر بتانے کو لکھا ہے:

"المختصر انجیل جلیل میں جنت یا دار الثواب کے متعلق جتنی آیتیں وارد ہوئی ہیں، ان میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہاں خواہشات نفسانی بھی پوری ہوں گی بلکہ اس کے برعکس انجیل جلیل کی ہر ایک آیت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دیدار الٰہی میں مستغرق رہنے اور ملکوتی صفات سے متصف ہونے کا نام جنت ہے۔ پس جنت وہ روحانی مقام ہے جس میں جسمانی خواہشات کا نام تک باقی نہیں رہتا۔" (ص:۱۱۲)

ناظرین! ہماری مشکلات کا اندازہ کریں، قرآن اگر عقائد سابقہ سے موافقت کرے تو محل اعتراض، اگر ان کے خلاف کہے تو بھی قابل ملامت۔ کیا خوب! یہی معنی ہیں ؎

دو گونہ رنج و عذاب ست جان مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ [1]

آپ نے دیکھا کہ انجیل میں جنت روحانی راحت کا نام ہے اور قرآن اس کے خلاف جنت میں جسمانی آرام بتاتا ہے۔

نوٹ: بلاغتِ قرآن کی بحث کی بابت بعض احباب نے شکایت کی تھی کہ عام فہم

---

[1] مجنون کی جان دو طرح کے رنج و عذاب میں مبتلا ہے، ایک لیلیٰ کی صحبت کی مصیبت اور دوسرے لیلیٰ کی جدائی کا عذاب۔

نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شکایت بجا ہے، واقعی وہ مضمون عام فہم نہیں تھا، چونکہ وہ ختم ہو گیا ہے، آئندہ عام فہم مضامین ہوں گے۔

فلسفیانہ رخ:

دو چیزیں جو ایک علت کی معلول ہیں ان میں مجانست ہوتی ہے، نار جہنم جس کا ذکر انجیل متی باب (۵) میں جو آیا ہے کہ بدنیت اپنی آنکھ نکال دے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ (اس سے اچھا ہے کہ سارا جسم آگ میں جلے) جہنم انسانی افعال قبیحہ کی معلول ہے اور یقیناً مادی سزا ہے۔ اس کے مقابلے میں جنت بھی انسانی اعمال صالحہ کی معلول اور نتیجہ ہے۔ پس لازمی ہے کہ وہ بھی مادی ہو، یہی قرآن کی تعلیم ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾

[الحاقة: ٢٤]

اے جنت میں رہنے والو کھاؤ پیو مزے سے بسبب ان کاموں کے جو تم نے پہلے ایام میں کیے۔"

پادری صاحب! سورج کا معلول ایک جگہ گرمی دوسری جگہ سردی کبھی ہوا؟ کیا آپ سے پہلے کوئی فلسفی اس کا قائل ہوا؟ سچ ہے ؎

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

دوسری نظر:

دوزخ اور بہشت انسانی اعمال کا نتیجہ ہیں اور انسانی اعمال انسانی زندگی میں ہوتے ہیں، اور انسانی زندگی میں جسم اور روح دونوں شریک کار ہوتے ہیں، جب دونوں شریک کار ہیں تو نتیجہ (دوزخ بہشت) میں بھی ان کا شریک ہونا ضروری ہے، ثابت ہوا کہ دوزخ بہشت مادی ہیں محض روحانی نہیں۔

پادری صاحب اور سید صاحب:

پادری صاحب نے المختصر لکھ کر انجیل جلیل کا جو مضمون متعلق جنت بتایا ہے وہ سید احمد خان سے بالکل ملتا ہے، غالباً اسی لیے پادری صاحب سر سید کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور ان کا کلام نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے:

"پیغمبر ﷺ نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابو ہریرہ کی سند پر بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

«قال اللّٰه تعالی: أعددت لعبادي الصالحین ما لا عین رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر»[1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیار کی ہے میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیز جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہے اور نہ کسی کان نے سنی ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے۔ پس اگر حقیقت بہشت کی یہی باغ اور نہریں اور موتی کے اور چاندی سونے کی اینٹوں کے مکان اور دودھ اور شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوبصورت عورتیں اور لونڈے ہوں تو یہ قرآن کی آیت اور خدا کے فرمودہ کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کو تو انسان جان سکتا ہے۔" (تفسیر سر سید سورہ بقرہ، ص:۳۱)

ناظرین! یہی مضمون قریب قریب مرزا صاحب قادیانی کا ہے، ہمیں شکایت ہونی چاہیے تھی کہ پادری صاحب ہم سے جدا ہو کر رقیبوں سے کیوں جا ملے جو معجزات مسیحیہ کے بھی منکر ہیں؟ باوجود اس کے ہم خوش ہیں۔ کیوں؟ ؎

میرے پہلو سے گیا پالا ستمگر سے پڑا
مل گئی اے دل تجھے کفران نعمت کی سزا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۷۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۲٤)

نوٹ:پادری صاحب عموماً کہا کرتے ہیں کہ قرآن کتب سابقہ کی نقل ہے۔شکر ہے کہ مسئلہ جنت میں تو نقل نہیں بلکہ اصل ہے۔له الحمد

اس کے بعد پادری صاحب نے قرآنی لفظ ازواج مطہرہ، اموات، اور استوی اِلی السماء کی لغوی تحقیق کی ہے جو قابل جواب نہیں۔ بعدازاں لکھا:

''قرآن میں اختلاف اور علما میں افتراق'':

''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدانے زمین پہلے بنائی اور آسمان کو اُس کے بعد بنایا۔لیکن سورہ نازعات میں آسمان کا پہلے بنایا جانا مذکور ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

﴿ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا۝وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾

[النازعات: ۲۷، ۳۰]

ان دو آیتوں کی وجہ سے خود مسلمان عالموں میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ زمین پہلے خلق کی گئی، اور بعض کہتے ہیں کہ آسمان پہلے پیدا کیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس و مجاہد وحسن وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ آسمان زمین کے بعد بنایا گیا، اور قتادہ، سدی، مقاتل اور بیضاوی وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ آسمانوں کو پہلے پیدا کیا گیا۔'' (تفسیر حقانی جلد دوم ص:۱۲۷)

برہان:

ناظرین! پادری صاحب کو سوامی دیانند کی طرح قرآن مجید پر نکتہ چینی کا شوق نہیں شغف ہے، اس لیے آپ بے دردی سے اعتراض کر دیتے ہیں۔ ہم بھی ان کو اس میں معذور جانتے ہیں بلکہ درخواست کرتے ہیں ؎

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

جناب! علماء کی رائے کے تو ہم ذمہ دار نہیں وہ خود اپنی آراء کے ذمہ دار ہیں۔ ہم تو قرآن مجید کا صحیح مطلب بتانے کو کھڑے ہوئے ہیں۔ آیت زیر بحث میں زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے ہے۔ آیت نازعات میں زمین کا پھیلاؤ آسمان کے بعد ہے۔ کسی چیز کی پیدائش پہلے ہو اور پھیلاوٹ پیچھے، اس میں کیا اختلاف؟ مثلاً آٹے کا پیڑا بنا کر ہم رکھ لیں، چاول پکا کر پیڑے کو پھیلا کر روٹی کی شکل بنا دیں تو دونوں جملے صحیح ہوں گے۔ پیڑا پہلے بنایا۔ چاول پہلے پکائے۔ اور روٹی پیچھے بنائی۔ اس تشریح کی تصدیق کے لیے ہم تیسری آیت نقل کرتے ہیں:

﴿ وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ ﴾ [الرعد: ٣]

''خدا نے زمین کو لمبا بچھا دیا اور اس میں پہاڑ پیدا کیے۔''

پس ان تینوں کا مفہوم متفق ہے، پس علما کی رائے جو قرآنی بیان کے خلاف ہے ہم اس کو چھوڑتے ہیں، آپ بھی اسے چھوڑ دیجیے، ہم تو قرآن مجید کے معتقد ہیں کسی مفسر کے نہیں۔ آئندہ اس کا لحاظ رہے ؎

بے چارہ خسرو خستہ را خوں ریختن فرمودہ اند
عالم بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف[1]

سورۃ بقرۃ رکوع ۴:

﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ

[1] بے چارہ خسرو زخمی کو خون بہانے کا کہا گیا، دنیا ایک طرف تھی اور وہ شوخ تنہا دوسری طرف تھا۔

لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ
يٰاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ
اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا
تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ
كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا
مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ
فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ
كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا
مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴿۳۹﴾

[البقرة: ۳۰ تا ۳۹]

ترکیب نحوی اور حل لغات:

﴿اِذْ﴾ ظرف متعلق "اذکر" یاد کر۔ ﴿جَاعِلٌ﴾ اسم۔ کرنے والا ہوں۔ ﴿خَلِیْفَةٌ﴾ حاکم، مراد انسان جو سب اشیا پر حکومت کرے اور ان کو استعمال کرے۔ ﴿اٰدَمَ﴾ مفعول اول۔ ﴿الْاَسْمَآءَ﴾ مفعول ثانی۔ ﴿کُلَّهَا﴾ تاکید۔ ﴿عَرَضَهُمْ﴾ کی ضمیر راجع ہے طرف مسمیان کے جو ضمناً ﴿الْاَسْمَآءَ﴾ میں مذکور ہیں۔ ﴿صٰدِقِیْنَ﴾

في دعوى علم الأشياء كلها. ﴿سُبْحٰنَكَ﴾ مصدر مضاف إلى ضمير المخاطب. أي: نسبح تسبيحك۔ ﴿مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ من تمني الخلافة. ﴿اِذْ﴾ متعلق اذكر. ﴿اسْجُدُوْا﴾ عظموا. آدم کی تعظیم کرو۔ ﴿كَانَ﴾ بمعنی صار. أي: ہوگیا کافر۔ ﴿اَنْتَ﴾ تاکید ہے ضمیر مستتر کی واسطے عطف ''زوج'' کے۔ ﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ مفعول بہ۔ ﴿لَا تَقْرَبَا﴾ بوجہ اشارہ قریب کے درخت کا نام بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ ﴿كَلِمٰتٍ﴾ مفعول: "تلقی". وہ کلمات یہ ہیں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ﴿فَتَابَ﴾ أي توجه برحمته على ادم. ﴿فَاِمَّا﴾ اصل میں إِنْ مَا. إن شرطیہ، ما زائدہ۔

ترجمہ: یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کو بطور اطلاع کہا کہ میں زمین پر ایک بڑا حاکم بنانے والا ہوں (یعنی ایک قوم پیدا کروں گا) جو میری سب اشیاء پر میری اجازت سے حکومت کرے گا۔ حاکم کا نام سن کر وہ اس عہدہ کے لیے دل میں للچائے اور بولے کہ کیا آپ ایسے لوگوں کو حاکم بنائیں گے جو اپنی طمع اور خواہشات نفسانیہ کی وجہ سے زمین میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ حضور ہم خادمان درگاہ آپ کو ہر قسم کے عیوب سے پاک کہہ کر تعریف کرتے ہیں اور حضور کے کمالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ خلعت حکومت ہم کو کیوں عطا نہیں فرماتے۔ خدا نے جواب میں کہا میں ہر کسی کی خاصیت اور طبعی حالت ایسی اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ نہیں جانتے میں جانتا ہوں کہ جس حکومت پر میں آدم اور اس کی اولاد کو بٹھانے والا ہوں تم اس کے اہل نہیں۔ اور فرشتوں نے چونکہ ضمناً ہمہ دانی کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کی تردید کرنے کے لئے آدم کو سب اشیاء کے نام سکھائے پھر ان اشیاء کو ان فرشتوں کے سامنے پیش کر کے کہا کہ مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم ہمہ دانی کے دعوے میں سچے ہو وہ بولے

اے خدا تو سب عیبوں سے جن میں ترجیح بلا مرجح بھی داخل ہے پاک اور بے عیب ہے ۔ حقیقت اصلیہ یہ ہے کہ ہم کو اپنا ذاتی علم بالکل نہیں ، لیکن جو کچھ تو نے ذرہ سا سکھایا ہے بس وہی حاصل ہے۔ ہمارے اس ناقص علم میں ان چیزوں کے نام نہیں تو پھر ہم بتائیں تو کیا کہیں تو کیا۔ تحقیق تو ہی سب کچھ جاننے والا بڑی حکمت والا ہے ۔ جب فرشتوں نے اپنے علم کے قصور کا اعتراف کیا تو خدا نے آدم کو کہا اے آدم تو ان فرشتوں کو ان چیزوں کے بلکہ خود ان کے نام بھی بتادے تاکہ انہیں اپنے نقصان علم کا پورا یقین ہو جائے۔ پھر جب آدم نے ان کو ان کے ناموں سے خبر دی تو خدا نے فرشتوں کو کہا کیا میں نے تم کو نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے مغیبات سب جانتا ہوں اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم لوگ میری پاکی بیان کرتے ہو اور جو دل میں اپنا حق خلافت بوجہ کمال علمی چھپاتے ہو ۔ یہ واقعہ جب یہاں تک پہنچا تو فرشتوں نے اپنے قصور علم کا اعتراف کیا۔ پھر کلام کا رخ دوسری طرف ہوگیا۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا چونکہ تم بمقابلہ آدم کے فیل ہوگئے ہو اس لئے تم آدم کی تعظیم تکریم کرو جیسی کسی عالم کی غیر عالم کیا کرتا ہے۔ پس سب نے تعظیم کی سوائے ابلیس کے کہ اس نے آدم کی تعظیم کرنے سے انکار اور تکبر کیا ۔ اور بجائے فرمانبردار ہونے کے کافروں سے ہوگیا اور ہم (خدا) نے کہا اے آدم تو اور تیری بیوی اس باغ میں جہاں تم کو رکھا گیا ہے رہو اور اس میں جہاں سے تم چاہو بخوشی پھل کھاؤ مگر اس ایک خاص درخت کے نزدیک بھی مت جائیو ورنہ خدا کے نافرمان اور اپنے نفس کے ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ۔ چونکہ شیطان ان کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا تھا اس لئے وہ ان کے درپے رہا کہ کسی طرح ان سے بدلہ لے پس شیطان نے ان سے

بے جا حرکت کرا کر اس باغ سے لغزش میں ڈال کر ان نعمتوں سے نکلوا دیا جن میں وہ دونوں آدم اور حوا رہتے تھے اور ہم نے کہا بس یہاں سے نکل جاؤ۔ تم یعنی تمہاری اولاد جو آیندہ پیدا ہونے والی ہے ایک دوسرے کی دشمن ہوگی۔ اور یہ دشمنی کی جگہ نہیں ہے بلکہ امن چین کا مقام ہے۔ اور تمہارے یعنی نسل انسانی کے لئے زمین پر ٹھکانا ہے۔ اور ہر ایک کے لئے ایک مقررہ وقت تک گزارہ ہوگا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل پوری ہوئی کہ آدم اور حوا دونوں اس باغ سے نکالے گئے۔ مگر آدم چونکہ فطرت سلیمہ رکھتا تھا اس لئے خدا کی طرف متوجہ رہا۔ پھر اس نے اپنے رب کی توفیق سے چند کلمات دعائیہ سیکھے تو خدا نے اس پر نظر عنایت کی یعنی اس کی توبہ قبول کر لی بے شک وہ خدا ہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اس نظر عنایت پر لازمی تھا کہ آدم جنت میں اپنا مکان مانگے۔ چنانچہ اس نے بحالی رتبہ کی درخواست کی تو ہم (خدا) نے کہا بس تم سب اس سے نکلے رہو۔ ہاں اب جنت میں مکان لینے کی یہی صورت ہے کہ میری طرف سے اگر تم انسانوں کو ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ خوف ہوگا نہ وہ کسی کھوئی ہوئی چیز پر غمگین ہونگے اور جو اس ہدایت سے منکر ہوں گے اور تکذیب کریں گے وہ جہنمی ہوں گے اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے ہمیں نظام عالم کے ایک اصول پر اطلاع دی ہے وہ اصول جدوجہد اور مقابلہ ہے جس کی طرف عرب کے مشہور شاعر متنبی نے اشارہ کیا ہے ؎

یا نکد الدنیا متی أنت مقصر

علی الحر حتی لا یکون له ضد [1]

[1] اے کمینی دنیا تو کبھی اس میں کمی نہیں کرتی کہ آزاد اور مصلح کے سامنے اس کی ضد کو لے آتی ہے۔ [مؤلف]

اس مقابلے میں عزت پانے اور کامیابی حاصل کرنے کا طریق صبر واستقلال ہے جس سے اپنے معاصرین پر تفوق حاصل ہوسکتا ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ لہ الحمد!

اعتراضات:

پادری صاحب نے ان آیات کا ترجمہ اور حل لغات کرنے کے بعد اپنے ناظرین کو مشغول رکھنے کے لیے بہت سے مشاغل پیدا کیے ہیں۔ مثلاً فرشتوں کی اقسام قرآن مجید میں کیا کیا آئی ہیں؟ مسیحی شعراءِ عرب نے کیا کہا ہے؟ سر سید احمد خان نے کیا فرمایا اور مرزا صاحب نے کیا بتایا وغیرہ نقل کر کے خود ہی محاکمہ کیا ہے:

> ''سر سید مرحوم کا یہ کہنا کہ ان (فرشتوں) کا کوئی وجود نہیں ہے اور مرزا صاحب قادیانی کا یہ کہنا کہ وہ کواکب کے اثرات ہیں سراسر غلط اور قرآن شریف کے منشا کے خلاف ہے۔'' (ص:۱۱۹)

ہم ان اندرونی مباحث سے تفسیر ثنائی میں فارغ ہو چکے ہیں۔ ''برہان'' میں ہمارا روئے سخن بیرون اسلام کی طرف ہے، چنانچہ اس کا حق ادا کیا جاتا ہے۔

قصہ آدم:

پادری صاحب نے حضرت آدم کی پیدائش کی روایات موقوفہ اور ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے جن کا مضمون یہ ہے کہ خدا نے حضرت آدم کا بت بنانے کے لیے ساری زمین سے مٹی لی تھی لیکن اس مضمون پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ ساری زمین سے مٹھی بھرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس مٹی میں زمین کے سارے حصوں کی تاثیر تھی۔ اس مفہوم کا ثبوت حدیث کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ بنی آدم مختلف اشکال اور مختلف عادات کے پیدا ہوئے۔

پادری صاحب نے اس عنوان پر بھی بحث کی ہے کہ حضرت آدم جس جنت

میں ٹھیرائے گئے تھے وہ زمین پر تھی یا آسمان پر؟ تفسیروں سے مختلف اقوال نقل کرکے ناظرین کو مشغول رکھا ہے۔ سب سے اخیر میں اپنے مطلب کی جو بات کہی ہے وہ ہمارے خیال میں قابل ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"مسلمان علماء کے بیانات کو آپ نے پڑھا، اور یہ بھی دیکھا کہ ان میں آدم والی جنت پر کس قدر اختلاف ہے۔ اور کس قدر متضاد خیالات ہیں، ان مختلف اور متضاد خیالات کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے صحف مطہرہ کی طرف رجوع نہیں کیا اور اپنے ہاں کی ضعیف بلکہ بے سند اور موضوع روایات پر اعتماد کیا۔ حالانکہ قرآن شریف نے بارہا تاکید کی ہے کہ جب تمھیں کسی امر میں شک ہو تو اہل کتاب کی طرف رجوع کرو کیونکہ ان کے پاس نور اور ہدایت ہے وہ تمھیں حق بات بتائیں گے اور ٹھیک راستہ پر چلائیں گے۔" (ص:۱۲۵)

برہان:

علماء کے مختلف اقوال سے آپ جلد کیوں گھبرا گئے؟ ان میں کئی ایک ایسے بھی ہیں جو آپ کے ہم زبان ہیں۔ بعض (ابوقاسم بلخی اور ابومسلم اصفہانی) کا نام تو آپ نے بھی لیا ہے، ہم بھی کچھ عرض کیے دیتے ہیں۔

مولانا نواب صدیق حسن خان مرحوم بھوپالی لکھتے ہیں:

"قيل هي جنة بأرض فلسطين ... وحمل الإهباط على النقل منها إلى أرض الهند كما في قوله تعالى ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا﴾ لما أن خلق آدم كان في الأرض بلا خلاف، ولم يذكر في هذه القصة رفعه إلى السماء، ولو وقع ذلك لكان أولى بالذكر والتذكير لما أنه من أعظم النعم، ولأنها لو

كانت دار الخلد لما دخلها إبليس"[1]

(تفسیر فتح البیان جلد اول زیر آیت: یٰآدم اسکن)

یعنی بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ باغ فلسطین میں تھا، ہبوط سے مراد ہے اس باغ سے نکل کر ہند میں آجانا، جب اس آیت میں ہبوط کے معنی نقل مکانی کے ہیں ﴿اهْبِطُوْ مِصْرًا﴾ (مصنف فتح البیان اس کی دلیل پیش کرتے ہیں) کیونکہ آدم کی پیدائش بالاتفاق زمین پر تھی، اور آسمان پر جانا اس قصہ میں کہیں مذکور نہیں، اگر آسمان پر گئے ہوتے تو ضرور ذکر ہوتا، کیونکہ وہ واقعہ بڑی نعمت تھا (جب آسمان پر جانا مذکور نہیں تو جنت آسمان پر کیسے ہوگی) دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر جنت بہشت موعودہ ہوتی تو شیطان اس میں داخل نہ ہوتا۔

کیسے صاف لفظوں میں آدم کی جنت کے زمین پر ہونے کا مدلل اعتراف ہے۔ اس پر بھی پادری صاحب خفا ہیں تو رحمدلی کی درخواست میں ہم ایک شعران کی نذر کرتے ہیں ؎

کیا نصیبا ہے ترا بلبل شیدا اُلٹا
رحم کی جا اُنھیں آجاتا ہے غصہ اُلٹا

ہاں جس آیت قرآنی کی طرف پادری صاحب نے اشارہ کرکے مسلمانوں کو مامور اور مجبور کیا ہے کہ درصورت شک ہونے کسی امر میں اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) سے پوچھا کریں۔ وہ آیت نقل کرکے شکی لوگوں کی طرف سے ہم پادری صاحب کی خدمت میں سوال کرکے منتظر ہیں کہ پادری صاحب اس سوال کا جواب کیا دیتے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ

[1] تفسیر فتح البیان (۱/ ۱۳۴۔ ۱۳۵)

يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ [یونس: ٩٤]

''(اے رسول) اگر تجھ کو ہماری اُتاری ہوئی کتاب سے کچھ شک ہے تو جو لوگ تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے آئے ہیں ان سے پوچھ لے (وہ تجھے بتا دیں گے کہ) تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا ہے۔ پس تو شک کرنے والوں میں نہ ہوجیو۔''

پادری صاحب نے لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کو حکم ہے جس بات میں ان کو شک ہو، اس کی بابت اہل کتاب سے سوال کریں۔'' گزشتہ پرچہ میں اس کے جواب میں آیت قرآنیہ لکھی گئی ہے جس میں ارشاد ہے کہ اگر تجھے قرآن کے بارے میں شک ہے تو پہلی کتاب والوں سے پوچھ لے، تو اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ قرآن حق ہے۔ اس کے بعد سوال ہے۔

پادری صاحب! فرمایئے کوئی شکی جو مشنریوں کی صحبت یا اغوا سے شک میں پڑ گیا آپ سے پوچھے کہ ''جناب! مجھے بتایئے قرآن مجید کی بابت میں کیا عقیدہ رکھوں؟'' کیا آپ اس کو اس کا جواب ایسا دیں گے کہ وہ یقین کر لے کہ قرآن سچی کتاب ہے؟

کیا آج دنیا میں کوئی پادری ہے جو ایسے شکی کو متیقن کر دے، آپ کو معلوم ہو تو بتایئے گا، اگر نہیں تو خود ہی فرمایئے کہ وہ کون لوگ تھے جن سے سوال کرنے کی بابت ارشاد ہے؟ ہم سے پوچھیں گے تو ہم آپ کو ان کا پتہ کسی نایاب کتاب میں نہیں بتاویں گے بلکہ قرآن کے ساتویں پارے کے شروع میں ان کا نشان آپ کو دکھا دیں گے۔ جس کے ابتدائی الفاظ یوں ہیں:

﴿ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ

مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ [المائدة: ۸۳]

''جب یہ (کتاب والے) لوگ سنتے ہیں وہ کلام جو رسول پر اُترا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ سچ کو معلوم کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں اے خدا ہم اس پر ایمان لائے پس تو ہم کو سچی شہادت دینے والوں میں لکھ لیجیو۔''

یہ ہیں وہ پہلے انسان جن سے پوچھنے کا ذکر ہے، نہ وہ جن کے حق میں ارشاد ہے:

﴿ وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرة: ۱۲۰]

''یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کے پیرو نہ ہو جاؤ گے۔''

پادری صاحب! ہر نکتہ مکانے دارد ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد [1]

گناہِ آدم:

پادری صاحب نے اس ذیل میں حضرت آدم کے گناہ پر بحث کی ہے، گناہ سے تو انکار کسی کو نہ ہوگا قرآن مجید میں صاف مذکور ہے:

﴿ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۱۲۱]

''آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی وہ بہک گیا۔''

[1] نہ ہر عورت عورت ہوتی ہے نہ ہر مرد مرد، خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں کیں۔

لیکن پادری صاحب کا منشا اتنے سے پورا نہیں ہوسکتا، بلکہ آپ کا منشا یہ ہے کہ آدم نے زمانۂ نبوت میں گناہ کیا تھا، اس لیے بقول عیسائیاں کل انسان انھی میں انبیاء کرام بھی گناہگار ہیں۔ اس بات کا ثبوت ان کے ذمہ ہے کہ حضرت آدم کا فعل عصیان زمانہ نبوت میں تھا۔ کیونکہ علمائے اسلام میں سے بہت سے حضرات اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت آدم کا فعل قبل نبوت تھا۔ ثبوت اس کا قرآن مجید سے یوں ملتا ہے کہ عصیان آدم کے بعد متصل ہی یوں ارشاد ہے:

﴿ ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَ هَدٰى﴾ [طٰهٰ: ۱۲۲]

''پھر خدا نے اسے چن لیا اور توبہ قبول کی اور ہدایت کی۔''

یہ اجتباء درجہ نبوت ہے، اس سے پہلے آدم نبی نہ تھے، ہاں احکام الٰہیہ کے مخاطب تھے، جیسے ﴿كُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا وَ لَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ یہ احکام ان کی ذات خاص کے لیے تھے۔ نبی کی تعریف یہ ہے کہ وہ مخلوق کو ہدایت کرنے کے لیے مامور الٰہی ہوتا ہے۔ پس آدم کے جملہ افعال کا جواب اسی میں آ گیا کچھ ضروری نہیں کہ ہم ان افعال کی تاویل کریں۔

ہاں عیسائیوں نے آدم اور حوا کے گناہوں کو یہاں تک بڑھایا ہے کہ ان کی سزا میں ناکردہ گناہ ساری اولاد کو بھی داخل سمجھتے ہیں۔ تورات میں حضرت آدم کے گناہ اور سزا کا ذکر یوں ہے:

''آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اُس درخت سے دیا اور میں نے کھایا، تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا، عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا، اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس واسطے کہ تو نے یہ کیا ہے تو سب مواشیوں اور میدان کے سب جانوروں سے ملعون ہوا۔ تو اپنے پیٹ

کے بل چلے گا اور عمر بھر خاک کھائے گا، اور میں تیرے اور عورت کے اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان دشمنی ڈالوں گا، وہ تیرے سر کو کچلے گی اور تو اُس کی ایڑی کو کاٹے گا، اُس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے کہا اس واسطے کہ تو نے اپنی جورو کی بات سُنی اور اُس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اُس سے مت کھانا زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اُگاوے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا۔ تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جاوے۔'' (کتاب پیدائش باب ۳، ۱۲ تا ۱۹)

برہان:

اس عبارت میں صیغہ تو مخاطب مفرد کا ہے مگر عیسائی اس کی تشریح میں ساری اولادِ آدم کو شریک کرتے ہیں، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اولاد ناکردہ گناہ کو بھی داخل سزا کیا گیا ہے، لطف یہ ہے کہ سزا بھی ایسی ہے کہ اس سے نہ کافر چھوٹے نہ مومن، کیونکہ ہر مرد مومن ہو یا کافر محنت سے کھاتا ہے، ہر عورت کافرہ ہو یا مومنہ تکلیف سے بچہ جنتی ہے، یہ اچھا گناہ ہے کہ کسی طرح چھوٹتا ہی نہیں، نہ توبہ سے نہ کفارہ مسیح سے، حالانکہ بقول مسیحیاں مسیح نے کفارہ بن کر سارے مجرموں کے گناہ اُٹھا لیے مگر یہ وراثتی گناہ معاف نہ ہوا۔ تو کیا ایسے لوگوں کے حق میں یہ صادق نہ آیا:

''تیلی بھی کیا اور روکھا کھایا۔''

پیدائش آدم:

پادری صاحب نے اس موقع پر حضرت آدم کی پیدائش قرآن اور تورات سے بالمقابل دکھائی ہے جو بہت سے الفاظ میں مختلف ہے۔لیکن پادری صاحب نے اس پر کوئی اظہار رائے نہیں کیا۔ ہم ان کا مقصد جانتے ہیں۔آپ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ قرآن چونکہ تورات سے مختلف ہے اس لیے قرآن کا بیان غلط ہے۔ جواباً ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے دو منصب ہیں:

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾

یعنی قرآن مجید پہلی کتاب کی تصدیق کرنے والا بھی ہے اور اس پر نگران بھی۔

پس اس کے دو منصبوں میں سے دوسرے منصب کا فرض ہے کہ بائبل کے غلط مضامین کی نگرانی کرے، سو اس کی نگرانی دو طرح سے ہوتی ہے۔کبھی تو کھلے الفاظ میں تردید کرتا ہے، جیسے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ [المائدة: ۷۳]

یعنی خدا کی شان میں تثلیث کا اعتقاد رکھنا کفر ہے۔

کبھی نگرانی اس طرح کرتا ہے کہ ناپسندیدہ مضامین کو اپنے بیان میں درج نہیں کرتا۔آدم وحوا کا قصہ اسی قسم سے ہے، بہر حال پادری صاحب کی منقولہ عبارت یہ ہے۔

نوٹ: اس عبارت میں جتنی عبارت قرآن کی مصدقہ نہیں اس پر ہم نے لکیر کھینچ دی ہے۔ناظرین بغور پڑھیں:

''① تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں کہ وہ سمندر کی مچھلیوں پر اور آسمان کے پرندوں پر اور مواشیوں پر اور تمام زمین پر اور سب کیڑے مکوڑوں پر جو زمین پر رینگتے ہیں سرداری کریں۔ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔

نرو ناری ان کو پیدا کیا۔ اور خدا نے اُن کو برکت دی، اور خدا نے انہیں کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو، اور اُس کو محکوم کرو اور سمندر کی مچھلیوں پر اور آسمان کے پرندوں پر اور سب چرندوں پر جو زمین پر چلتے ہیں سرداری کرو۔ (پیدائش ۱: ۲۶۔ ۲۸)

اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اُس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ سو آدم جیتی جان ہوا۔

اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا۔ اور آدم کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ (پیدائش ۲: ۷۔ ۸)

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اُسکی باغبانی اور نگہبانی کرے، اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر۔ لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا۔ کیونکہ جس دن تو اُس سے کھائے گا تو ضرور مرے گا۔ (پیدائش ۲: ۱۵۔ ۱۷)

④ اور خداوند خدا نے میدان کے ہر ایک جانور اور آسمان کے پرندوں کو زمین سے بنا کر آدم کے پاس پہنچایا تا کہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھے۔ سو جو آدم نے ہر ایک جانور کو کہا وہی اُس کا نام ٹھیرا۔ اور آدم نے سب مواشیوں اور آسمان کے پرندوں اور ہر ایک جنگلی جانور کا نام رکھا۔ پر آدم کو اس کی مانند کوئی ساتھی نہ ملا۔ اور خدا وند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا۔ اور اُس نے اُس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اُس کے بدلے گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اُس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں

سے گوشت ہے اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ (پیدائش ۲: ۱۹۔۲۳)

① اور سانپ میدان کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند خدا نے بنایا تھا ہوشیار تھا۔ اور اُس نے عورت سے کہا کیا یہ سچ ہے کہ خدا نے کہا کہ باغ کے درخت سے نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل ہم تو کھاتے ہیں مگر اُس درخت کے پھل کو جو باغ کے بیچوں بیچ ہے خدا نے کہا کہ تم اُس سے نہ کھانا اور نہ اُسے چھونا ایسا نہ ہو کہ مر جاؤ۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مروگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن اُس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے ہوگے۔ اور عورت نے جوں دیکھا کہ وہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا۔ اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ہم ننگے ہیں۔ اور اُنہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔ (پیدائش ۳: ۱۔۷)

برہان:

پادری صاحب سے ہمارا اتصال ہونے کو ہے، آپ مہینہ میں صرف ایک جزء تفسیر دیتے ہیں، اکتوبر کے المائدہ میں نصف جزء دیا اس لئے ہم اپنی اور اپنے ناظرین کی طرف سے درخواست کرتے ہیں کہ عربی گھوڑا تیزی سے پیچھے آرہا ہے، افغانی گھوڑے کو ایڑ لگا کر ذرہ تیز کر دیجئے زندگی کا اعتبار نہیں۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید[1]

پادری صاحب نے اگر ہماری درخواست منظور کر کے فی رسالہ کم سے کم دو جزء نہ کیے تو لاچار ہم بجائے ایک ورق کے برہان کا ایک صفحہ کر دیں گے۔ تاکہ وقفہ نہ ہو جائے۔

اگلا حصہ:

نوٹ: گزشتہ پرچہ میں قصہ آدم ازمروجہ توزات منقولہ پادری صاحب نقل ہوا ہے۔ اس کو ناظرین مستحضر کر کے اگلا حصہ پڑھیں:

"تب خداوند نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا ہوں اس لئے میں نے آپ کو چھپایا، اور اُس نے کہا تجھے کس نے جتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اُس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اس سے نہ کھانا۔ اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس واسطے کہ تو نے یہ کیا ہے تو سب مواشیوں اور میدان کے سب جانوروں سے ملعون ہوا، تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا، اور عمر بھر خاک کھائے گا، اور میں تیرے اور عورت کے اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان دشمنی ڈال دوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گی اور تو اس کی ایڑ کو کاٹے گا۔ اور آدم سے کہا اس واسطے کہ تو نے اپنی جورو کی بات سنی اور اِس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، اور تکلیف

[1] سفید پر سیاہ لکھا رہتا ہے لکھنے والے کو کل اس کی امید نہیں۔

کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا، اور وہ تیرے لئے کانٹے اور
اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا۔ تو اپنے منہ
کے پسینہ کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے کہ تو
اس سے نکالا گیا ہے کہ تو خاک ہے اور پھر خاک میں جائے گا۔
(پیدائش ۳: ۹، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۹) (سلطان التفاسیر، ص: ۱۴۰)

برہان:

پادری صاحب نے دیکھا کہ حضرت آدم کے بہکانے میں تورات کے اندر سانپ وغیرہ کا ذکر بھی ہے جسے منزل قرآن نے متروک رکھا ہے۔ اس لیے آپ نے یہ کسر نکالنے کو تفسیر طبری سے وہ روایت نقل کی جس میں سانپ وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ہم اس کے جواب کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے کیونکہ مقابلہ تورات اور قرآن کا ہے نہ کہ روایات کا۔

پادری صاحب کو یاد رہے کہ محدثین کا مقررہ اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ اسرائیلی روایات شرعی سند نہیں بلکہ جو صحابی ایسی روایات بیان کرتا ہو اس کی روایت موقوفہ کسی طرح مرفوعہ کے حکم میں نہیں ہوسکتی۔ (شرح نخبہ وغیرہ)[1]

پس جن باتوں کو قرآن مجید نے اس قصہ میں متروک کیا ہے وہ اسی قابل ہیں کہ اُن کو متروک ہی کیا جائے۔ کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں قرآن مجید کے دو منصب ہیں۔ اول: ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ﴾۔ دوم: ﴿مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ ''مہیمن'' کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ سابقہ اغلاط کی اصلاح کرے۔ جس کی ہم نے دو صورتیں بتائی ہیں۔ کبھی تو اس طرح کہ وہ غلط خیال کو نقل کر کے تردید کر دیتا ہے۔ کبھی عدم ذکر سے ناقابل ذکر ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید!

[1] نزهة النظر في شرح نخبة الفكر (ص: ١٣٣)

رکوع ۵:

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ
اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَ اٰمِنُوْا
بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ وَ
لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَ لَا
تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا
لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرة: ٤٠، ٤٦]

حل لغات وترکیب نحوی:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں۔ ﴿اَنْزَلْتُ﴾ کا مفعول بہ محذوف ہے۔ أي: أنزلته. ﴿مُصَدِّقًا﴾ ضمیر منصوب محذوف سے حال ہے۔ ﴿اَوَّلَ﴾ خبر "تکونوا" کی ہے۔ اسم "تکونوا" جمع اور خبر مفرد ہے۔ اسم تفضیل میں یہ جائز ہے، جیسے نحن أعلم۔ ﴿لَا تَشْتَرُوْا﴾ میں "اشتری" بمعنی "أخذ" لینا ہے۔ اتقا: میں خوف خدا مع پرہیز از گناہ ضروری ہے۔ لبس حق بالباطل: کے معنی ہیں ملا جلا کر بات کرنی، کچھ سچ کچھ جھوٹ۔ کتمان حق: سچ کو بالکل چھپا جانا۔ رکوع: کے معنی ہیں دل سے خدا کے احکام کی اطاعت قبول کرنا۔ نماز کا رکوع بھی اسی کا ایک فرد ہے۔ ﴿بِالْبِرِّ﴾ نیکی اخلاقی صورت کی ہو

جیسے حق گوئی، حق پسندی، راست روی، ادائے حقوق انسانیہ یا عام اخلاقی اور مذہبی بہر دو قسم۔ اپنے نفسوں کو بھلانے سے مراد ہے بے عملی میں مبتلا رکھنا۔ "استعانة بالصبر": تکلیف میں نہ گھبرانا بلکہ مستقل رہنا۔ "استعانة بالصلوة" نماز میں رفع تکلیف کی دعا کرنا۔ ﴿الْخٰشِعِيْنَ﴾ وہ لوگ جن کو ہر قدم پر خدا کا خوف ہو۔ "الظن" گمان غالب۔ معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کی اکثر حالت خدا کے خوف میں گزرتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہم خدا سے اس طرح ملے ہوئے ہیں جس طرح معلول علت سے ملا ہوتا ہے، جیسے دھوپ سورج سے، اسی طرح ہم خدا کے حکم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ بھی ان خاشعین کو علم ہوتا ہے کہ ہم اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں وہی ہمارا خالق ہے وہی ہم کو باقی رکھنے والا ہے وہی فنا کرنے والا۔

ترجمہ: اے اسرائیل کی اولاد میری (خدا کی) نعمت یاد کرو جو تم پر میں نے انعام کی تھی تمہارے سردار موسیٰ کو اُس دشمن (فرعون) کے گھر میں پرورش کرایا، تم کو اسی موذی سے نجات دلائی اور میرا وعدہ پورا کرو جو تم نے موسیٰ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی معرفت اطاعت اور فرمانبرداری کا مجھ (خدا) سے کیا تھا، میں اپنا وعدہ تم سے پورا کروں گا، یعنی فرمانبرداری پر جو کچھ انعام دینے کا وعدہ ہوا ہے دوں گا۔ اور ایفاءِ عہد میں کسی مخلوق کا لحاظ نہ کرو بلکہ خاص مجھ ہی سے ڈرو۔ سنو! ایفاءِ عہد کی میں تصریح کئے دیتا ہوں کہ دین اسلام قبول کرو اور اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاؤ جو میں (خدا) نے تمام بندوں کی ہدایت کے لئے اتاری ہے جو تمہاری ساتھ والی کتاب کی اصل مضمون میں تصدیق کرتی ہے پھر تمہیں اس کے ماننے میں کیا عذر ہے۔ اور سنو! علم دار قوم میں سے تم ہی سب سے پہلے اس کے انکاری نہ بنو اور میری آیات کے بدلے میں یعنی میرے منزلہ احکام کو چھپا کر تھوڑے تھوڑے دام دنیاوی مطالب کے لیے حاصل نہ کیا کرو۔ پس میں

پھر تم سے کہتا ہوں کہ حق پسندی میں کسی انسان سے مت ڈرو بلکہ خاص مجھ سے ڈرو اور سنو! سچ جھوٹ باہم ملایا نہ کرو کسی سائل نے چند مسائل پوچھے کچھ سچ بتا دیے کچھ اس کی رضا جوئی کو جھوٹ بتا دیے اور جان بوجھ کر سچ کو چھپاؤ نہیں اور سنو! نماز فرض اسلام پوری طرح مستعدی سے ادا کیا کرو اور مال کی زکوۃ باقاعدہ دیا کرو اور خدا کی طرف جھکی ہوئی جماعت مومنین کے ساتھ خدا کی طرف جھک جاؤ بس دنیاداری کی باتیں چھوڑ دو۔ بھلا غور تو کرو لوگوں کو اچھے کام بتاتے ہو جو تم کو تورات اور دیگر صحف انبیاء میں سکھائے گئے ہیں اور اپنے آپ کو ان احکام کے عمل سے غافل رکھتے ہو۔ حالانکہ تم آسمانی کتاب پڑھتے ہو جس میں ایسا کرنا بُرا لکھا ہے اور ایسا کرنے والوں کا انجام برا بتایا ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ خدا کا قانون عام ہے جو اس کو توڑے گا خدا اس سے مواخذہ کرے گا۔ ہاں ایسی سیدھی روش اختیار کرنے میں تم لوگوں کو تکلیف پہنچے تو صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد مانگا کرو۔ کیا تم نے شیخ سعدی کا قول نہیں سنا ؎

چو رو مے نگردد خدنگِ قضا
سپر نیست مر بندہ را جز رضا [1]

ہاں اس میں شک نہیں کہ صبر اور نماز کے ساتھ استعانت کرنا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کی گھبراہٹ اور واویلا کرنے کی اجازت نہیں نہ کسی انسان کے سامنے زبان شکایت کھولنے کا موقع لیکن جو خدا کے حضور میں عاجز ہیں ہر وقت اس سے ڈرتے اور رحمت کی امید رکھتے ہیں ان پر یہ احکام مشکل نہیں۔ چونکہ ہر کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں بھی ایسا ہی ہوں اس لیے ہم ہی بتائے دیتے ہیں کہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ ہم اپنی ناچیز ہستی میں خدا سے ملے ہوئے ہیں اور بقا میں اسی کی طرف

[1] جب بندہ قضا کا تیر دیکھتا ہے تو پھر رضا کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

رجوع ہیں جب تک وہ موجود رکھے گا رہیں گے جب فنا کر دے گا فنا ہو جائیں گے۔ غرض ان کا دلی اعتقاد ہے ۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

سورہ بقرہ کے پانچویں رکوع کا ترجمہ مع تشریح ختم ہوا۔ آج پادری صاحب کے اعتراضات پر توجہ کی جاتی ہے۔

اعتراضات:

پادری صاحب مفسرین قرآن پر بہت خفا ہیں کہ انہوں نے وعدہ الٰہی اور وعدہ اسرائیلی کی تلاش کتب سابقہ میں نہیں کی بلکہ ادھر اُدھر کی باتیں بناتے رہے۔ آپ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

''قرآن شریف کے مفسرین کی یہ عادت ہے کہ جہاں کہیں بنی اسرائیل یا اہل کتاب کا ذکر آتا ہے، یا ان کے کسی واقعہ کا بیان ہوتا ہے وہ ان واقعات کے اصلی ماخذ یعنی صحف مطہرہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے فرضی اور قیاسی خیالات یا ادھر اُدھر کی ضعیف اور بے اصل روایات سے تفسیروں کو بھر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسی آیت ﴿اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ کو لیجیے۔ تمام تفاسیر کو چھان ماریئے کسی تفسیر سے آپ کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ خدا نے بنی اسرائیل سے کیا عہد کیا تھا اور بنی اسرائیل نے خدا سے کیا عہد کیا تھا۔'' (ص:۱۴۴)

یہ تو ہوا اظہار خفگی ۔ پھر آپ ہی لکھتے ہیں:

''امام فخرالدین رازی نے ان تمام روایات کو جو اس معاہدہ کے متعلق ہیں ایک جگہ جمع کیا جو ازیں قرار ہیں کہ:

① اس سے مراد وہ تمام باتیں ہیں جن کے متعلق خدا نے حکم دیا ہے۔
② اگر بنی اسرائیل خدا کی بیان کردہ نعمتوں پر شاکر ہیں تو خدا ان کو جزا دے گا۔
③ حسن کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جو اس آیت میں ہے کہ ﴿وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا﴾ اور یہ کہ ﴿لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ﴾ اِلٰی قولہ ﴿وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾
④ جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد خدا کی فرمانبرداری و ترک معاصی ہے اور جنت میں داخل کرنا ہے۔
⑤ اس عہد سے مراد آنحضرت پر ایمان لانا ہے۔ (تفسیر کبیر جلد اول ص:۳۱۹)
(سلطان التفاسیر، ص: ۱۴۴)

برہان:

ہم نہیں جان سکتے کہ علما مفسرین نے اس بیان میں کیا غلطی کی؟ ان تمام نمبرات کا مضمون درحقیقت ایک ہی ہے کہ خدا کے احکام کی حفاظت اور تعمیل کرو جیسا کہ تم بنی اسرائیل نے اقرار کیا ہوا ہے، اور میں اس کا بدلہ دوں گا، جیسا کہ میں (خدا) نے وعدہ کیا ہوا ہے۔ چنانچہ مروجہ تورات کی تیسری کتاب (احبار) میں لکھا ہے:

''اگر تم (بنی اسرائیل) میری شریعتوں پر چلو گے اور میرے حکموں کو حفظ کرو گے اوران پر عمل کرو گے تو میں تمھارے لیے وقت پر مینہ برساؤں گا، اور زمین اپنی بڑھتی تم کو دے گی اور بعد ان کے درخت اپنے پھل تم کو دیں گے۔'' (احبار باب ۲۵:۳)

کیسا صاف حکم ہے اور کس قدر واضح وعدہ الٰہی ہے؟

آیئے! اب ہم آپ کو بتائیں کہ قرآن شریف نے بھی یہی فرمایا ہے۔ غور سے سنیے!

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ

رَّبِّهِمْ لَاَ كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ﴾ [المائدة: ٦٥]

''اگر اہل کتاب تورات، انجیل اور کل کتب الہیہ میں مذکورہ احکام کی تعمیل کرتے تو فراواں رزق کھاتے۔''

ناظرین! کیا یہ بعینہٖ وہی مضمون نہیں جو ''احبار'' کی عبارت کا ہے؟ کیا یہ وہی مضمون نہیں جو تفسیر کبیر سے پادری صاحب نے نقل کیا ہے؟ ہاں قرآن شریف کی مذکورہ آیت سے پہلے ایک آیت یوں بھی مذکور ہے:

﴿لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ [المائدة: ٦٥]

''اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم اُن کے گناہ دور کردیتے۔''

یہ وہ مضمون ہے جس کو عبارت منقولہ از تفسیر کبیر کے نمبر (۵) میں پادری صاحب نے دکھایا ہے، تورات مروجہ میں اس کا ثبوت بھی ملتا ہے مگر تورات سے ہم عبارت نقل نہیں کرتے، کیونکہ پادری صاحبان کو اس کی تاویل کرنے میں تکلیف ہوگی، بلکہ ہم ایسی عبارت نقل کرتے ہیں جس میں تورات کی عبارت مصدقہ ہو کر آجائے گی، اور تاویل کی گنجائش بھی نہ ہوگی۔

حضرت مسیح کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کا ایک شاگرد اپنے حاضرین کو وعظ کہتا ہے:

''پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آویں اور یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی۔ ضرور ہے کہ آسمان اُسے لئے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک

نبیوں کی زبانی شروع کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھاوے گا، جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو، اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اُس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا، بلکہ سب نبیوں نے سموئیل سے لے کے پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دنوں کی خبر دی ہے۔ تم نبیوں کی اولاد اور اُس کے عہد کے ہو جو خدا نے باپ دادوں سے باندھا ہے۔ جب ابرہام سے کہا کہ تیری اولاد سے دنیا کے سارے گھرانے برکت پاویں گے، تمہارے پاس خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو اٹھا کے پہلے بھیجا کہ تم میں سے ہر ایک کو اس کی بدیوں سے پھیر کے برکت دے۔'' (رسولوں کے اعمال باب ۳: ۱۹ تا ۲۶)

کچھ شک نہیں کہ یہ وعظ حضرت مسیح کے دنیاوی انتقال فرمانے کے بعد ہے کیونکہ لکھا ہے کہ ''یسوع مسیح کو پھر بھیجے''۔ اس سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ اس گفتگو سے پہلے مسیح ایک دفعہ آچکے ہیں۔ پھر فرمایا ہے کہ مسیح دوبارہ دنیا میں نہیں آسکتے جب تک نبیوں کی بتائی ہوئی سب باتیں پوری نہ ہولیں۔ منجملہ ان باتوں کے جن کا مسیح کی دوبارہ تشریف آوری سے پہلے واقع ہونا لابدی ہے، ایک بنی کا آنا ضروری ہے، جس کی بابت حضرت موسیٰ نے خبر دی تھی۔ پھر کہا کہ خدا نے مسیح کو اس موعود نبی سے پہلے بھیجا تھا تا کہ لوگوں کو اس آنے والے نبی کی مخالفت سے ہٹا کر برکت دے۔

ناظرین! یہ عبارت ہم نے اس لیے نقل کی ہے کہ پادری فنڈر اور پادری عمادالدین وغیرہ نے تورات کی مذکورہ پیش گوئی کو حضرت مسیح پر چسپاں کرنے کی سعی کی ہے۔ ہماری پیش کردہ عبارت قطعاً اس سے انکار کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی پیشگوئی حضرت مسیح پر لگائی جائے۔

پادری صاحبان! پطرس کی مذکورہ عبارت سے یہ تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی پہلی اور دوسری تشریف آوری کے وقفہ میں موسیٰ کا موعود اور موسیٰ کی مانند کوئی نبی آنے والا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا نبی ہے؟

ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ یوحنا (حضرت یحییٰ) کو یہودیوں نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں مسیح نہیں۔ میں الیاس نہیں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ (انجیل یوحنا ۱:۲۰)

اس عبارت میں ''وہ نبی'' سے پیغمبر اسلام مراد نہیں تو کون مراد ہے جو مسیح اور الیاس کے سوا ہے؟

لطیفہ:

کہیں جلدی میں مرزا صاحب قادیانی کا نام نہ لے دیجیے گا!!

پس یہ ہے نمبر(۵) کی شہادت حقہ جس کی بنا پر مفسرین نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل کا وعدہ آنحضرت پر ایمان لانا ہے۔ ہم دور کیوں جائیں خود قرآن مجید کی آیات زیر تفسیر ہی کو دیکھ لیجیے:

﴿ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ [البقرة: ٤١]

اس آیت میں ''مصدق'' کا لفظ پیش کر کے ایمان کا حکم دینا اسی بنا پر ہے کہ پیغمبر اسلام مثیل موسیٰ ہونے کی وجہ سے تمہاری تورات کے مصدق ہیں، مکذب نہیں۔

ان صاف اور صریح عبارتوں کو چھوڑ کر پادری صاحب نے جو دوسری طول طویل عبارتیں بائبل سے نقل کی ہیں وہ ہمارے مخالف نہیں، بلکہ ایک معنی سے مؤید ہیں۔ مگر پادری صاحب نے کچھ اظہار کیا اور کچھ اخفا۔ جتنی عبارتیں نقل کی ہیں وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلقہ وعدہ کی اور ان کی نسل کو برکت دینے کی ہیں۔ لیکن تفصیل کرتے ہوئے ساری توجہ بنی اسرائیل کی طرف پھیر رکھی ہے۔ حضرت

ابراہیم کے دوسرے (بلکہ بڑے) بیٹے اسماعیل کے متعلق ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے حق میں صاف صاف الفاظ ملتے ہیں۔ خدا نے حضرت ابراہیم کو فرمایا:

''اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اُس سے بڑی قوم بناؤں گا۔'' (تورات کی پہلی کتاب پیدائش ۱۷: ۲۰)

خدا اپنے پیارے مقبول بندے بلکہ اولوا العزم رسول سے وعدہ کرے کہ میں تجھ کو برکت دوں گا، تجھ سے بڑی قوم پیدا کروں گا۔ تو اس سے کفار نابکار یا فاسق فاجر بدکردار مراد نہیں ہو سکتے۔ پس اس اصول کو یاد رکھ کر پادری صاحبان بتادیں کہ اسماعیل کی نسل سے قبل از اسلام کونسی بڑی بابرکت قوم پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہ خدائی وعدہ پورا ہوا؟

میرے دل کو دیکھ کر میری وفا کو دیکھ کر
بندہ پرور! منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر

اظہار تعجب:

بسا اوقات دیکھا ہے جو کوئی کسی دوسرے پر ناحق الزام لگاتا ہے (بفحوائے حدیث نبوی) وہ اسی الزام سے ملزم ہو جاتا ہے۔[1] پادری صاحب نے مفسرین قرآن پر الزام لگایا کہ مفسرین قرآن کتب سابقہ مطہرہ کو نہیں دیکھتے اور فرضی خیالات لکھ دیتے ہیں۔ (حوالہ مذکور)

حالانکہ امام رازی سے آپ نے جو کچھ نقل کیا ہے اس کی تصدیق خود ہی کی ہے۔ امام ممدوح کا قول یہ ہے:

''اس (وعدہ الٰہی) سے مراد وہ تمام باتیں ہیں جن کے متعلق خدا نے حکم دیا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠)

امام ممدوح کے اس دعوے کے ثبوت میں ہمارے پیش کردہ حوالہ از احبار کے علاوہ پادری صاحب نے خود بھی ایک حوالہ نقل کیا ہے جو یہ ہے:

"خدا نے بنی اسرائیل کو فرمایا اگر تم میری آواز کے فی الحقیقت سننے والے ہوگے اور میرے عہد کو حفظ کروگے تو تم ساری قوموں سے زیادہ میرے لیے ایک خزانہ ہوگے۔ کیونکہ ساری زمین میری ہے اور تم میرے لیے کاہنوں کی ایک مملکت اور ایک مقدس قوم ہوگے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو تو (اے موسیٰ) بنی اسرائیل کو کہے گا۔" (المائدہ ص: ۱۴۵ منقول از خروج ۱۹: ۱۔۹)

ناظرین کرام! غور فرمائیں کہ اس عبارت اور کلام امام میں کیا فرق ہے؟ باوجود اس ثبوت کے پادری صاحب علما مفسرین پر خفا ہوں تو یہ نہ کہا جائے ؎

اُنہوں نے خوبرو شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم اُن کو بتادیں گے

تورات و انجیل کی صحت:

اب تک وعدہ اسرائیلی اور وعدہ الٰہی کا ذکر ہوا ہے، اس کے آگے پادری صاحب نے اسی ضمن میں ایک اور مبحث بھی چھیڑا ہے، یعنی تورات و انجیل کی صحت۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"قرآن شریف میں یہ پہلی آیت ہے جس میں صحف مطہرہ کی تصدیق کا بیان ہے۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ تورات اور انجیل آنحضرت کے زمانہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود تھیں۔ ورنہ لفظ ﴿مَعَكُمْ﴾ مہمل ہوجاتا ہے، اور جس حالت میں ان کے پاس موجود تھیں اُسی حالت میں قرآن شریف ان کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ صحف مطہرہ اپنی اصلی حالت میں

آنحضرت کے زمانہ میں اہل کتاب کے پاس موجود تھے، مسلمانوں کا یہ کہنا کہ آنحضرت کے زمانہ میں تورات اور انجیل اپنی اصلی حالت میں موجود نہ تھیں گویا اس آیت کی تردید کرنا اور یوں قرآن کی تصدیق کو باطل کرنا ہے۔'' (ص: ۱۴۷)

برہان:

پادری صاحب! دیکھیے ہم اور کسی کی نہیں کہتے مگر خود بڑی دریا دلی سے مانتے ہیں کہ زمانہ رسالت محمدیہ (علی صاحبها الصلوة والتحية) میں بعینہ وہی تورات تھی جو ''یشوع'' نے لکھی تھی اور بعینہ وہی انجیل تھی جو متی، مرقس وغیرہ نے لکھی تھی۔

بس اب تو آپ خوش ہیں؟ مگر کیا اتنا تسلیم کرنے سے ہم فریقین میں اتفاق ہو جائے گا؟ واقعات اس کی شہادت نہیں دیتے۔

۲؍ربیع الثانی (۵؍اگست ۳۲ء) کے پرچہ میں ہم اصلیت بتا چکے ہیں، آج بھی پادری صاحب کی خدمت میں واضح الفاظ پیش کرتے ہیں کہ منشائے نزاع پر غور کریں۔ سب سے پہلے آپ قرآن مجید کے الہامی الفاظ بنظر غائر دیکھیں کہ عالم الغیب نے گزشتہ اور آئندہ کے جملہ واقعات اور اعتراضات کے دفعیہ کے لیے کیسے جامع الفاظ قرآن مجید میں رکھے ہیں جو موتی کی طرح چمکتے ہیں۔ وہ الفاظ حسب ذیل ہیں:

﴿وَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَ مَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾

[البقرة: ١٣٦]

یعنی جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب نبیوں کو خدا کے ہاں سے ملا اسے ہم مانتے ہیں۔

اس آیت نے مسلمانوں کو صاف لفظوں میں حکم دیا ہے کہ ان انبیاء کرام علیہم السلام کے الہامات کو تسلیم کرو، یہ ہمارا ایمان ہے۔ آپ پر روشن ہوگا کہ مجموعہ بائبل میں کتنا

حصہ ایسا ہے جسے مسلمان بماتحت اس حکم کے ماننے کے مامور ہیں۔ وہ دیکھنا ہوتو کتاب استثناء باب ۵ میں ملاحظ کریں۔ جو ہم ''اہلحدیث'' مورخہ ۵/اگست ۳۲ء میں مکمل نقل کر چکے ہیں۔ وہی حصہ ہے جس کی بابت قرآن شریف کو ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ یا ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ کہا گیا ہے۔اس کے سوا جو باقی حصہ ہے وہ بشہادتِ قرآن مصدقہ نہیں۔ ہاں ہم آپ کو اس سے منع نہیں کرتے کہ آپ اس کو یشوع بن نون کی بالاالہام جمع کردہ مانیں، ہزار دفعہ مانیں۔لیکن مسلمانوں کو مجبور نہ کریں کہ وہ یشوع کے جمع کردہ واقعات موسویہ کو موسوی الہام تسلیم کریں۔ کیونکہ قرآن مجید میں یشوع کی جمع کردہ کتاب کی تصدیق نہیں آئی، تورات کی آئی ہے، جس کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

﴿وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [الأعراف: ١٤٥]

''ہم (خدا) نے موسیٰ کو پتھر کی الواح پر ہر قسم کی نصیحت بالتفصیل لکھ دی تھی۔''

بعینہ یہی مضمون بائبل میں مذکور ہے:

''خداوند نے ...پتھر کی دو لوحوں پر لکھا اور میرے سپرد کیا۔''

(تورات کی پانچویں کتاب استثنا باب ۵)

پادری صاحب! ہم ایک اور طرح سے آپ کی خدمت میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتے ہیں۔ بغور سنیے!

اہل منطق کے ہاں تصور کے دو معنے ہیں: ① تصور مرادف علم۔ یہ مقسم ہے، جس کے اقسام تصور اور تصدیق ہیں۔ ② تصور ساذج۔ یہ قسیم تصدیق ہے اور خاص ہے۔ ان دونوں میں نسبت عموم خصوص مطلق ہے۔ اہل منطق اس اصطلاح کو بتا کر حسب موقع تصور کا لفظ بولیں تو اعتراض نہیں۔ مرادف علم بولیں تو سوال نہیں، بمقابلہ

تصدیق بولیں تو الزام نہیں، ٹھیک اسی طرح قرآن شریف کی اصطلاح میں تورات دو معنی سے ہے ایک خاص (قرآن مجید کی مصدقہ) دوسری عیسائیوں کی مسلمہ جو پہلی سے عام ہے۔ مصدقہ قرآن جزء کی طرح کل میں داخل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اصطلاحوں میں نسبت عموم خصوص مطلق ہے۔ پس خاص کی تصدیق سے عام کی تصدیق لازم نہیں آتی۔ فلیتفکر

پادری صاحب لکھتے ہیں:

''مسئلہ تحریف میں ہم ﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ﴾ پر مفصل بحث کریں گے۔''

(ص:۱۴۷)

ہم بھی آپ کی خدمت میں وہاں حاضر ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ

نہیں معلوم تم کو ماجرائے دل کی کیفیت
سنائیں گے تمہیں ہم ایک دن یہ داستاں پھر بھی

﴿لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ...﴾ کی تفسیر:

﴿لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ کی تفسیر میں پادری صاحب نے جو لکھا ہے وہ بعض علمائے اسلام کا قول ہے مگر ہماری تحقیق اور ہے۔ پادری صاحب لکھتے ہیں:

''یہ عجیب جملہ ہے جس سے الکتاب (بائبل) کی شانِ عظمت وجلالت ظاہر ہوتی ہے۔ یہودیوں کا یہ دستور تھا کہ وہ صحف مطہرہ کی تعلیم اُجرت لے کر دیا کرتے تھے، جس سے احکام الٰہی کی تبلیغ ایک خاص طبقہ میں محدود رہ جاتی تھی، غربا اور عامی اس سے محروم رہ جاتے تھے اور یہ منشا الٰہی کہ اس کی تعلیم عام ہو فوت ہو جاتا تھا۔ اس لیے یہودیوں سے کہا گیا کہ بدبختو تم کیوں میری آیتوں کو حطام دنیا کے بدلے میں بیچتے ہو۔ مفت کیوں نہیں پڑھاتے ہو۔'' (ص:۱۴۷، ۱۴۸)

برہان:

تفسیروں میں یہ قول بھی ہے۔ مگر زیادہ صحیح معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کے احکام کو بگاڑ کر دنیاوی فوائد حاصل کرنے کو غلط پیرائے میں بیان نہ کرو۔ ان معنی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٦٩]

یعنی انبیاء کے بعد کتاب کے وارث ایسے لوگ ہوئے جو دنیا کا مال حاصل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری بخشش ہو جائے گی۔ (ایک طرف سے مال کھا کر غلط فتویٰ دیتے ہیں) اور اگر دوسری طرف سے اسی قدر ان کو پہنچ جاتا تو وہ بھی لے لیتے (پھر فریق ثانی کی طرف ہو جاتے) کیا ان سے کتاب اللہ میں وعدہ نہیں لیا گیا کہ اللہ کے حق میں سچ ہی کہا کریں اور یہ اس سبق کو پڑھ چکے ہیں اور یاد رکھیں آخرت کا گھر متقیوں کے لیے ہے۔

اس آیت میں اہل کتاب کی خیانتِ عالمانہ کا ذکر ہے۔ یعنی خدائی احکام بیان کرنے میں حق گوئی کا خیال نہیں رکھتے بلکہ ان کا بیان اپنی اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ آیت زیر بحث آیت ﴿لَا تَشْتَرُوْا﴾ کی تشریح اور تفسیر ہے کہ اس سے مراد احکام الٰہیہ میں تبدیلی ہے، صحیح تعلیم بالعوض دینا منع نہیں۔

پادری صاحب نے اپنی تائید میں انجیل کے حوالے سے ایک جملہ بھی لکھا ہے:

"جو شکایت آنحضرت (علیہ السلام) کو یہود سے تھی بعینہٖ وہی شکایت حضور مسیح کی[1] تھی۔" (ص:۱۴۸)

ہوگی، بُرے لوگوں کی شکایت ہر نیک بزرگ کو ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اس میں خصوصیت سے یہود کو ملزم نہیں بنایا بلکہ جملہ بنی اسرائیل کو مخاطب کیا ہے چاہے یہودی ہوں یا عیسائی۔ کسے باشد۔ جس میں یہ عیب ہوگا وہی مخاطب ہوگا۔

صلوۃ اور زکاۃ کا معنی:

پادری صاحب نے صلوۃ، زکوۃ اور راکع کے معنے میں بھی تصرف کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ جس صلوۃ (نماز) اور زکوۃ (خیرات) کا اس آیت میں ذکر ہے اس سے مراد وہ نماز اور خیرات ہے جو یہودی مذہب میں رائج تھیں نہ کہ وہ نماز اور خیرات جو مسلمانی مذہب میں رائج ہیں، کیونکہ اس آیت میں مخاطب یہودی ہیں نہ کہ مسلمان۔" (ص:۱۴۹)

برہان:

قرآن شریف میں "الصلوۃ" اور "الزکوۃ" سے مراد وہی ہے جو قرآنی اصطلاح میں نماز اور زکوۃ ہے۔ کیونکہ قرآن شریف ایک مذہبی کتاب ہے، یہ اپنی اصطلاحات خاص رکھتا ہے۔ چنانچہ شروع میں فرمایا:

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲، ۳]

چونکہ شروع سورت میں یہ ذکر آچکا ہے کہ قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت

[1] کو۔ [مؤلف]

ہے جو بن دیکھے خدائی وعدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور خدا کے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس شروع کی آیت سے قطعاً اسلامی نماز اور اسلامی زکوۃ مراد ہے۔ اس لیے مقام خطاب میں اسی گزشتہ صلوۃ وزکوۃ کی تعلیم دینے کو صاف فرمایا:

''باقاعدہ نماز ادا کرو اور زکوۃ دیا کرو، اور جو لوگ اسلام قبول کر کے خدا کی طرف جھک رہے ہیں تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔''

پس یہ آیت دراصل بنی اسرائیل کے حق میں داخلہ اسلام کے لیے ایک پیغام ہے جیسا دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبۃ: ۱۱]

''منکرین لوگ اگر نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں تو تمھارے بھائی ہیں دین میں۔''

راکع سے مراد:

پادری صاحب کہتے ہیں مسیحی راہبوں کو راکع کہتے تھے۔ پس ﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ راہبوں کے ساتھ خدا کے آگے جھکو۔'' (ص: ۱۴۹)

برہان:

جی خوش کرنے کی بات ہے، ورنہ اگر یہ جملہ ''تصنیف را مصنف نیکو کند بیان'' صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ''تأويل الكلام بما لا يرضى به قائله باطل''[1] تو قرآن مجید کی راہبوں سے نفرت سنیے۔ انھی آپ کے راہبوں کے حق میں ارشاد ہے:

﴿وَّ رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ [الحدید: ۲۷]

''ان مسیحی درویشوں نے رہبانیت از خود ایجاد کر لی تھی جس کا ہم (خدا) نے حکم نہ دیا تھا۔''

---

[1] کسی کلام کے ایسے معنی کرنا جو متکلم کے خلاف منشا ہوں باطل ہیں۔ [مؤلف]

اسی واسطے حدیث رسول میں ارشاد ہے:

«لا رهبانية في الإسلام»[1] الحديث ”اسلام میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔“

پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس کتاب میں رہبانیت کو انسانی بدعت کہا ہو، جس کتاب کے مبلغ اول نے رہبانیت کو اسلام سے منفی کر کے ناپسند کیا ہو، اس کی تعلیم میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم ان راہبوں کے ساتھ مل کر خدا کی طرف آؤ؟ یا للعجب!!

نوٹ: رہبانیت کے معنی ہیں ترک تمدن یعنی مجردی کی حالت میں صحرانشین ہوکر خدا کی یاد میں مشغول رہنا چونکہ ایسا کرنے سے انسانی تمدن کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ نسل انسانی قطع ہوتی ہے۔ اسلام چونکہ صحیح تمدن کا حامی ہے اس لئے رہبانیت کی اجازت نہیں دی گئی۔

اب تک رہبانیت پر بحث چل رہی تھی، آگے پڑھیے۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ﴾ پر پادری صاحب نے تصدیقی دستخط کیے ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں:

”بے شک یہودیوں کی یہی حالت تھی، ہمارے منجی حضور مسیح نے ایک سے زیادہ بار یہودیوں کو ان کی اس دورنگی، مکاری اور ریاکاری پر توجہ دلائی اور جب انھوں نے نہ مانا تو اپنے شاگردوں کو یہ حکم دیا کہ:

فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں، وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انھیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ (متی ۲۳: ۲۔۴)“ (ص: ۱۵۰) نعم الوفاق و حبذا الاتفاق!

[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”لم أره بهذا اللفظ لكن في حديث سعد بن أبي وقاص عند الطبراني: «إن الله أبدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة» (فتح الباري: ۹/ ۱۱)

سورة بقرة ۔ رکوع ٦:

﴿ يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَ اَنِّيۡ
فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ وَ اتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِيۡ نَفۡسٌ عَنۡ
نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّ لَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ
لَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۞ وَ اِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ
يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَ يَسۡتَحۡيُوۡنَ
نِسَآءَكُمۡ وَفِيۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ۞ وَ اِذۡ فَرَقۡنَا
بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَآ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ
تَنۡظُرُوۡنَ ۞ وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰٓى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ
الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ۞ ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنۡكُمۡ مِّنۡۢ
بَعۡدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۞ وَاِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَ
الۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۞ وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ
اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡٓا اِلٰى
بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ
فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ اِنَّهٗ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۞ وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى
لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ
وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ۞ ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ
تَشۡكُرُوۡنَ ۞ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمُ
الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَ

لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۞ وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ
فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا
حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۞ [البقرۃ: ٤٧ تا ٥٩]

ترجمہ: اے بنی اسرائیل میری (خدا کی) نعمت یاد کرو جو تم پر میں نے کی تھی کہ تم میں موسیٰ اور ہارون جیسے رسول بھیجے جنہوں نے تم کو ذلت سے نکال کر عزت کے مرتبہ پر پہنچایا اور میں (خدا) نے تم کو تمام دنیا کے لوگوں پر فضیلت بخشی کہ تم میں انبیاء پیدا کئے اور تم کو بڑی شاندار حکومت دی مگر تم دنیاوی دھندوں میں پھنس گئے اس لئے تمہیں کہتا ہوں کہ تم اس بلا سے نکلو اور اس دن روز قیامت سے ڈرو جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس سے سفارش قبول ہوگی اور نہ مالی عوض لیا جائے گا۔ اور نہ ان لوگوں کو کسی طرح کی کسی طرف سے مدد ملے گی یہی خوف انسان کو گمراہی سے بچانے کا ایک بھاری ذریعہ ہے۔ اور سنو! وہ وقت یاد کرو جب ہم (خدا) نے تم کو فرعون کے لوگوں کے عذاب سے نجات دی تھی وہ تم کو بہت سخت عذاب دیتے تھے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تاکہ تمہاری قومی قوت زور نہ پکڑے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے تاکہ ان سے خدمت لیں۔ اس نجات دینے میں تمہارے لئے تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی مہربانی [1] تھی۔ اور سنو! وہ وقت یاد کرو جب ہم (خدا) نے تمہارے لئے دریا (بحیرہ قلزم) کو دو حصوں میں

[1] بلاء حسنا نعمۃ۔ [مؤلف]

پھاڑ کر درمیان میں خشک کر دیا تھا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تم لوگ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے دریا کے پاس پہنچے اور تم ڈرے کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ ہم نے تمہارے لئے دریا کا پانی روک کر درمیان میں خشک[1] رستہ بنادیا۔ پھر ہم (خدا) نے تم کو نجات دی اور فرعونی لوگوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے غرق کر دیا۔ اور سنو! وہ وقت بھی تمہیں یاد ہوگا جب ہم (خدا) نے موسیٰ کو چالیس راتوں کے لئے بلایا اور چالیس راتیں کوہ طور پر رہنے کے بعد کتاب دینے کا وعدہ دیا تھا۔ پھر تم لوگوں نے سامری کے کہنے سے چاندی سونے کا بچھڑا بنالیا جس کے بانی سامری نے تم کو دھوکہ دے کر کہا کہ موسیٰ کا معبود یہی[2] ہے۔ تم نے اس کو پوجنا شروع کر دیا کیونکہ بے سمجھ تھے اور تم بے سمجھی میں اپنے نفسوں پر ظالم تھے۔ پھر اس کے بعد حسب حکم موسیٰ تم لوگوں نے توبہ کی تو ہم (خدا) نے تم کو معاف کیا تاکہ تم شکر گذاری کرو۔ اور سنو! وہ وقت یاد کرو جب ہم (خدا) نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس سے پہلے فرعون کے سامنے فیصلہ کرنے والا غلبہ دیا تاکہ تم ہماری طرف راہ پاؤ۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰ نے تمہاری گوسالہ پرستی کی اطلاع پہاڑ پر پاکر واپس آکر اپنی قوم کو کہا اے میری قوم یقیناً تم لوگوں نے بچھڑا بنا کر اپنے نفسوں پر سخت ظلم کیا۔ پس تم باری تعالیٰ کے حضور میں توبہ کرو چونکہ تمہارا یہ گناہ دو گناہوں سے مرکب ہے ایک گوسالہ پرستی دوسرے خلیفہ وقت ہارون کے حکم سے سرتابی۔ پس اس کی توبہ بھی یہ ہے کہ تم جنہوں نے یہ فعل نہیں کیا،

---

1. ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ﴾ [الدخان: ٢٤] کی طرف اشارہ ہے۔ [مؤلف]
2. ﴿هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى﴾ [طٰہٰ: ٨٨] کی طرف اشارہ ہے۔ [مؤلف]

اپنے بھائیوں کو جنہوں نے یہ جرم کیا ہے قتل کرو۔ بس یہ ایک صورت
تمہارے پروردگار کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے ۔ پس جب انہوں
نے اس حکم کی تعمیل کی تو خدا نے ان پر نظر عنایت فرمائی تحقیق وہ گنہگار
متوجہ ہونے والے پر بڑا توجہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور سنو!
جب تم نے کہا تھا اے موسیٰ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب
تک خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں تو جو کہتا ہے کہ خدا مجھ سے بولتا ہے تو کیا ہم
تیرے بھائی نہیں ہمیں بھی خدا کی زیارت کرادے ۔ چونکہ یہ خیال تمہارا
از راہ تکبر تھا پس تمہارے دیکھتے دیکھتے عذاب الٰہی نے تم کو آدبایا ۔ وہ
عذاب کیا تھا پہاڑ پر تمہاری موت۔ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تم کو
اُٹھایا تا کہ تم شکر کرو ۔ اور سنو! ہم (خدا) نے میدان تیہ میں تم پر دفع
گرمی کے لئے بادلوں کا سایہ کیا اور چونکہ ابھی تم کھیتی باڑی نہ کر سکتے تھے
تم پر من میٹھی ترنجبین اور سلویٰ کھانے کے لئے مثل بیٹروں کے جانور
بھیجے اور اجازت دی کہ ہمارے دیے ہوئے پاک رزق میں سے کھاؤ
اور شکر گزار بنو۔ انہوں نے یہ رزق خوب کھایا مگر شکر نہ کیا اور انہوں نے
ایسا کرنے میں ہم پر ظلم نہ کیا لیکن اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے۔ اور
سنو! جب تم جنگل میں اکتا گئے اور تم نے ایسی چیزوں کی درخواست کی جو
صرف شہروں میں ملتی تھیں تو ہم (خدا) نے کہا کہ اس بستی میں جو تمہارے
نزدیک ہے داخل ہو جاؤ پھر اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور
دروازے میں فاتحانہ غرور سے نہیں بلکہ عاجزی اور تواضع سے داخل ہونا
اور کہتے جانا کہ ہمارا سوال معافی کا ہے ہماری سرکشی اور غرور معاف ہو۔
ہم (خدا) تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اس بخشش کے علاوہ نیک صالح

لوگوں کو بہت کچھ زیادہ دیں گے۔ پھر ان ظالموں نے بتائی ہوئی بات کی بجائے اور ہی بات کہی ۔یعنی بطور تمسخر "حطة" کی بجائے "حنطة" (گیہوں گیہوں) کہنے لگے۔ پس ہم (خدا) نے ان ظالموں پر آسمان سے عذاب اتارا بوجہ اس کے کہ وہ بداعمالی کرتے تھے۔"

اعتراض:

پادری صاحب نے سورہ بقرہ کے چھٹے رکوع کا ذکر "المائدہ" کے نمبر گیارہ بابت نومبر میں شروع کیا۔ اس میں صرف اتنا لکھا:

"قرآن شریف میں بنی اسرائیل کا قصہ گزشتہ رکوع سے شروع ہوتا ہے اور کم وبیش بیس سورتوں میں بلا ترتیب بکھرا ہوا ہے۔ اور تاوقتیکہ یہ تمام اجزائے منتشرہ تاریخی ترتیب پر ایک جا جمع نہ کیے جائیں پڑھنے والا کسی خاص نتیجہ پر بلا دقت نہیں پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ تاریخی طور پر اس قصہ کو ذیل میں ترتیب دوں۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک عمودیہ (کالم) میں قرآن شریف کی آیات ہوں گی۔ اور دوسرے عمودیہ میں بائبل مقدس کی آیات۔ قرآن شریف کی مکرر آیات کو حذف کرتا جاؤں گا اور تفسیر طلب آیات کی تفسیر ان کی اصلی جگہوں میں لکھوں گا۔" (ص:۱۵۲،۱۵۳)

برہان:

ہم سمجھے کہ پادری صاحب اپنے مقصد کا اظہار آئندہ نمبر (۱۲/) میں کریں گے مگر نمبر (۱۲/ بابت دسمبر) بھی آ گیا لیکن اس میں بھی بجز عبارات بائبل اور کسی قدر قرآن مجید کے اور کچھ نہ پایا، لہٰذا معلوم نہ ہو سکا کہ پادری صاحب کا ما فی الضمیر کیا ہے اور وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس لیے ہم انتظار کرتے ہیں اور ہمارے

ناظرین بھی منتظر ہیں کہ پادری صاحب جو کہنا چاہتے ہیں جی کھول کر کہہ لیں۔ ہمارا اعلان وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا: ﴿اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ﴾ جس کا مطلب اردو شعر میں یوں ہے ؎

ہم بھی سینہ سپر قاتل لگا جو ہو سو ہو
آج دیکھیں کاٹ تیرے ابروئے خمدار کا

نوٹ: پادری صاحب کا رسالہ وسط جنوری میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

ناظرین منتظر ہوں گے کہ اس ہفتہ برہان التفاسیر سے دل کو مسرور کریں گے ہمیں بھی توقع تھی کہ اس دفعہ پادری صاحب کا حملہ بڑی شان وشوکت سے ہوگا۔ لیکن افسوس گمان کے خلاف نکلا۔ عین انتظار میں ''المائدہ'' بابت جنوری پہنچا اس میں دیکھا تو یہ دیکھا جو اڈیٹر المائدہ کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''رسالہ ہذا کے ساتھ قرآن کی جو تفسیر شائع ہورہی ہے اس کے مصنف جناب پادری ایس۔ ایم۔ پال صاحب ایک ایسے اہم کام میں مشغول ہوگئے ہیں کہ کسی دوسرے کام کے لیے ان دنوں وقت نکالنا بالکل ممکن نہیں رہا۔ اور یہ اشد لازم ہے کہ تمام کاموں کو چھوڑ کر پہلے اس کام کو ختم کرلیا جائے۔ بہرصورت یہ مہم ۱۵؍مئی کو ختم ہو جائے گی تب آپ پھر تفسیر کا سلسلہ زور شور سے جاری کردیں گے۔ آج اس بارے میں آپ کا حسب ذیل مکتوب دفتر المائدہ میں موصول ہوا ہے:

''مکرم بندہ جناب خان صاحب! افسوس ہے کہ چند اسباب ناگہانی کی وجہ سے میں تفسیر القرآن کے مابقا حصص برائے اشاعت بالفعل ارسال نہیں کرسکتا۔ عدیم الفرصتی کا یہ عالم ہے کہ سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ میں نے حتی الامکان بہت کوشش کی کہ مسودات کی نظر ثانی کے لیے

وقت نکل آئے مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ امید واثق ہے کہ جون ۱۹۳۳ء تک یہ تمام موانع رفع دفع ہوجائیں گے۔ تب میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ باقی ماندہ حصص یکمشت آپ کے حوالے کردوں تا کہ آپ دو ایک نمبروں میں ان چار مہینوں کی کسر پوری کردیں۔ والسلام

(۶رجنوری ۱۹۳۳ء) مخلص ایس۔ ایم۔ پال

''ہمیں اس مہم عظیمہ کی نوعیت واہمیت کا علم ہے۔ [1] اور پادری صاحب کے تمام دوستوں نے بھی آپ کو یہی مشورہ دیا ہے کہ پہلے اس کام کو ختم کرلیا جائے۔ یہ کام ایسا ہے کہ خود بخود ۹رمئی کو ختم ہوجائے گا اور تب آپ کو تفسیر کے لئے کافی فرصت مل جائے گی، اس وقت ہم ان پانچ مہینوں کی کسریوں نکال دیں گے کہ جون سے اخیر اکتوبر تک کی ہر اشاعت میں ۱۶ کی بجائے ۳۲ صفحے تفسیر چھپا کرے گی اور خریداروں کو سال کے آخر میں جا کر ایک صفحہ کا بھی نقصان نہ ہوگا۔'' (ص:۳۳)

اہلحدیث:

نقصان تو نہ ہوگا لیکن جدائی سے بے قراری کا کیا جواب؟ ہمارا مشورہ سُنیں تو مسودات ہمارے پاس بھیج دیں ہم ان کو پادری صاحب کے نقطہ نظر سے دیکھ کر المائدہ میں بھیج دیں گے۔ کیوں؟ ؎

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ ہی
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

فقط

اخبار اہلحدیث کے پرانے خریدار شاید بھول گئے ہوں گے اور نئے واقف ہی

---

[1] ہمیں بھی ہے۔ [مؤلف]

ہوں گے کہ یہ سلسلہ ۲۹/ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۶/مئی ۱۹۳۲ء سے جاری ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ پادری سلطان محمد صاحب پال (سابق مسلم) نے قرآن شریف کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی۔ پادری صاحب جو تارک اسلام ہو چکا ہو قرآن کی تفسیر لکھے تو کیا کچھ لکھے گا اور قرآن کے ساتھ کیا سلوک کرے گا اس کا اندازہ ہر ایک مسلمان کرسکتا ہے۔ چونکہ پادری صاحب نے ایک ماہوار عیسائی رسالہ ''المائدہ'' کی معرفت تھوڑا تھوڑا حصہ تفسیر کا شائع کرنا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے خیال ہوا کہ اگر اس تفسیر کے خاتمہ تک جنبش قلم کو بند رکھا جائے تو اتنے عرصہ تک زندگی کا کیا اعتبار؟ نیز اتنا بڑا کام دفعتاً کرنا محال ہوگا، اس لیے ۶/مئی ۱۹۳۲ء سے ہم نے پادری صاحب کے پیچھے اشہب قلم دوڑا دیا۔ مسلم قلم اتنے زور سے دوڑا کہ پادری صاحب کے برابر جا ملا۔ یہاں تک کہ پادری صاحب نے کسی خاص مانع کی وجہ سے ''المائدہ'' میں مضمون شائع کرنا ترک کر کے اعلان کردیا:

''جون ۳۳ء تک موانع اٹھ جائیں گے تو میں ساری کسر نکال دوں گا۔''

(المائدہ بابت جنوری ۳۳ء)

یہ مدت بھی ختم ہوگئی مگر پادری صاحب کی طرف سے تفسیری حصہ شائع نہ ہوا۔ اسباب مخفیہ کو ہم نہیں جانتے نہ جاننے کی حاجت ہے آخر جب انتظار مایوسی کے درجے تک پہنچ گیا تو پادری صاحب کی طرف سے ہفتہ وار رسالہ ''النجات'' ۲۳/مارچ ۳۴ء کو پہنچا۔ جس میں چار ورق تفسیر کے بھی نظر سے گزرے (شکراً للہ) چنانچہ بسم اللہ کر کے آج ہم نے بھی پادری صاحب سے قلمی مصافحہ شروع کیا ہے، خدا انجام تک پہنچائے۔

اطلاع:

شروع سلسلہ ہذا (۶/جنوری ۳۲ء) سے جتنا جواب نکلا تھا اس میں خاص پادری صاحب کو خطاب ہوتا رہا ہے مگر اتنے عرصہ کی بندش سے رائے میں یہ تبدیلی

ہوگئی ہے کہ جدید فرقوں کی جتنی تفسیریں اردو زبان میں چھپ چکی ہیں ساتھ ساتھ ان سب پر نظر ہوتی جائے تو بہت اچھا ہے۔ جدید الطبع مروجہ تفسیرات یہ ہیں:

① تفسیر احمدی علی گڈھی۔ ② تفسیرات احمدیہ قادیانیہ۔[1] ③ بیان القرآن از مولوی محمد علی صاحب لاہوری احمدی۔[2] ④ بیان للناس از مولوی احمد دین صاحب امرتسری اہل قرآن۔[3] ⑤ ترجمہ قرآن از مولوی عبداللہ چکڑالوی اہل قرآن۔

سرسید احمد خان مرحوم علی گڈھی کی تفسیر کا ذکر ہم تفسیر ثنائی میں مفصل کر چکے ہیں۔ تاہم یہاں بھی بمقدار قلیل کسی خاص غرض سے اس کا ذکر آتا رہے گا۔ بحولہ و قوتہ

نوٹ: سورہ بقرہ کے چھٹے رکوع کے الفاظ مع ترجمہ وتشریح ہم درج کر چکے ہیں اس کے بعد پادری صاحب سے مکالمہ جاری ہوا ہے۔

اس سلسلہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ پادری سلطان محمد پال کے جواب میں یہ سلسلہ جاری ہوا ہے۔

پادری صاحب نے اپنی تفسیر کے صفحہ (۱۵۴) سے صفحہ (۱۸۰) تک قرآن اور کتب سابقہ کی عبارات متعلقہ قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نقل کی ہیں۔ اتنے صفحات میں پادری صاحب سے بڑا تساہل اور غلطی یہ ہوئی ہے کہ آپ نے قرآنی کالم میں قرآنی

---

[1] مرزا صاحب قادیانی یا حکیم نورالدین میاں محمود خلیفہ قادیان نے مستقل تفسیر کوئی نہیں لکھی۔ البتہ ان کے درس قرآن کے نوٹ ملتے ہیں۔ مباحث کے ذیل میں کسی آیت کا ترجمہ یا تفسیر جو لکھی ہے اس کا ذکر ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ [مؤلف]

[2] یہ صاحب اگرچہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے مرید ہونے کی وجہ سے احمدی ہیں مگر تفسیر اور بہت سے مسائل اعتقاد میں سرسید احمد خان سے بھی بہت مستفیض ہیں۔ [مؤلف]

[3] یہ صاحب باقاعدہ علوم عربیہ نہیں پڑھے، انٹرنس پاس کر کے اسلامیہ اسکول امرتسر میں مڈل درجے میں ماسٹر ہوگئے تھے، سرسید مرحوم کی تصنیفات دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ انہی کا رنگ لے کر اسی قسم کے خیالات کو تفسیر ''بیان للناس'' میں بھر دیا ہے۔ آپ حجیت حدیث کے منکر ہیں اس لئے ہم ان کو اہل قرآن کی صنف جانتے ہیں۔ [مؤلف]

الفاظ کے علاوہ تفسیری حوالجات بھی نقل کردیے ہیں جن سے ناواقف آدمی کو شک ہو سکتا ہے کہ شائد وہ عبارات بھی قرآن کی ہیں۔ ان کی یہ غلطی صفحہ (۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵) پر مرقوم ہے حالانکہ آپ نے صفحہ کے دو کالم کر کے ایک کالم پر قرآن کی سرخی لکھی ہے اور دوسرے پر صحف مطہرہ کی سرخی دی ہے، اور قصہ موسیٰ علیہ السلام میں قرآن مجید کے مختلف مقامات سے الفاظ پورے نقل کیے ہیں جن پر نہ اعتراض کیا نہ سوال۔ صرف تفسیر طبری سے ایک قول ابن عباس کا نقل کیا ہے جس میں فرعونی حکم سے ابناءِ بنی اسرائیل کے قتل کیے جانے کی تفصیل درج ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے بعد تفسیر حقانی (دہلوی) سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں اسی طرح تفصیل کی ہے اور اعتراض کوئی نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پادری صاحب کا مقصد ان عبارات سے تفہیم قرآن ہے نہ کہ تردید قرآن۔

اس کے بعد آپ سر سید احمد خان مرحوم کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ سر سید کا قول ان کی تردید کے لیے نقل کیا ہے کیونکہ سید صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی سے دریا نہیں پھٹا تھا بلکہ حسب قانون قدرت اس میں مدوجزر ہوا تھا۔ سر سید صاحب چونکہ مدوجزر کے قائل ہوئے ہیں اس لیے انھوں نے بحر احمر کی ایک چھوٹی سی راہ تجویز کی ہے جس سے قرآن مجید کو کوئی واسطہ ہی نہیں، ہاں پادری صاحب نے سر سید کا منشا خوب سمجھا۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

''سر سید مرحوم چونکہ معجزہ کے قائل نہیں ہیں اس لیے بنی اسرائیل کے معجزانہ طور سے بحرِ قلزم کو پار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔'' (ص:۱۸۴)

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح سر سید سے مستفیضین بھی اس دریا میں معمولی مدوجزر بتاتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب احمدی لاہوری لکھتے ہیں:

''دریاؤں میں یہ بسا اوقات ہو جاتا ہے کہ ایک وقت میں دریا پایاب

ہو جاتا ہے اور آناً فاناً ایک ایسی خطرناک رَو آتی ہے کہ سیلاب آجاتا ہے، جو دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان میں یہ واقعات اکثر پیش آجاتے ہیں۔'' (تفسیر بیان القرآن ج:اول ص:٦٢)

اہلحدیث:

ہمارے ملک میں اس طرح بہنے والے پانی کو نالہ یا چو کہتے ہیں دریا نہیں کہتے جیسے ضلع ہوشیار پور میں دیکھے جاتے ہیں۔

سید صاحب کے دوسرے مستفیض مولوی احمد الدین صاحب امرتسری اس آیت کا ترجمہ مع تشریح لکھتے ہیں:

''جب تم فرعون کے لوگوں سے بھاگ کر سینا کے میدان کی طرف چلے جارہے تھے تو تمھیں ایسے وقت سمندر پر پہنچایا جب کہ وہ پایاب تھا اور اسے چیر کر اور صحیح راستے پر چل کر لوگ اس سے پار جاسکتے تھے سو ہمارا دوسرا انعام تم پر اس وقت ہوا تھا جب ہم نے تمہارے چلنے کے ساتھ سمندر کو چیرا تھا اور سمندر کو پایاب رکھ کر اور تمہیں صحیح راستہ پر چلا کر پار کردیا تھا سو ہم نے تم کو بچادیا۔'' (بیان للناس جلد اول ص:٤٥٦)

یہ مضمون کیسی صاف وحدت بتارہا ہے، گو بظاہر یہ تین اصحاب بولتے ہیں مگر وحدت مضمون کے لحاظ سے اصل ایک ہی ہے باقی دو اس کے اَتباع ہیں۔

قرآن مجید کے الفاظ صریحہ سامنے رکھ کر کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا کہ دریا کا پھٹنا بنی اسرائیل کے لیے معجزانہ رنگ میں ہوا تھا۔ غور سے پڑھیے:

﴿ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ٥٠]

''ہم نے تمھاری وجہ سے دریا کو پھاڑ کر تم کو نجات دی اور تمھارے دیکھتے

دیکھتے فرعونیوں کو غرق کر دیا۔“

اس آیت کی پوری تفسیر اور تشریح دوسری آیت کر رہی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الشعراء: ٦٣]

”ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنے سوٹے کے ساتھ دریا کو مار پس وہ دریا (اس کے مارنے سے) پھٹ گیا تو ہر ایک حصہ اس کا ایک تودہ عظیم بن گیا۔“

مقام شکر ہے کہ ہمارے اصل مخاطب پادری صاحب ہم سے متفق ہیں جو بائبل کی کتاب خروج کے باب ۱۴/ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

”درحقیقت بنی اسرائیل کا بحر قلزم سے پار ہو جانا جوار بھاٹے کے اثر سے نہیں بلکہ الٰہی طاقت اور حضرت موسیٰ کے معجزانہ اثر کی وجہ سے تھا۔“

(ص: ۱۸۴)

یہی ہمارا عقیدہ ہے۔ فنعم الوفاق!

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کی تفسیر:

آیت ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کی تفسیر کے متعلق پادری صاحب نے تو مخالفانہ کلام نہیں کیا بلکہ اس کی تائید میں بائبل کی کتاب خروج باب (۳۲) سے عبارت نقل کی ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرمایا:

”تم میں سے ہر مرد اپنے بھائی کو قتل کرے۔“

مگر مولوی عبداللہ چکڑالوی نے قتل سے انکار کر کے قتل کے معنی میں لکھا ہے:

”اس جگہ قتل سے مراد ہے نہایت ہی بڑھ کر اپنے آپ کو سخت ندامت وملامت کرنا۔“ (ترجمہ چکڑالوی ص: ۴۱)

اگر آپ بچھڑے کے پجاریوں کے فعل پر غور کرتے تو ایسا نہ کہتے۔ ان کا فعل

مذہبی صورت میں شرک اور ارتداد تھا، سیاسی حیثیت میں بغاوت، پھر ایسے لوگوں کے قتل کی تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

قریہ سے مراد:

مرقومہ رکوع کی آیت ﴿هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ میں جس قریہ کا ذکر ہے مفسرین قرآن نے عموماً اس سے بیت المقدس سمجھا ہے۔ پادری صاحب اس سے مراد ایک اور قصبہ (یریحو) بتاتے ہیں اور اس کو بائبل کے حوالے سے مؤید کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ﴿ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ آیا ہے۔ ممکن ہے یریحو ارض مقدسہ میں ہو جیسے فیض آباد اودھ میں اور مظفر گڑھ وغیرہ پنجاب میں ہیں، اس لیے ہمارے خیال میں یہ اختلاف چنداں قابل اعتنا نہیں۔

﴿حِطَّةٌ﴾ کی تفسیر:

ہاں پادری صاحب نے چلتے چلتے بطور الزام لفظ ﴿حِطَّةٌ﴾ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

> ''یہ لفظ عربی ہے اور بنی اسرائیل عربی نہیں بولتے تھے، اس طرح لفظ ''حنطة'' بھی عربی ہے، پھر بنی اسرائیل کو اس لفظ سے خطاب کیوں کیا گیا اور انھوں نے ''حنطة'' کیسے کہا۔'' (ص:۲۳۳)

ہم حیران ہیں پادری صاحب کو ایک لفظ پر توجہ ہوگئی مگر یہ خیال نہ آیا کہ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو، آل فرعون کے مومن وساحرین اور دیگر اہل دربار کی گفتگو بھی تو عربی زبان میں نہ ہوئی ہوگی، پھر جس طرح ان سب واقعات ماضیہ کو زمانہ حاضرہ میں بصورت حکایت عربی میں دکھایا گیا اسی طرح ایک لفظ ﴿حِطَّةٌ﴾ اور دوسرا ''حنطة'' کا بھی خیال فرمالیا ہوتا۔ آخر اس جلدی سے فائدہ کیا؟ سچ ہے:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبياء: ۳۷]

رکوع ہفتم:

﴿ وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ [البقرة: ٦٠،٦١]

ترجمہ: یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے بوجہ تشنگی اپنی قوم کے لئے جنگل میں (ہم خدا سے) پانی مانگا۔ تو ہم (خدا) نے اسے حکم دیا کہ اپنے عصا کے ساتھ پتھر کو مار پس اس کے ایسا کرنے سے اس پتھر میں سے بارہ چشمے جاری ہو گئے چونکہ بنی اسرائیل بارہ خاندان تھے بس ان میں سے ہر ایک گروہ نے اور گروہ میں سے ہر ایک فرد انسان نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا۔ یعنی یہ سمجھ گئے کہ ہر ایک قبیلے کے لئے ایک ایک چشمہ ہے ہم نے ان کو اجازت دی کہ اللہ کا رزق کھاؤ اور پیو اور فراخ رزق کی مستی میں آکر زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔ تم نے اس حکم کی تعمیل جو کی وہ تمہیں خوب یاد ہے خصوصاً وہ وقت بھی یاد ہوگا جب تم نے یعنی اس وقت کے تمہارے

بزرگوں نے جب من وسلویٰ کئی روز تک کھایا تو حضرت موسیٰ سے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے نہ کوئی عقلمند ایسا کرسکتا ہے، جناب یہ صحیح ہے کہ آپ کے قبضۂ قدرت میں تبدیلی نہیں لیکن دعا تو ہے پس آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے زمینی پیداوار میں سبز سبز ترکاریاں، کھیرے، ککڑیاں، گیہوں، مسور اور پیاز وغیرہ پیدا کرے۔ جن سے دہلی کے کبابوں کی طرح ہماری ہنڈیا ذرا چٹ پٹی ہو یہ کیا روکھی پھیکی سی غذا ہے جو ہم کوئی دنوں سے مل رہی ہے۔ جب کہ خدا کے ہاں بے حساب خزانے ہیں تو پھر اگر ہم عرض کریں کہ

اے ابر کرم مہر وفا کچھ تو ادھر بھی، تو کیا بجا ہے؟

حضرت موسیٰ نے کہا تم اس مفت کی نعمت کی قدر نہیں کرتے کیا تم اعلیٰ چیز کے بدلے میں ادنیٰ چیز مانگتے ہو اچھا اگر تم اسی ضد پر ہو تو کسی قریب کی بستی میں چلے جاؤ جو تم نے مانگا وہاں تم کو مل جائے گا اور ان پر ذلت اور غریبی ڈالی گئی۔ یعنی دیہاتی زمینداروں کی طرح اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے اور بوجہ سخت دلی اور نافرمانی کے اللہ کے غضب میں آ گئے۔ ان کا یہ حال اس لئے ہوا کہ وہ بوقت آزمائش عموماً اللہ کے احکام سے انکار کردیتے اور موقع بموقع انبیاء کرام کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ بری حالت ان کی اس لئے ہوئی تھی کہ وہ نافرمانی کرتے اور حدود شرعیہ سے بڑھتے رہتے تھے۔

سرسید کی تغلیط:

اس رکوع کی تفسیر میں پادری صاحب کی توجہ سرسید کی تغلیط کی طرف ہوگئی۔ سرسید احمد خان چونکہ ہر ایک اعجازی واقعہ کی تاویل کیا کرتے تھے اس لیے ان آیات

میں پانی کے چشمے بہنے کو بھی اعجازی رنگ میں نہیں مانا بلکہ معمولی قرار دیا ہے۔لطف یہ ہے کہ اپنے دعوے پر مروجہ تورات کی کتاب خروج (۱۵:۲۸) کو بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔سرسید صاحب کی دلیل کی تغلیط کرنے کو پادری صاحب لکھتے ہیں:

''اس حسن ظن کی وجہ سے جو مجھے سرسید مرحوم کے متعلق ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ سرسید نے دیدہ دانستہ اپنے پیروؤں کو مغالطہ دیا اور ان کے توریت نہ پڑھنے سے ناجائز فائدہ اٹھایا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ سرسید نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ توریت مقدس کے ایک واقعہ کو جس کا تعلق اس مقام کے ساتھ قطعاً نہیں ہے کانٹ چھانٹ کر پیش کیا ہے۔ اور جس واقعہ کو اس مقام کے ساتھ خاص تعلق ہے اس کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر ہم خروج کی کتاب سے ان تمام آیات کو یہاں نقل کریں جن کا تعلق اس واقعہ کے ساتھ ہے، تو صاف طور پر واضح ہوجائے گا کہ جس واقعہ کا سرسید ذکر کررہے ہیں وہ ہرگز معجزانہ واقعہ نہ تھا۔ حالانکہ قرآن شریف جس واقعہ کا ذکر کررہا ہے وہ معجزانہ واقعہ ہے جس کا ذکر تورات مقدس میں ایک اور مقام میں ہے جس کو ہم نے حضرت موسیٰ کے قصہ کے مقابلہ میں نمبر (۹) کے آخر میں نقل کیا ہے۔'' (ص:۱۹۲)

چونکہ پادری صاحب کے نزدیک صحت کا مدار اس پر ہے کہ مروجہ تورات کے موافق ہو اور یہ قصہ تورات مروجہ میں ملتا ہے لہٰذا پادری صاحب کا قرآنی بیان پر کوئی اعتراض نہیں اس لیے آپ نے اس مضمون کی بڑے زور سے تائید کی ہے اور سرسید (منکر اعجاز) کی تردید۔ لہ الحمد!

مولوی عبداللہ چکڑالوی بھی نکتہ سنجی میں کسی سے کم نہیں۔ آپ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"فرمایا ہم نے چلا جا تو ساتھ گروہ اپنے کے چشموں والے پہاڑ کی طرف، بس جا کر دیکھا تو وہاں بہہ رہے تھے اس پہاڑ سے بارہ چشمے بڑے بڑے، البتہ پختہ طور پر قبضہ کرلیا ہر ایک فرقے نے گھاٹ اپنے پر۔"
(ترجمہ چکڑالوی اہل قرآن)

حکیم نورالدین قادیانی لکھتے ہیں:

"جب موسیٰ علیہ السلام نے پانی طلب کیا اس پر خدا نے فرمایا اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ پر چل وہاں کیا دیکھتا ہے کہ بارہ چشمے جاری ہیں۔"
(رسالہ نورالدین، ص:۱۲۳)

مولوی احمد الدین صاحب امرتسری نے تو کمال ہی کر دیا۔ معلوم نہیں ہوتا ان کے ذہن میں کیا ہے جس کے لیے ان کو الفاظ نہیں ملتے۔ لکھتے ہیں:

"جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ تو الحجر کو یعنی اس پہاڑ کو ہمارے بتائے ہوئے مناسب مواقع پر ضرب لگا تو اس سے بارہ چشمے جاری ہوگئے۔ بنی اسرائیل کی ہر ایک قوم قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا۔" (بیان للناس، ص:۵۰۶)

ان سارے ترجموں کا ماخذ در اصل سر سید احمد خان مرحوم کی تفسیر ہے جن کا ذکر پادری صاحب کے الفاظ میں آچکا ہے۔ ان مترجموں نے باوجود ایک دوسرے کے مافی الضمیر پر اطلاع پانے کے بھی باہمی فی الجملہ اختلاف کیا ہے۔

ضرب کے معنی چلنے کے وہاں آتے ہیں جہاں اس کے آگے مفعول فیہ بذکر "فی" یا بحذف "فی" ہو۔ سرسید اور حکیم نورالدین نے جتنی مثالیں اپنے مدعا کے لئے نقل کی ہیں ان میں سے ایک بھی ان کو مفید نہیں۔ اسی طرح "العصا" کے معنی جماعت کے مجازاً وہاں آتے ہیں جہاں ٹوٹنے کا ذکر ہو جیسے حبل۔ یعنی جہاں کسی قوم میں تفرقہ

پیدا ہونے یا ان کی جمعیت کا ٹوٹنا بتانا ہو وہاں بولتے ہیں: **تشقوا عصاھم**. انھوں نے اپنا اتفاق یا اجتماع توڑ دیا۔ ورنہ محض عصا کے معنی کہیں جماعت کے نہیں آئے۔

ان سب لفظوں کے بعد لفظ ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ قابل غور ہے۔ یہ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ماضی ''انفجرتْ'' اور ''ف'' سے۔ ''ف'' پہلے سے ملاپ فرعی چاہتا ہے اور ''انفجرت'' حدوث فعل کا متقاضی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بارہ چشموں کا جاری ہونا کسی پہلے فعل کا نتیجہ تھا وہ فعل سوائے ''اضرب'' کے کوئی اور نہیں۔ مولوی احمدالدین صاحب کے قلم سے بتصرف قدرت ایسا فقرہ نکل گیا جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ فعل حادث ہے اور ''اضرب'' کی فرع ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے کہ ''تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔''

یہ لطف پہلے اصحاب کے ترجموں میں نہیں۔ ان صاحب نے مزید کمال یہ کیا ہے کہ ''اضرب'' (صیغہ امر) کے معنی ''ضرب لگا'' کیے۔ ''الحجر'' کے معنی پہاڑ بتائے لیکن لفظ ﴿بِعَصَاكَ﴾ سارا کھا گئے۔ شاید بے ضرورت سمجھا ہوگا ہاں (بتائے ہوئے مناسب مواقع پر) بڑھا کر اس حذف کی کسر نکال دی۔ بہرحال ان صاحب نے یہ تو مانا کہ ''اضرب'' کے معنی مارنا ہے مگر ''الحجر'' کے معنی پہاڑ ہیں اور ''انفجرت'' بے شک حدوث فعل کے لیے ہے یعنی حضرت موسیٰ کے عصا مارنے سے بارہ چشمے پہاڑ سے نکل آئے۔ (ص:۵۰۲) پس ایک حد تک ہمارا مقصود ثابت ہوا۔

مولوی چکڑالوی نے ''علم'' کے معنی قبضہ کے جو کئے ہیں وہ مزید لطف دے رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علم کے معنی قبضہ کے کسی زبان میں نہ ملیں گے۔ دوم یہ کہ ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ ان صاحب کو ایسا بے جا تصرف کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ نہ یہ فعل معجزانہ صورت میں ہے نہ چکڑالوی صاحب معجزوں کے منکر۔ پھر یہ تکلیف اور ارتکاب بعید چہ معنی دارد؟

رکوع ہشتم:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۞ وَ اِذْ
اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۞ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ
الْخٰسِرِیْنَ ۞ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی
السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ ۞ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا
بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۞ وَ اِذْ قَالَ
مُوْسٰی لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْۤا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۞
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۞
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ
یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
لَمُهْتَدُوْنَ ۞ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ
وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ

بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ [البقرة: ٦٢ تا ٧١]

ترجمہ: بنی اسرائیل کو گھمنڈ تھا کہ ہم قومی طور پر افضل ہیں ہمارا رتبہ باقی مخلوق سے ہر طرح بلند ہے ان کے اس خیال کو رد کرنے کے لئے فرمایا۔

بے شک جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جو یہودی ہیں، اور نصاریٰ عیسائی اور صابی اہل کتاب میں سے ایک گروہ مخلوق اور انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ ان میں سے جو لوگ صمیم قلب سے ایمانیات پر ایمان لائیں اور نیک عمل بجالائیں ان کا بدلہ خدا کے ہاں ان کو ملے گا۔ نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہوں گے اسی طرح ہم ہمیشہ اعلان کرتے آئے ہیں تم کو ان واقعات کا خوب علم ہے اور اس وقت کا بھی علم ہے جب ہم نے تمہارا (بنی اسرائیل کا) وعدہ اطاعت لیا تھا کہ احکام شرعیہ کی پیروی کرنا اور اس وعدے کی مضبوطی کے لئے تم پر کوہ طور بلند کیا تھا۔ اس حالت میں حکم دیا تھا کہ جو کچھ تم کو ہم نے دیا ہے اس کو قوت اور دلی مضبوطی سے پکڑنا اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرتے رہنا تاکہ تم خدا کے نزدیک متقی بن جاؤ پھر تم (بنی اسرائیل) نے اس کے بعد منہ پھیرا اگر خدا کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم لوگ نقصان والوں سے ہو جاتے سچ تو یہ ہے کہ اس کے فضل ہی سے تم لوگ باوجود سرکشیوں کے بالکلیہ تباہ نہیں ہوگئے ورنہ چند لوگوں کی جو گت بنی وہ تم سے مخفی نہیں اور تم ان لوگوں کو خوب جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے حکم میں زیادتی کی تھی حکم یہ تھا کہ دنیاوی کام نہیں کرنا مگر انہوں نے سب کچھ کیا تو ہم (خدا) نے ان کو حکم دیا کہ ذلیل خوار بندر بن جاؤ چنانچہ وہ بن گئے پس ہم نے اس واقعہ کو اس کے دیکھنے

والے سامنے کے لوگوں اور پچھلے سننے والے لوگوں کے لئے عبرت کا مظہر بنایا اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت کہ وہ ان بندروں کو دیکھ کر نصیحت پائیں۔ چنانچہ دیکھنے والے اور سننے والے لوگوں نے اس واقعہ سے بڑی نصیحت پائی۔

اور ایک واقعہ بھی سنو! جب حضرت موسیٰ نے کسی مذہبی ضرورت کے لئے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ بولے ہیں گائے ذبح کریں جو ایک بڑا مفید جانور ہے، دودھ دیتا ہے، جس سے مکھن نکلتا ہے، اس کے ماسوا اس میں کئی ایک اور خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان کے ہندو اس کو مانتے اور گئو ماتا کہتے ہیں انہوں نے کہا اے موسیٰ آپ ہم سے دل لگی کرتے ہیں یا واقعی شرعی حکم فرماتے ہیں؟ موسیٰ نے کہا معاذ اللہ دین میں مسخری اور دل لگی کرنا جاہلوں کا کام ہے میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ کسی شرعی حکم میں مخول اور دل لگی کر کے میں جاہل بنوں وہ بولے اگر سچ ہے تو پھر آپ خدا سے دعا کیجئے کہ وہ بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہے نہ بچھیا بلکہ دونوں عمروں کے بیچ کی ہے پس جو تم کو حکم ہوتا ہے وہ کر گزرو ۔ اینچ پینچ مت کرو تاہم وہ بولے کہ اپنے پروردگار سے دعا مانگ کہ وہ بتائے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہے تاکہ ہم جلدی ہی اس کو پالیں موسیٰ نے کہا وہ خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے اچھے خوش نما زرد رنگ کی ہے ایسی کہ دیکھنے والوں کو پسند آتی ہے اور بھلی لگتی ہے وہ پھر بولے کہ اب ایک کھٹکا رہ گیا مہربانی کر کے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ بھی بیان کردے کہ جامعہ صفات میں وہ کیا ہے؟

پس اس مرحلے کے بعد سب عقدے حل ہو جائیں گے اس وقت تک جو کچھ جناب نے فرمایا ہے اس سے ہمارے عقدۂ لاینحل کا پورا حل نہیں ہوا کیونکہ ایسی گائیں جو حضور نے بتائی ہیں ہم پر مشتبہ ہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت کی مراد پانے میں ہم کامیاب ہونگے یا نہیں اور ہم باور کراتے ہیں کہ یقیناً ہم آپ کی مقصودہ گائے کی تلاش میں ہدایت یاب ہوں گے اور کوئی عالم یا مولوی ہوتا تو گھبرا کر ان کو دھتکار دیتا حضرت موسیٰ تو بندۂ مامور خدا تھے انہوں نے ان کو دھتکارا نہیں بلکہ یہ کہا کہ وہ خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے جوان، خوش رنگ وغیرہ ہونے کے باوجود تختی نہیں ہے جو زمین میں ہل چلاتی ہو یا کھیت کو کنوئیں سے پانی پلاتی ہو بلکہ وہ ہر قسم کے داغ محنت سے صحیح سالم ہے اس میں کوئی داغ بھی نہیں ۔ بعد خرابیٔ بسیار وہ بولے کہ اب آپ نے خوب فرمایا اب تو آپ نے ایسے اوصاف بیان کر دیے کہ گویا وہ سامنے آ گئی پس انہوں نے اس گائے کو بآسانی تلاش کر کے ذبح کر دیا اور دیکھنے والا ان کے بار بار سوال کرنے پر یہ سمجھتا تھا کہ وہ کرنے کے نہیں تھے ۔

ترکیب:

اس رکوع کے شروع میں جو ﴿اِنَّ﴾ حرف تاکید ہے اس کی خبر یا تو محذوف ہے: أي سواء عند الله۔ یا ﴿مَنْ اٰمَنَ﴾ سے آخر تک جملہ اسمیہ خبر ہے ﴿اِنَّ﴾ کی۔ مطلب یہ ہے کہ نیک جزا پانے کے لیے محض ایمان کافی نہیں عمل صالح بھی چاہیے اس لیے جہاں جہاں ﴿اٰمَنُوْا﴾ کا لفظ آیا ہے ساتھ ہی جملہ ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ بھی آیا ہے۔

صابی سے مراد:

پادری صاحب نے اس رکوع میں صابی کی تحقیق کی ہے۔ ان کی تحقیق کا دائرہ مفسرین قرآن کے اقوال ہی میں دائر سائر رہا ہے۔ ہمارے نزدیک بھی صابی عرب میں ایک فرقہ اہل کتاب کا تھا جو اپنی نسبت انبیاء کرام کی طرف کرتا تھا۔ نمازیں بھی پڑھتا تھا۔ تاریخ ابوالفداء میں بھی یہی لکھا ہے،[1] جو پادری صاحب نے نقل کیا ہے اس لیے ہمیں بھی وہ قابل قبول ہے۔

اعتراض:

پادری صاحب نے اس مقام پر ایک سنگین اعتراض یہ کیا ہے کہ اس رکوع میں ﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ (منصوب) آیا ہے۔ مگر سورہ مائدہ میں ﴿الصّٰبِئُوْنَ﴾ (مرفوع) اس پر امام رازی کا قول بطور شہادت نقل کیا ہے جو یہ ہے:

''امام فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ یہی آیت سورۃ المائدہ میں اس طرح نازل ہوئی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [المائدة: ٦٩]

اور سورۃ الحج میں اس طرح نازل ہوئی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئِيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٤٧)

﴿الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ [الحج: ١٧]
ان آیتوں کی ترتیب میں بھی اختلاف ہے اور ایک جگہ ﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ مرفوع ﴿الصّٰبِئُوْنَ﴾ اور ایک جگہ منصوب ﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ آیا ہے۔
امام صاحب جواب دیتے ہیں کہ چونکہ متکلم احکم الحاکمین ہے اس لیے ضرور اس اختلاف میں کچھ فائدہ اور حکمت ہے۔ اگر ہم کو اس کی حکمت معلوم ہوتی تو گویا ہم علم میں کامل ہیں، اور اگر معلوم نہیں ہوتی تو یہ ہماری عقل کا قصور ہے نہ کہ خدا کے کلام کا۔ واللّٰہ أعلم بالصواب"

(جلد اول ص: ۲۷۰ مطبع ازہریہ، ص: ۳۸۲)

برہان:

امام رازی کی تفسیر کا حوالہ اس مطلب کے لیے دینے سے ہمیں گمان ہوتا ہے کہ پادری صاحب اس بات کو دل سے نکال چکے ہوں گے کہ کوئی مسلمان مولوی ہمارا جواب دے گا کیونکہ بزعم ان کے تفسیر کبیر کسی مولوی کے پاس کہاں؟ اور اگر ہوگی تو اس کو سمجھنے کی لیاقت کہاں؟ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پادری صاحب "تفسیر کبیر" کو اپنی سند میں پیش کر کے نیچے نوٹ نہ لکھتے۔

پادری صاحب نے لکھا ہے کہ امام رازی نے قرآن میں ﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ اور ﴿الصّٰبِئُوْنَ﴾ کے اختلاف کو صحیح نہیں سمجھا۔ اس کا جواب کچھ گزشتہ پرچہ میں درج ہوا ہے باقی آج ہدیہ ناظرین ہے۔

صابئین کی اعرابی حالت:

امام رازی صابئین کے نصب اور رفع کو ازروئے علم مشکل نہیں جانتے کیونکہ اسی قسم کی ترکیب سورۂ توبہ میں امام موصوف خود صحیح مان چکے ہیں۔ ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ کی تفسیر کے دوران میں فرماتے ہیں:

﴿رَسُوْلُهٗ﴾ کا عطف اللہ پر ہے حالانکہ وہ منصوب ہے، اور یہ مرفوع، مگر چونکہ اسم ﴿اِنَّ﴾ دراصل بحیثیت مبتدا مرفوع ہوتا ہے اس لیے اس کے محل پر عطف جائز ہے۔[1]

چنانچہ عربیت کے امام صاحب کشاف اس آیت کے ماتحت لکھتے ہیں:

"عطف علی أن المکسورۃ و اسمھا"[2] (تفسیر کشاف سورہ توبہ)

اگر آپ غور کریں تو کافیہ کا یہ قانون کہ "العطف علی اللفظ وعلی المحل جائز"[3] اس قسم کے مواقع کے لیے عام ہے۔ اس اصول سے ﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ بعمل ﴿اِنَّ﴾ اور ﴿الصّٰبِئُوْنَ﴾ مرفوع علی المحل دونوں طرح جائز ہے۔

امام رازی کا مقصود ان کی ساری عبارت دیکھنے سے سمجھ سکتے ہیں جو یہ ہے:

"وفي سورۃ الحج ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئِيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ فھل في اختلاف ھذہ الآیات بتقدیم الصنوف وتأخیرھا ورفع الصابئین في آیة ونصبھا في أُخریٰ فائدۃ تقتضي ذلك"

(تفسیر کبیر، جلد اول ص:۳۸۲)

یعنی ان قسموں میں سے ایک جگہ بعض کو آگے پھر اسے پیچھے کرنے اور کبھی کسی کو نصب دینے کبھی رفع دینے میں کیا فائدہ ہے؟

امام ممدوح از روئے علم نحو سوال نہیں کرتے بلکہ وہ پوچھتے ہیں کہ اس تفنن

---

[1] التفسیر الکبیر (۲۷/ ٦٧٤)

[2] تفسیر الکشاف (۲/ ۲۳۳)

[3] شرح الرضي علی الکافیة (۲/ ۱۷۳)

عبارت میں کیا فائدہ ہے؟

پادری صاحب! میرا گمان ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ اختلاف تضاد، اور چیز ہے اور اختلاف تفنن عبارت اور ۔ مثلاً ایک شخص ایک کتاب کو اس طرح شروع کرے کہ الحمد ﷲ ۔ دوسری کتاب کو یوں شروع کرے کہ "ﷲ الحمد" تو یہ تفنن عبارت ہے نہ کہ اختلاف تضاد۔ آپ نے تفسیر کبیر کی ساری عبارت نقل کی ہوتی تو آپ کے اہل علم عربی دان ناظرین ہی آپ کو قائل کر دیتے۔ پس اس وقت ہمارے سامنے یہ تین فقرے ہیں:

1. آپ نے تفسیر کبیر کی عبارت سے ضروری حصہ دانستہ حذف کر کے مضمون کو خبط کیا۔
2. آپ نے تفسیر کبیر کی عبارت کا مطلب غلط بیان کیا۔
3. آپ نے تفسیر کبیر کو نہیں سمجھا۔

ان تینوں فقروں کی بابت میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ ان فقروں میں سے ہم آپ کے حق میں کس فقرہ کا یقین کریں۔ آہ! ؎

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گویم[1]

پادری صاحب کی دلیری:

نوٹ: پادری صاحب نے بڑی دلیری سے اس جگہ حاشیہ پر ایک نوٹ لکھا ہے جو یہ ہے:

"جو شخص کم از کم علم نحو کے ابتدائی مسائل سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ حروف مشبہ بالفعل کا اسم منصوب اور خبر مرفوع ہوتی ہے۔ مثلاً "اِنَّ زیداً قائمٌ" چنانچہ علامہ جرجانی کہتے ہیں ؎

اِنَّ اَنَّ کاَنَّ لیت لکنَّ لعلَّ

---

[1] بروز حشر اگر پوچھ لیا گیا کہ خسرو کو کیوں قتل کیا تھا تم پر قربان ہو جاؤں! کیا کہو گے تا کہ میں بھی وہی کہوں؟

ناصب اسم اند و رافع در خبر ضد مادلا

''لیکن قرآن نے اس کی رعایت نہیں رکھی، کہیں منصوب اور کہیں مرفوع، جیسا چاہا ویسا لایا۔ حقیقت میں یہ ایک مشکل معاملہ ہے۔ جس کی تاویل نہیں ہوسکتی ہے ۔ ورنہ امام فخرالدین رازی جیسے شخص ضرور اس کی تاویل کرتے۔'' (ص:۲۰۸،۲۰۹)

برہان:

مجھے اس نوٹ کے دیکھنے سے پادری صاحب کا پہلا ایک نوٹ یاد آگیا جو آپ نے آیت ﴿اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ کو غلط بتانے کے لیے لکھا تھا، جس کا ذکر مع جواب اہلحدیث ۳۰؍ستمبر ۳۲ء میں ہوچکا ہے۔[1] مختصر یہ ہے کہ آپ کا نوٹ بجائے خود غلط ہے، جس کا جواب ہم کافیہ اور کشاف کے حوالے سے دے چکے ہیں۔

رفعِ طور:

اس رکوع میں جو رفعِ طور کا ذکر ہے پادری صاحب اس کو بائبل کے موافق کہہ کر صحیح جانتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے'' (خروج ۱۹:۱۷)۔ (سلطان التفاسیر، ص:۲۱۲)

ہمارے ساتھ اتفاق کرنے کے بعد پادری صاحب سرسید احمد خان مرحوم سے مختلف ہوئے ہیں جس میں ہمیں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

لطیفہ:

مولوی احمدالدین صاحب امرتسری نے ﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ کے معنی لکھے ہیں:

''صابی وہ ہیں جو الہامی دینوں سے الگ ہیں۔'' (بیان ص:۵۱۵)

---

[1] دیکھیں: (ص: ۲۰۵)

﴿الصّٰبِئِیْنَ﴾ سے مراد ایسے لوگ ہیں جیسے آج کل ہمارے برہمو سماج اور ریشنلسٹ''۔ (ص:۵۱۶)

مولوی صاحب موصوف کی پارٹی کا ایک ماہوار رسالہ (بلاغ) نکلتا ہے اس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ہم (مولوی احمد الدین مع پارٹی) برہمو ہیں۔

(بلاغ بابت مارچ ۱۹۲۹ء ص:۱۸)

ان تینوں فقروں کو منطقی طریق پر ہم رکھتے ہیں تو یہ صورت ہوتی ہے:

① مولوی احمد الدین مع پارٹی کے برہمو ہیں۔

② برہمو صابی ہیں۔

③ صابی الہامی ادیان سے خارج ہیں۔

نتیجہ:

اگر گویم زباں سوزد [1]

معتدین فی السبت:

پادری صاحب نے معتدین فی السبت پر چبھتی ہوئی رمز کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

''اس واقعہ (بنی اسرائیل کا نافرمانی کرنے سے بندر بن جانے) کا ذکر صحف مطہرہ میں نہیں ہے۔'' (ص:۲۱۷)

برہان:

بے شک بائبل کے جو فقرات آپ نے نقل کیے ہیں ان میں وہ ذکر نہیں جو قرآن مجید میں ہے مگر آپ نے دوسرے مقامات میں تلاش کر لیا ہوتا۔ چنانچہ آپ خود لکھتے ہیں:

''مسلمان مفسر کہتے ہیں یہ واقعہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا نہیں بلکہ حضرت داود کے زمانہ کا ہے۔'' (ص:۲۱۷)

---

[1] اگر میں کہوں تو زبان جلتی ہے۔

قرآن شریف میں کسی زمانہ کا نام نہیں بلکہ قوم بنی اسرائیل کا واقعہ بیان ہوا۔
اس واقعے میں سے جتنا کچھ بائبل سے ثابت ہوتا ہے وہ تو ہم پھر بتائیں گے مگر آپ کے اس فقرے سے: ''صحف مطہرہ میں اس کا ذکر نہیں۔'' (ص:۲۱۷، ۲۲۲) وغیرہ سے ہم متاثر نہیں ہوسکتے، کیونکہ مسلمانوں کے اعتقاد میں وہ کتب جن کو آپ صحف مطہرہ کہتے ہیں ایک ناتمام تاریخی مجموعہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، سو جس طرح مورخین کا طریق ہے کہ جو واقعہ ان کو پسند ہو یا ان کے حسب مذاق ہو اسے نقل کر لیتے ہیں اور جو ان کے مذاق کا نہ ہو یا اس کا ثبوت ان کے نزدیک نہ ہو وہ نہیں کرتے، اسی طرح ان کتابوں کے لکھنے والوں نے کیا۔ لیکن اس سے اس واقعہ کا عدم لازم نہیں آتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض واقعات ایک انجیل میں مذکور ہیں دوسری میں نہیں۔ متی محصول لینے والے کی مسیح سے ملاقات، پہاڑی کا وعظ وغیرہ ایک انجیل میں ہیں دوسری میں نہیں۔ چونکہ مسلمانوں کے اعتقاد میں موجودہ بائبل کو تاریخی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں، اس لیے کسی الہامی کتاب کی صحت اس کی موافقت پر مبنی نہیں ہوسکتی۔

اگر آپ فرمائیں کہ قرآن مجید میں تورات کی تصدیق آئی ہے پھر کیوں نہ بائبل پر مدار رکھا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس تورات کی تصدیق آئی ہے وہ چند احکام ہیں جن کو بائبل موجودہ کے ایک صفحہ سے کم پر لکھ کر کہا گیا ہے:

> ''یہی باتیں خداوند نے پہاڑ پر آگ کے اور بدلی کے اور بے نہایت تاریکی کے درمیان سے تمھاری ساری جماعت کو بلند آواز سے کہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہ فرمایا اور اس نے ان کو پتھر کی دو لوحوں پر لکھا اور انھیں میرے سپرد کیا۔'' (استثناء ۵:۲۲)

یہ عبارت بالکل قرآن کے موافق ہے۔ غور سے سنیے:

﴿ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا

لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ [الأعراف: ١٤٥]

''ہم (خدا) نے موسیٰ کو ہر قسم کی نصیحت تختیوں پر لکھ دی۔''

پس ہم مسلمان صرف ان احکام کو''تورات'' مصدقہ قرآن مانتے ہیں دگر ہیچ۔

نوٹ: مزید تفصیل تحریف کی بحث میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

سبت کی بحث:

پادری صاحب نے بائبل سے جو عبارت متعلقہ سبت نقل کی ہے غالباً قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ نہیں بلکہ مندرجہ ذیل واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو ہم نقل کرتے ہیں:

''انھیں دنوں میں میں نے کتنوں کو دیکھا جو سبت کے دن انگوروں کو کولہوؤں میں کچلتے ہیں اور پولے باندھتے اور گدھے لادتے ہیں اسی طرح مے اور انگور اور انجیر اور سارے بوجھ دیکھے جنھیں وے سبت کے دن یروشلم میں لائے اور جس دن وے سیدھا بیچنے لگے ان کی بدی ان پر جتائی اور وہاں صور کے لوگ بھی تکتے تھے جو مچھلی اور ہر طرح کی چیزیں لا کے سبت کے دن یہوداہ اور یروشلم کے لوگوں کے ہاتھ بیچتے تھے۔ تب میں نے یہوداہ کے شریف لوگوں سے تکرار کر کے کہا کہ یہ کیسا برا کام ہے جو تم کرتے ہو کہ سبت کے دن کو مقدس نہیں جانتے کیا تمھارے باپ دادوں نے ایسا نہیں کیا اور ہمارا خدا ہم پر اور اس شہر پر یہ سب آفتیں نہیں لایا تو بھی تم سبت کے دن کو پاک نہ مان کے اسرائیل پر زیادہ غضب بھڑکاتے ہو۔'' (نحمیاہ ۱۳:۱۵تا ۱۹)

اس عبارت کو ہم نے اس لیے مشارٌ الیہا کہا ہے کہ اس میں سبت کے روز مچھلیاں پکڑنے والوں کا خاص ذکر ہے اور اس فعل کو موجب مزید غضب قرار دیا ہے

برخلاف عبارت پادری صاحب کے کہ اس میں یہ بات نہیں بلکہ صرف سبت کے روز نافرمانی کا ذکر ہے۔

ہاں ہم مانتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو ان لوگوں کے بندر بنائے جانے کا ذکر ہے وہ ان عبارتوں میں نہیں، ہمارا گمان ہے کہ یہ واقعہ بوجہ قومی بدنامی کے حذف کر دیا گیا ہے۔

بندر بنایا جانا:

سرسید احمد خان مرحوم نے مجاہد (تابعی) کے قول کی بنا پر بندروں کی تفسیر ''بداخلاق لوگوں'' سے کی ہے۔ میں آپ سے ضرور سفارش کرتا کہ اگر آپ کو ان کے بندر بن جانے میں شبہ ہے تو آپ سرسید صاحب سے موافقت کرلیں مگر آپ سرسید سے حسن ظن رکھ کر بھی اس قول کی نسبت بایں الفاظ اظہار ناپسندیدگی فرما چکے ہیں کہ ''سرسید کو شاید اس کا علم نہیں کہ امام فخرالدین رازی نے مجاہد کے اس قول کو بری طرح سے رد کیا ہے۔'' (سلطان ص:۲۲۰) بس میں اپنے ارادہ سفارش سے باز رہتا ہوں۔

مرزا صاحب قادیانی نے سرسید کے فیض سے اس آیت کے متعلق یہ کہا ہے:

> ''یہ بات تو نہ تھی کہ وہ حقیقت میں تناسخ کے طور پر بندر ہوگئے تھے بلکہ اصل حقیقت یہی تھی کہ بندروں اور سوروں کی طرح نفسانی جذبات ان میں پیدا ہوگئے تھے۔ (خزینۃ العرفان منقول از کتاب ست بچن ص:۸۲،۸۳)

مرزا صاحب کے مرید مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے بھی یہی اختیار کیا ہے۔ (بیان القرآن ص:۷۵، جلد اول)

سرسید احمد خان مرحوم کے امرتسری مستفیض مولوی احمد دین صاحب نے بھی یہی لکھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

''بنی اسرائیل سبت جیسی ہلکی باتوں کو بھی نہیں نباہ سکے ...تو کہا گیا جاؤ بنو

بندر دھتکارے اور پھٹکارے ہوئے۔ یہ اسی قسم کی بات ہے جس طرح استاد کسی شاگرد کی تعلیم میں ہر طرح کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بالکل توجہ نہیں کرتا اور کچھ سیکھنا نہیں چاہتا تو آخر استاد کہہ دیتا ہے کہ جا گدھا بن۔'' (بیان للناس جلد اول ص:۵۱۱)

اہلحدیث:

امثال میں بے شک الفاظ کی حقیقت مراد نہیں ہوتی مگر امثال ہر زبان میں سماعی ہوتی ہیں یعنی ہر زبان والے جس حیوان کو جس وصف میں مشہور جان کر انسان کو اس سے تشبیہ دیں وہی مثل صحیح ہوگی۔ امثال میں قیاس جاری نہیں ہوسکتا۔ مثلاً حماقت کے وصف میں گدھا مشہور ہے پس کسی انسان کو حماقت کی وجہ سے گدھا کہہ سکتے ہیں مگر گھوڑا نہیں کہہ سکتے یعنی استاد غبی شاگرد کو گدھا کہہ سکتا ہے، ''جا گھوڑا بن'' نہیں کہہ سکتا کیونکہ گھوڑا باوجود بے عقل ہونے کے اس وصف میں مشہور نہیں، اس لیے اس کے ساتھ تشبیہ بھی جائز نہ ہوگی۔ پس سنیے! چونکہ بندر عرب میں کسی قسم کی بد اخلاقی سے اس درجہ مشہور نہیں ہے جس میں مثال کے طور پر کسی انسان کو بندر کہا جائے، مدعی کا فرض ہے کہ عرب کے لٹریچر سے اس کی ایک ہی مثال پیش کرے ورنہ کہا جائے گا کہ قرآن شریف کی یہ تفسیر، عربی زبان کے خلاف تفسیر بالرائے ہے۔

چونکہ بندر کے ساتھ کسی قسم کی بداخلاقی میں تمثیل نہیں دی جاتی اس لیے قرآن مجید کی آیت موصوفہ کے معنی وہی صحیح ہوں گے جو مفسرین نے کیے ہیں مگر ان معنی کے بتانے سے پہلے ایک قانون قدرت کا بتانا ضروری ہے جو قرآن مجید ہی کے لفظوں میں مذکور ہے:

﴿إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ [البقرة: ١١٧]

''خدا جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو بس اسے صرف اتنا کہتا ہے کہ

''ہوجا'' پس وہ ہوجاتی ہے۔''

یہ ایک اٹل قانون ہے کہ ﴿كُنْ﴾ اور ﴿يَكُوْنُ﴾ میں کوئی چیز حائل اور مانع نہیں ہوتی۔ پس اس قانون قدرت کے ماتحت غور کیجیے کہ ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً﴾ کے بعد ''کانوا قردۃ'' ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ جواب دینے سے پہلے اس سے متصلہ آیت ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا﴾ کو ملحوظ رکھیں تو جواب یہی ہوگا کہ ''صاروا قردۃ خاسئین'' رہی یہ بات کہ موجودہ بندر انھی کی نسل سے ہیں یا اور ہیں یا وہ کہاں گئے؟ وغیرہ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت موصوفہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں بندر کی نوع موجود تھی۔ اس لیے یہ بندر ان کی نسل سے نہیں۔ ہاں ایک حدیث میں اس کا واضح جواب یوں آیا ہے کہ وہ بندر تین دن تک زندہ رہے تھے پھر وہ سارے مر گئے۔ [1]

غور کیجیے! ایک معمولی گاؤں کا واقعہ ہے اور چند انسانوں کا، پھر زمانہ بھی ظلمت کا نہ آج کل کا سا کہ ادھر واقعہ ہوا اور اُدھر روزانہ اخبارات میں شائع ہوگیا۔ ایسی صورت میں یہ واقعہ اگر قومی طور پر مشہور نہ ہو تو اس میں کیا استبعاد؟ ہاں اس سے زیادہ مشہور ترین واقعہ سنیے جو ساری دنیا کی نظر میں آیا ہوگا۔ انجیل میں لکھا ہے:

''اور یسوع نے پھر بڑے زور سے چلا کر جان دی اور دیکھو ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھے اُٹھیں اور اس کے اٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر اور مقدس شہر میں جا کر بہتوں کو نظر آئیں۔'' (متی: ۲۰:۵)

---

[1] یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن جریر (۱/ ۳۷۰) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۵۰) الدر المنثور (۱/ ۱۸٤) نیز دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦٦۳) مسند أحمد (۱/ ۳۹۰)

کیا یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ اس کے ظہور کے بعد ساری دنیا مسیحی ہو جاتی لیکن ایسا ہوا یا کسی غیر مؤرخ نے اس واقعہ کو لکھا؟ نہیں۔ غالباً اس کا جواب یہی ہوگا:

''جتنے کام یسوع نے کیے اگر وہ جدا جدا کیے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں جو کتابیں اس موضوع پر لکھی جاتیں وہ دنیا میں نہ سما سکتیں۔''

(انجیل یوحنا ۲۱:۲۵)

گو یہ بیان مبالغہ کی حد تک پہنچتا ہے لیکن اتنا حصہ ضرور صحیح ہے کہ انبیاء اور مصلحین کے بہت سے واقعات اشاعت سے رہ جاتے ہیں۔ بندر سور بننے کا قصہ بھی اسی قسم سے ہے۔ خاص کر اس لیے کہ کسی نبی کے زمانے کا نہیں بلکہ ایک غیر مشہور کوردہ کا غیر مشہو واقعہ ہے پھر اگر صحف میں اس کا ذکر نہ ہو تو کیا تعجب ؟!

ذبحِ بقرہ کی نسبت:

بقرہ کی نسبت پادری صاحب نے چنداں تعرض نہیں کیا، صرف اتنا لکھا ہے:

''ذبح بقرہ کا واقعہ جس طرح قرآن شریف میں بیان ہوا صحف مطہرہ میں مذکور نہیں۔'' (سلطان التفاسیر، ص:۲۲۲)

برہان:

جن لوگوں نے قرآن اور مروجہ تورات میں حضرت یوسف کا قصہ پڑھا ہے وہ جان سکتے ہیں کہ باوجود وحدتِ واقعہ کے دونوں کتابوں کے بیانات میں کتنا فرق ہے مگر اس اختلاف لفظی سے اصل واقعہ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایک دانشمند دونوں کتابوں سے قصہ یوسفی کی اصلیت پا سکتا ہے اسی طرح ذبح بقرہ میں گو بظاہر اختلاف لفظی ہو مگر تاہم واقعہ کی صحت ملتی ہے جو پادری صاحب کی منقولہ عبارت میں بھی مضمر ہے۔ اللہ اعلم

سر سید کا نظریہ:

پادری صاحب نے اس موقع پر بھی سید احمد خان مرحوم کو یاد کیا ہے۔ سر سید

احمد خان نے اس ''بقرہ'' کی تفسیر میں لکھا ہے:

''وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر چھوڑا ہوا تھا... اسی کے ذبح کرڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا اور بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح سے بچ جائے۔'' (تفسیر احمدی، ص:۱۰۱)

سرسید مرحوم کے امرتسری مستفیض مولوی احمدالدین صاحب نے اسی قول کی تھوڑی سی تفصیل کی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر گئے تو باوجود حضرت ہارون علیہ السلام کی موجودگی کے اور باوجود ان کی تمام کوششوں کے اپنے زیوروں سے بچھڑا بنا کر اسے پوجتے رہے۔ اس سے صاف روشن ہے کہ وہ گاؤ پرستی پر فدا تھے۔ یہ عادت انھوں نے فرعون کی غلامی میں ملک مصر سے حاصل کی تھی جب ان کے پاس گائے کے بچھڑے کے بنانے کا سامان نہ رہا اور ان کی طبیعت پھر گاؤ پرستی پر مائل ہوئی تو اب کی دفعہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چھپا کر ایک زندہ سانڈھ چھوڑا۔ پہلا تو گائے کے بچہ کا ایک ڈھانچہ تھا مگر یہ نوجوان سانڈھ تھا۔ پہلا جلا کر اڑایا گیا، یہ ذبح کیا گیا۔ پہلا کھلم کھلا پکڑا گیا تھا، دوسرے کے چھپانے کی تمام کوششیں کی گئیں۔'' (تفسیر بیان للناس، ص:۵۱۱، ۵۱۲)

آخر کلام میں سرسید نے لکھا ہے:

''مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھا ہے کہ یہ قصہ اگلی آیت ﴿وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ سے متعلق ہے۔'' (تفسیر احمدی، ص:۱۰۱)

سرسید کے امرتسری مستفیض نے بھی یوں لکھا ہے:

''جو لوگ ان دونوں کو ایک ہی جانتے ہیں بالکل غلطی پر ہیں۔''
(تفسیر بیان، ص:۵۱۲)

یہی معنی ہیں اس مصرع کے ۔

آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم [1]

مولوی محمد علی صاحب لاہوری (احمدی) لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل میں کسی خاص خوبصورت گائے کی عظمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بچھڑے کی پرستش کی طرح اس کی پرستش کا خطرہ ہو گیا تھا اس لیے خدا نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا۔'' (ج ا ص:۷۶)

مولوی عبداللہ چکڑالوی نے لکھا ہے:

''گائے کے ذبح کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس لیے دیا کہ جملہ انبیاء اس لیے مبعوث من اللہ ہوتے رہے ہیں کہ ہر قسم کے شرک، بت پرستی، گائے پرستی وغیرہ وغیرہ کو دور کریں۔'' (ترجمۂ قرآن، پارہ اول ص:۵۵)

مختصر یہ کہ سرسید اس بقرہ کو سانڈھ کہتے ہیں۔ مولوی احمدالدین سرسید کے بالکل موافق ہیں، مولوی محمد علی لاہوری اور مولوی عبداللہ چکڑالوی دونوں اس کو گائے کہتے ہیں۔ پادری صاحب سرسید کے قول کہ ''وہ سانڈ تھا'' کی نسبت لکھتے ہیں:

''سرسید کا یہ کہنا کہ وہ بیل پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر بطور سانڈ کے چھوڑا ہوا تھا بے اصل ہے۔'' (ص:۲۲۳)

مگر ہم بذات خود اس قول کو ممکن الصحت کہتے ہیں۔

رکوع نہم:

﴿ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ

[1] جو استاد ازل نے کہا ہے ہم بھی وہی کہہ رہے ہیں۔

بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ
لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ
وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ۝ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ
هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَا
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ
لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ
اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ
لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ
لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ
وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ
اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ
عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ
سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ٧٢ تا ٨٢]

ترجمہ: اور سنو جب تم بنی اسرائیل نے ایک شخص کو قتل کر کے اس

میں جھگڑا کیا ایک دوسرے کو الزام لگایا جیسا کہ عام دستور ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر الزام لگایا کرتے ہیں تم نے بھی اس میں تنازع کیا جو کچھ تم چھپاتے تھے اللہ اسے ظاہر کرنے کو تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا پس ہم نے کہا اس مقتول کا ایک حصہ یعنی سر دوسرے حصہ جسم سے لگاؤ یہ زندہ ہوکر خود بتادے گا کہ کس نے اسے مارا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا ہم نے ان کو کہا سنو! اسی طرح بغیر ظاہری اسباب کے خدا مردوں کو زندہ کرے گا۔ اور تم کو اپنے نشان دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو اس وقت تو تم سمجھ گئے مگر اس کے بعد پھر تمہارے دل ایسے سخت ہوگئے گویا کہ وہ پتھر ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت کسی کی بات کا ان کو اثر نہ کرتی نہ وہ کسی کی سنتے حالانکہ پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان سے چشمے جاری ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے تھوڑا سا پانی نکل آتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کی قومی تاریخ تم پڑھو تو حیران ہو جاؤ کہ کبھی تو یہ لوگ ایسے نیک ہوجاتے ہیں کہ فرشتوں کی ریس کرتے، کبھی ایسے ہوجاتے کہ ہر قسم کی بدکاریوں کا ارتکاب کرتے، یہاں تک کہ ان کے پیشوا بھی دنیا داری میں آلودہ ہوجاتے، کیا تم مسلمان ان سے امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہاری بات دین اسلام کی تعلیم مان جائیں گے۔ ان میں تو اب بھی ایک گروہ ایسا ہے جو تورات سے اصل کلام اللہ سن کر سمجھ کر جان بوجھ کر اصل جگہ سے بدل دیتے ہیں اور جب مسلمان ایمانداروں سے ملتے ہیں تو ان کو اپنا ایماندار ہونا باور کروانے کو کہتے ہیں کہ ہم تو مدت سے تمہاری کتاب پر ایمان لائے ہوئے ہیں پس ہم تم کسی طرح جدا نہیں اور جب ایک دوسرے سے علیحدگی میں ملتے ہیں تو جو

لوگ مسلمانوں سے نہیں ملتے وہ ملنے والوں کو بطور فہمائش کے کہتے ہیں کہ کیا تم ان مسلمانوں کو اپنی کتابوں سے وہ باتیں بتاتے ہو جو خدا نے تم پر واضح کی ہیں تا کہ بعد موت وہ مسلمان لوگ اللہ کے پاس پہنچ کر اس کتاب کے ذریعہ سے تمہارے ساتھ جھگڑا کریں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم جھوٹے ہو کر عذاب میں پھنسو اور وہ نجات پا کر عزت پا جائیں کیا تم سمجھتے نہیں ہو ۔ بھلا یہ لوگ جو ایسی باتیں بناتے ہیں جانتے نہیں ان کو معلوم نہیں کہ جو کچھ یہ لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں خدا سب کچھ جانتا ہے پھر اس سے چھپ کیسے سکتے ہیں اور ان میں سے بعض بلکہ اکثر بالکل بے علم ہیں کتاب کا ایک حرف نہیں جانتے ہاں دلی امنگیں ان کو یاد ہیں اور سوائے قیاس اور گمان کے اور کچھ نہیں جانتے ۔ محض سنی سنائی جھوٹی امنگوں پر ان کا مدار ہے مثلاً جو کسی بزرگ کی قبر پر کپڑا چڑھائے وہ بخشا جاتا ہے، جو نذر و نیاز دے وہ بخشا جاتا ہے، پس ان کا مبلغ علم تو اسی قدر ہے، ان کے علاوہ دوسرے جو علمدار لوگ ہیں وہ اپنے رنگ میں بہت برے ہیں، حتیٰ کہ غلط مسائل کو شرعی رنگ دیدیتے ہیں پس افسوس ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب یعنی کوئی مضمون اپنے ہاتھوں سے لکھ کر اس کو مستند کرنے کے لئے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے منزل ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں سے تھوڑے سے فوائد حاصل کریں پس افسوس ہے ان کے لئے ان کے لکھنے کی وجہ سے اور افسوس ہے ان کے لئے ان کی بد کسبی کی وجہ سے اور سنو باوجود اس بدعملی کے کہتے ہیں کہ آگ کا عذاب ہم کو صرف چند روز لگے گا کیونکہ ہمارے بزرگوں نے بچھڑے کی پوجا چند روز کی تھی تو کہہ تم جو ایسا کہتے ہو کیا تم نے اللہ کے ہاں سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے اگر ایسی بات ہے تو بے شک خدا اپنا وعدہ خلاف نہیں

کرے گا۔ جہاں تک ہماری تحقیق ہے یہ بات تو نہیں کہ تم سے خدا نے اس مضمون کا کوئی وعدہ کیا ہوا ہے۔ تو کیا پھر اللہ کے حق میں وہ بات کہتے ہو جو تم بھی یقیناً نہیں جانتے ہاں اصل بات سنو! جو لوگ برا کام کریں یہاں تک کہ برائی ان کو گھیر لے چاروں طرف سے ان کے دل پر برائی کا قبضہ ہو جائے تو یہی لوگ آگ میں جانے کے لائق ہوں گے جو اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لا کر اعمال صالحہ کرتے ہیں وہی لوگ نجات پا کر جنت میں داخل ہونے کے لائق ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

مقتول کون؟

پادری صاحب نے اس آیت ﴿اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ کی تفسیر کچھ نہیں کی نہ یہ بتایا ہے کہ اس مقتول نفس سے کیا مراد ہے؟ ہاں تورات مروجہ کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں بطور قانون کلی کے ذکر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر اس سرزمین میں جس کا خداوند تیرا خدا تجھے وارث کرتا ہے کسی مقتول کی لاش پڑی ہوئی ملے اور معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے، تب تیرے بزرگ اور تیرے سارے قاضی باہر نکلیں۔ اور ان بستیوں تک جو مقتول کے گرداگرد ہیں درمیان کو ناپیں۔ اور یوں ہوگا کہ جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ سے ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو۔ اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو ایک نہبر وادی میں جو نہ جوتی گئی ہو نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں۔ اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں۔ تب کاہن بنی لاوی نزدیک آئیں۔ کیونکہ خداوند تیرے خدا نے انھیں کو چن لیا ہے کہ اس کی خدمت کریں اور خداوند کا نام لے کر برکت

بخشیں۔ اور انھیں کے سخن سے ہر ایک جھگڑا اور ہر ایک مار پیٹ فیصل ہوگی۔ پھر اس شہر کے سارے بزرگ جو اس مقتول سے نزدیک ہیں اس بچھیا کے اوپر جو اس وادی میں گردن ماری گئی اپنے ہاتھ دھوئیں۔ اور بولیں اور کہیں کہ ہمارے ہاتھوں نے یہ خون نہیں کیا، نہ ہماری آنکھوں نے دیکھا۔ اے خداوند! اپنی قوم اسرائیل کا کفارہ لے جنھیں تو نے چھڑایا ہے، اور بے گناہی کا خون اپنی قوم اسرائیل کے ذمہ مت رکھ۔ تب وہ خون انھیں بخشا جائے گا۔ سو جس وقت تو وہ کرے جو خداوند کے نزدیک درست ہے تو تو بے گناہی کا خون اپنے درمیان سے دفع کرے گا۔'' (استثناء ۲۱:۱ تا ۹)

اعتراض:

اس عبارت کو نقل کر کے صرف اتنا اعتراض کیا ہے:

''قرآن شریف کے بیان میں اور صحف مطہرہ کے بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، معلوم نہیں کہ یہ خلط ملط واقعات کس طرح اور کہاں سے قرآن شریف میں داخل ہو گئے۔'' (ص: ۲۲۸)

برہان:

گو ہم نے آیت ذبح کو اس قصے سے الگ ہی رکھا ہے لیکن جن لوگوں نے ان دونوں واقعات کو ایک سمجھا ہے پادری صاحب نے تورات سے یہ عبارت نقل کر کے ان کی تائید کی ہے جس کی وجہ سے وہ پادری صاحب کے شکر گزار ہیں، وہ کہہ سکتے ہیں کہ پادری صاحب کی منقولہ عبارت قانون کی شکل رکھتی ہے اور قرآنی قصہ ایک خاص واقعہ ہے جس کا فیصلہ اسی قانون کے ماتحت کیا گیا ہوگا، اس لیے اختلاف نہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تعزیرات ہند کی دفعہ قانون ہے لیکن اس کے ماتحت جو

مقدمہ طے کیا جائے اس کی مثل کے الفاظ قانونی دفعہ سے گو مختلف ہوں لیکن فیصلہ اسی کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس لیے پادری صاحب نے اعتراض جلدی میں کر دیا۔

اس کے علاوہ اصل اصولی جواب ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قرآن بائبل سے مطابقت کا ذمہ دار نہیں بلکہ جو کچھ قرآن کہے صحیح وہی ہے۔ اس وجہ کے علاوہ بحث تحریف میں بھی معقول وجہ ملے گی۔

مولوی محمد علی صاحب لاہوری احمدی نے لکھا ہے کہ اس نفس مقتول سے مراد حضرت مسیح علیہ السلام ہیں اور ﴿اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ کی عجیب وغریب تفسیر لکھی ہے۔ جس کی بابت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''لاعين رأت ولا أذن سمعت'' (نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی) آپ لکھتے ہیں:

''اگر ایک طرف قرائن صفائی سے بتاتے ہیں کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا نبی جس کے قتل میں اختلاف ہوا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو وہ مسیح علیہ السلام ہیں۔ گویا قوم یہود کی بے اعتدالیوں کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک طرف تو گائے تک کو ذبح کرنے میں اس قدر لیت ولعل کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نبی کو قتل کرنے میں اس قدر دلیری ہے۔ حضرت مسیح کی طرف اشارہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فوراً بعد فرمایا ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ پھر تمھارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے اور قرآن شریف سے ہی ثابت ہے:

﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ [الحديد: ١٦]

یعنی ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے تو پس یہ کوئی ایسا قتل ہے جو حضرت موسیٰ سے لمبا زمانہ گزرنے کے بعد وقوع میں آیا۔'' (بیان القرآن، ص: ٧٩)

برہان:

ہر قرآن خواں کے دل میں اس تفسیر پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ حضرت مسیح کے حق میں تو صاف ارشاد ہے: ﴿مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ﴾ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو مقتول کہنا اس آیت کے صریح خلاف ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کی غرض سے آپ لکھتے ہیں:

''رہا یہ سوال کہ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ سے کیا مراد ہے؟ اضربوہ میں ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ بعض وقت نفس کی ضمیر بلحاظ معنی مذکر آجاتی ہے اور ''بعضہا'' کی ضمیر فعل قتل کی طرف جاتی ہے یعنی بعض قتل سے اس کو مار دو یا فعل قتل اس پر پورا وارد نہ ہونے دو۔ چنانچہ ضمیر کا قتل کی طرف جانا جو مصدر فعل سے مفہوم ہے، بحرالحیط میں بھی تسلیم کیا گیا ہے اور یہی سچ ہے کہ حضرت مسیح پر پورا فعل قتل وارد نہیں ہوا۔ صلیب پر آپ صرف تین گھنٹے رہے اور اتنی تھوڑی دیر میں کوئی شخص صلیب کی موت سے مر نہیں سکتا۔ آپ کے ساتھ جو چور صلیب دیے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑی گئیں، آپ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں یہی ''فاضربوہ ببعضہا'' ہے، اور ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ کہہ کر بتادیا کہ جس کو تم مردہ خیال کر بیٹھے تھے اسے خدا نے یوں زندہ رکھا یا زندہ کردیا، اور یہ جو فرمایا ہے: ﴿يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ تو بتایا کہ مسیح جو تم کو مردہ معلوم ہوتا تھا جس طرح خدا نے زندہ کردیا، کیونکہ اللہ کے نام کو بلند کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا اسی طرح اگر تم بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا کام اختیار کرو تو گو تم ایک مردہ قوم ہو اللہ تعالیٰ تمھیں زندگی عطا فرمائے گا۔'' (تفسیر بیان القرآن، ص:۷۹)

ناظرین کرام! اگر ہم اس تفسیر کو عجائبات سے نہ کہیں تو کیا کہیں؟ آپ حضرات جونام تجویز کریں ہم منظور کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا دل متوجہ نہیں ہوتا کہ ہم اس تفسیر کا جواب لکھیں۔ علما اور طلبہ خود سوچ لیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ مدارس دینیہ میں تفسیر بالرائے کی مثال کی جہاں ضرورت ہو مدرسین اس کو پیش کردیا کریں، اس ضرورت کے لیے کارآمد چیز ہے۔

مولوی احمد الدین صاحب امرتسری نے اس سے بھی عجیب تر بات کہی ہے، آپ نے اس مقتول سے حضرت ہارون برادر اکبر حضرت موسیٰ علیہما السلام مراد لیے ہیں۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

> ''جب بنی اسرائیل نے بیابان میں دوبارہ ایک جوان سانڈ کی حضرت موسیٰ سے پوشیدہ کرکے پوجا شروع کی اور حضرت موسیٰ کو اس کا پتہ لگ گیا اور انھوں نے حکم الٰہی سے ذبح کرا دیا، تو اس وقت بنی اسرائیل یہ سمجھے کہ ہماری یہ چغلی بھی غالباً حضرت ہارون نے ہی کھائی ہے، انھوں نے موقع پا کر اور حضرت ہارون کو الگ لے جا کر زد و کوب یا کسی اور ذریعہ سے قتل کردیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بر وقت پتہ لگ گیا تو انھوں نے ان کے جسم مبارک کو اٹھوا منگوایا، اور بنی اسرائیل سے اس قتل کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے اپنے آپ سے اس کی مدافعت کی، اور باہمی سازش کرکے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس قتل کا الزام لگایا اور کہا کہ اس نے پہلے بھی اپنے بھائی کا سر اور داڑھی پکڑ کر بے عزتی کی تھی، اسے ان کی شرکت بری معلوم ہوتی تھی۔

اللہ جل شانہ نے اس رکوع کے شروع میں فرمایا: ﴿وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے ایک عالی شان نفس (ہارون) کو قتل

کر دیا۔ اس جگہ ﴿قَتَلْتُمْ﴾ کا لفظ ماضی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص سچ مچ [1] قتل ہو گیا تھا۔ اور اس قتل سے جانبر نہیں ہوا تھا۔ اگر ایک شخص کے متعلق ہم کو معلوم ہو کہ وہ مقتول ہو چکا ہے، لیکن اس کے بعد ہم اسے اس زمین میں تندرستی کے ساتھ چلتا پھرتا دیکھ لیں تو ایسے شخص کو کوئی بھی مقتول نہیں کہے گا، حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو مقتول فرما دیا تو یقیناً ثابت ہوا کہ وہ اس قتل سے جان بر ہو کر دوبارہ اس دنیا میں نہیں بسا۔" (تفسیر بیان للناس، ص:۵۲۰،۵۲۱)

برہان:

کیسا واضح اور تاریخی دعویٰ ہے مگر اس کا ثبوت متکلم کے خیال اور دماغ سے باہر کہیں نہ ملے گا، نہ بائبل سے، نہ قرآن سے، نہ تاریخ بنی اسرائیل سے۔ خیر! ہم اسے چھوڑتے ہیں مگر ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ اس اقتباس میں فقرہ زیر خط "وہ شخص سچ مچ قتل ہو گیا تھا" کو ذہن میں رکھیں اور آئندہ آنے والی عبارت انھیں مفسر صاحب کی پڑھیں۔ آپ نے آیت ﴿اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے:

"جب کسی شخص کا تنفس بند ہو جاتا ہے اور دل کی حرکت رُک جاتی ہے تو دوبارہ تنفس قائم کرنے کے لیے یہ عمل بھی کیا جاتا ہے کہ اس بے ہوش آدمی کو کسی اونچی جگہ پر لٹا دیتے ہیں اور چار آدمی دو اس کے ہاتھوں کو اور دو اس کے پاؤں کو پکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص اس کے ایک ہاتھ کو اس کے سینے پر لگاتا ہے اور جب وہ اسے اٹھا لیتا ہے تو دوسرے ہاتھ والا بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ پاؤں والے آدمی بھی اس کی ایڑیوں کو باری باری اس کے چوتڑوں پر مارتے ہیں۔ اس تدبیر سے کبھی کبھی

[1] اس لفظ "سچ" کو یاد رکھیے۔ [مؤلف]

تنفس قائم ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ تجویز خود اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے مفید دیکھ کر بتلائی تھی۔ اس لیے اس کے حق میں اس کا نتیجہ خیز ہونا لازم تھا۔ حاصل یہ ہے کہ وہ شخص سکتہ کی حالت سے الٰہی تجویز کے مطابق ہوش میں آ گیا۔ اور قاتلوں کا کافی و کامل طور پر ایسا پتہ لگا دیا کہ جس سے کسی شخص کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اور خدا تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا کہ جسے تم چھپاتے تھے میں اسے ظاہر کرنے والا ہوں۔ پھر اس شخص کی طاقت زائل ہونے لگی۔ اور وہ سچ مچ مقتول ہو گیا۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان ﴿قَتَلْتُمْ﴾ بھی اس کے حق میں صحیح ثابت ہوا۔"

(تفسیر بیان للناس، ص:۵۲۳)

برہان:

اس عبارت میں اُسی شخص کو جسے ایک ورق پہلے "سچ مچ مقتول" لکھا تھا یہاں مسکوت (سکتہ کی حالت میں) لکھ دیا۔ یہ نہ سمجھے کہ مسکوت (سکتہ زدہ) دراصل زندہ ہوتا ہے۔ "سچ مچ مقتول" زندہ نہیں ہوتا۔ غالباً فاضل مفسر مسکوت اور مقتول میں فرق نہیں کرتے۔ اگر یہ حالت ہے تو ان سے اس سوال کے جواب کی کیونکر امید ہو سکتی ہے کہ قرآن کے مفسر کے لیے صحتِ دماغ کی بھی ضرورت ہے یا نہیں؟

الحاصل آپ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ہارون کو بنی اسرائیل نے قتل کر دیا، خدا نے حکم دیا کہ حضرت ممدوح کو اونچی جگہ لٹا کر ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے سینے اور چوتڑوں پر مارو جس کی تصویر یوں ہوگی کہ بقول مولوی احمد دین صاحب امرتسری کسی اونچے چبوترے پر حضرت ہارون علیہ السلام لٹائے گئے ہوں گے۔ اور دو آدمی ان کے ہاتھوں کو سینے اور دو شخص ان کے پیروں کو چوتڑوں پر مارتے ہوں گے۔ ایسا کرنے سے ان کو سکتہ سے ہوش آ گیا ہوگا۔ تو انھوں نے بتا دیا ہوگا کہ فلاں شخص نے مجھ کو

(سچ مچ؟) قتل کیا تھا۔ (نہیں توبہ، میں سکتہ میں ہوگیا تھا) اسی کو کہتے ہیں ؎

''کوہ کندن وکاہ بر آوردن''[1]

علاوہ اس کے ہم پوچھتے ہیں کہ سکتہ تو ایک مرض ہے جس میں نہ مریض کا اختیار ہے نہ کسی دوسرے کا تو پھر اس سے اس (سکتہ) کے متعلق سوال کیوں ہوا؟ ﴿اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ غور سے پڑھو اور اس نے ہوش میں آکر نام کس کا بتایا ہوگا؟ نیز وہ سچ مچ مقتول کیونکر ہوا؟

مولوی عبداللہ چکڑالوی نے قتل نفس وغیرہ کے متعلق تو وہی کہا ہے جو سرسید مرحوم نے کہا ہے لیکن ایک بات میں سرسید سے بھی آگے بڑھ گئے یعنی ﴿اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ کے متعلق چکڑالوی صاحب لکھتے ہیں:

''جو لوگ اس جگہ ﴿اِنَّ مِنْهَا﴾ کی ضمیر پتھروں کی طرف پھیرتے ہیں وہ سخت غلطی کرتے ہیں۔ کیونکہ ﴿خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ صفت ہے زندہ ذوی العقول کی اور پتھروں میں نہ تو زندگی ہے اور نہ یہ ذوی العقول ہیں اور نہ مکلّف ہیں پس جب یہ مکلف اور ذوی العقول نہ ہوئے اور ان کے واسطے عذاب معین من اللہ نہ ہوا تو وہ خوف کس چیز کا کریں گے؟''

(قرآن مجید ترجمہ چکڑالوی ص:۵۷)

<u>برہان:</u>

اس آیت کا ترجمہ جو چکڑالوی صاحب نے کیا ہے وہ بہت ہی لطیف ہے۔ فرماتے ہیں:

''﴿اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ﴾ الخ'' بعض سخت پتھروں سے البتہ وہ ہے کہ جاری ہوتی ہیں اس سے بڑی بڑی نہریں اور تحقیق بعض پتھروں سے

[1] کھودا پہاڑ نکلا تنکا۔

البتہ ایسا بھی پتھر ہوتا جو پھٹ جاتا ہے پس ٹپکتا ہے اس سے تھوڑا پانی۔"

یہاں تک تو "ھا" کی ضمیر ﴿الْحِجَارَةِ﴾ کی طرف پھیری ہے۔ اس کے آگے لکھتے ہیں:

"اور تحقیق، کہ بعض ان دلوں میں سے البتہ ایسا بھی ہوتا ہے جو گر پڑتا[1] ہے اللہ کے خوف سے۔" (ص: ۵۷)

مقام غور ہے کہ تین ضمیروں میں سے دو ضمیریں تو ﴿الْحِجَارَةِ﴾ کی طرف ہیں، ایک "دلوں" کی طرف، جو اس جگہ مذکور بھی نہیں۔ کیا یہ اختلاف مخل بلاغت نہیں؟ پس صحیح یہ ہے کہ جس طرح پتھر بلکہ ہر چیز بحکم ﴿اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾[2] تسبیح پڑھتی ہے اسی طرح پتھروں میں ﴿خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ کی حس ضرور ہے۔ ولو کرہ المنکرون!

اس سلسلے میں اصل روئے سخن پادری صاحب کی تفسیر القرآن سلطان التفاسیر کی طرف ہے مگر ضمنی طور پر اسلامی فرقوں کی طرف بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ۱۷ سے ۳۱/ اگست ۱۹۳۴ء تک ایام میں اہل اسلام کی طرف توجہ رہی آج پادری صاحب کا حق ادا ہوتا ہے۔

تحریف بائبل:

اس رکوع میں تحریف کتب سابقہ کا ذکر آنے سے پادری صاحب نے مسئلہ تحریف پر بڑی بسیط بحث کی ہے، ہم بھی ان کے تتبع میں اس جگہ اس مسئلے پر سیر کن بحث کردیتے ہیں تاکہ آئندہ اس کی ضرورت نہ رہے۔

بحث تحریف سے پہلے ان کتب (بائبل) کی اصلیت کی تحقیق کرنی ضروری ہے۔ مجموعہ بائبل میں کئی ایک کتابیں اور رسائل ہیں۔ ان میں سے تین کا نام قرآن

---

[1] دل کا گر پڑنا خاص چکڑالوی محاورہ ہوگا۔ عرب وعجم میں یہ مستعمل نہیں۔ [مؤلف]

[2] ہر چیز خدا کی تسبیح پڑھتی ہے مگر تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

شریف میں آیا ہے: تورات، زبور اور انجیل۔ جن پیغمبروں کو یہ کتابیں ملی ہیں ان کے اسماء مبارکہ بھی قرآن شریف میں بالتصریح آئے ہیں: ① حضرت موسیٰ۔ ② حضرت داود۔ ③ حضرت عیسیٰ مسیح بن مریم علیہ السلام۔ ان سب حضرات اور ان کی کتب کی بابت ایسے واضح الفاظ فرمائے گئے ہیں جن میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی، یعنی ہم نے ان کو تورات دی، زبور دی، انجیل دی۔ ان واضح الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو یہ کتابیں ان کی زندگی میں ملی تھیں، نہ کہ بعد انتقال، یہ اہل اسلام کا اعتقاد ہے۔ اس کے برخلاف یہودی اور عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ موجودہ مجموعہ بائبل بعینہ الہامی کتب ہیں، ان میں پہلی کتاب کا نام تورات ہے جس کی پانچ کتابیں: ① پیدائش۔ ② خروج۔ ③ احبار۔ ④ گنتی۔ ⑤ استثناء ہیں۔

ان پانچ کتابوں کی بابت یہودی، عیسائی متفق ہیں کہ حضرت موسیٰ نے ان سب کو نہیں لکھا کیونکہ ان میں تو ایسے ایسے واقعات بھی درج ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو ان واقعات کی خبر بھی نہ تھی۔ مثلاً

① خداوند کا بندہ موسیٰ مواب کی سرزمین میں مرگیا۔
② موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا۔
③ اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اٹھا وغیرہ۔

(استثناء ۳۴ باب)

موجودہ تورات کے اندر سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تورات حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی زندگی کے واقعات ہیں مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ لکھنے والا کون ہے؟ جو بھی ہے اس نے اس کو الہام سے لکھنے کا دعویٰ کیا یا بطور مورخ کے لکھا؟ یہودیوں کا اور یہودیوں کی متبعیت میں عیسائیوں کا دعویٰ اس کے الہامی ہونے کا ہے، مگر سوائے خوش اعتقادی کے ثبوت نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ اس تورات کو یشوع نے جمع کیا جس

کی بابت اسی بائبل میں مذکورہ بالا حوالجات کے قریب متصل ہی لکھا ہے:

''نون کا بیٹا یشوع دانائی کی روح سے معمور ہوا کیونکہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے اس کے شنوا (تابع) ہوئے اور جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا انھوں نے ویسا ہی کیا۔'' (استثناء ۳۴ باب)

اس سے یشوع کی عقلمندی اور تابعداری کا ثبوت ضرور ملتا ہے لیکن یہ نہیں ملتا کہ ان کی جمع کی ہوئی کتاب (مجموعہ کتب خمسہ) وحی والہام سے ہے، بالفرض اگر یشوع الہامی یا صاحب وحی بھی ہو تو اسلام کی تعلیم میں ان کی جمع کی ہوئی کتاب کو تورات کے نام سے ماننا داخل ایمان نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کو ملی ہوئی کتاب کو تورات کے نام سے ماننا ایمان میں داخل ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ آؤ! ہم اس کی تلاش کریں جو مل جائے اسے قبول کریں۔ پس غور سے سنیے! جو احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملے تھے وہ ہم پہلے (اہلحدیث مورخہ ۲۰؍جولائی ۳۴ء میں) بتا آئے ہیں۔ انھیں کی بابت لکھا ہے:

١ پھر موسیٰ نے اس شریعت کو لکھا اور بنی لاوی کاہنوں کے حوالے کیا۔

٢ ایسا ہوا جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا تو موسیٰ نے لاویوں کو فرمایا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو۔ (استثناء ۳۱ باب)

یہ تو ہے حال تورات کا۔ اسی طرح انجیل ہے جس کا چار بلکہ چار سے زیادہ ہونا ہی دال ہے اس بات پر کہ یہ سوانح عمریاں ہیں، یہ نہیں کہ ارشاد ربانی ﴿اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ﴾ کے تحت میں کتاب اللہ ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا ثبوت بھی درج ذیل ہے:

٣ یسوع نے پھر بڑے شور سے چلا کر جان دی اور دیکھو ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت

لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھے اٹھیں اور اٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر اور مقدس شہروں میں جا کر بہتوں کو نظر آئیں۔ (انجیل متی باب ۲۷)

یہ اور اس قسم کے واقعات جو بعد مسیح وقوع پذیر ہوئے ہیں ہمارے دعوے پر شاہد عدل ہیں کہ یہ اناجیل وہ انجیل نہیں جس کی تصدیق قرآن مجید نے فرمائی ہے۔

ناظرین کرام! باوجود ان تصریحات کے جن سے مروجہ تورات وانجیل کی حقیقت آشکارا ہے حضرات پادر صاحبان قرآن کی آیات سے مروجہ تورات و انجیل پر محض اشتراک اسمی کی وجہ سے شہادت لاتے ہیں۔ چنانچہ پادری سلطان صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو بائبل پر ایمان لانا فرض ہے۔ تورات و انجیل وغیرہ صحف انبیاء پر مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَ اِلٰھُنَا وَ اِلٰھُکُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [العنکبوت: ٤٦]

وغیرہ۔'' (ص:۲۶۹)

پادری صاحب! اگر ہماری معروضہ بالا تقریر پر جانبداری سے خالی ہو کر غور کریں گے تو آپ کو ﴿اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ﴾ کی تفسیر کے لیے ﴿مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی﴾ وغیرہ آیات مل جائیں گی جن کو سامنے رکھ کر آپ انصاف سے جان جائیں گے کہ قرآنی تورات، انجیل اور مروجہ تورات و انجیل میں اشتراک اسمی تو ہے وحدت حقیقت نہیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر آپ کے قلم سے خود بخود نکل آئے گا ؎

شیر قالین دگر است وشیر نیستان دگر است [1]

جہاں کہیں مسلمانوں کو تورات و انجیل پر ایمان لانے کا حکم ہے وہاں وہی تورات، انجیل مراد ہے جو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ انبیاء کرام علیہم السلام پر اتری تھیں۔ نہ وہ جو

[1] جنگل کا شیر اور ہوتا ہے اور قالین میں چھپا ہوا شیر اور۔

ان کے پیچھے ان کے متبعین نے بطور سوانح عمری کے لکھیں۔

ہماری گزشتہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ہم تورات انجیل منزلہ کو گو گم نہیں جانتے بلکہ انھی کتب مروجہ میں مانتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو اہلحدیث مورخہ ۲۰/ جولائی ۳۴ء)

پس پادری صاحب نے جو وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''تورات انجیل جس طرح کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اتارا تھا اسی طرح ہیں۔'' (سلطان التفاسیر ص:۲۶۲) ہمارے خلاف نہیں۔

نوٹ: جن آیات میں حکم ہے کہ اہل تورات حکم کریں ساتھ اس چیز کے جو خدا نے ان کی طرف اتاری، اہل انجیل حکم کریں وغیرہ، اس سے بھی وہی مضمون مراد ہے جو ان حضرات پر بطور وحی نازل ہوا تھا نہ کہ وہ جو پیچھے لکھا گیا کہ موسیٰ کی قبر کا آج تک پتہ نہیں، یا مسیح نے چلا کر جان دی، وغیرہ۔

ناظرین اس فرق کو خوب سمجھ گئے ہوں گے اور حضرات پوادر کی خودغرضی سے بچتے رہیں گے۔

حضرات! ہم یہودیوں، عیسائیوں کو اس بات سے روک نہیں سکتے کہ وہ ان کتابوں کی بابت الہام یا وحی کا دعویٰ نہ کریں، سو دفعہ نہیں ہزار دفعہ کریں مگر قرآن مجید کو اس دعوے پر بطور گواہ پیش نہ کریں، کیونکہ قرآن کی تصریحات ان کے دعوے کے خلاف ہیں۔

ابتداء کے بعد اب ہم اس زمانہ میں حاضر ہوتے ہیں جب یہ کتابیں الہامی صورت میں نمودار ہوئیں۔ جس سے ہمیں یہ مقصود ہے کہ بعد تالیف ہونے کے زمانہ رسالت محمدیہ تک ان پر کیا کیا واردات آئے؟ سب سے پہلے ہم یہ دکھاتے ہیں کہ ان کتابوں کے ماننے والوں نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟

عیسائیوں کے دو فرقے بڑے ہیں: ① کیتھولک ② پروٹسٹنٹ۔ اس میں

شک نہیں کہ عیسائی مذہب جب سے حکومت کی گود میں آیا، اس کی ہر ایک بات کی حفاظت کا اعلی پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ خاص کر جو نسخہ انھوں نے غیر عیسائی ملک میں شائع کرنے کے لیے مرتب کیا اس پر تو پوری توجہ دی گئی۔

آج کل ہندوستان میں دونوں فرقوں (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) کی بائبلیں مروج ہیں۔ سب سے پہلے ہماری نظر ان پر پڑتی ہے اور پڑنی بھی چاہیے۔

مثال کوئی غیر مسلم قرآن مجید کو دیکھنا چاہے تو ہم اس کو اجازت دیتے ہیں کہ جس فرقہ کا مطبوعہ قرآن چاہے لے لے۔ سنی کا لے یا شیعہ کا، ایک حرف کا فرق نہیں ملے گا۔ جس کو ہمارے بیان میں شک ہو وہ قرآن مترجمہ مولوی مقبول احمد صاحب (شیعہ) ایک ہاتھ میں لے، دوسرے ہاتھ میں مترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب لے کر مقابلہ کرے۔

اسی طرح ہمارا حق ہے کہ ہم دونوں فرقوں (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) کی کتب مقدسہ (بائبلوں) کو دیکھیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک حیرت افزا خلیج آجاتی ہے جس کو دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ سے نکل جاتا ہے ؎

اینچہ مے بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب[1]

ہم دیکھتے ہیں کہ کیتھولک بائبل میں مندرجہ ذیل کتب ہیں جو پروٹسٹنٹ بائبل میں نہیں:

① طوبیا کی کتاب ۱۴ باب۔ ② یہودیت کی کتاب ۱۶ باب۔ ① جامع کتاب ۱۲ باب۔ ④ نشید الاناشید کی کتاب ۸ باب۔ ⑤ حکمت کی کتاب ۱۹ باب۔ ⑥ یشوع بن سیراخ ۵۱ باب۔ ⑦ باروک کی نبوت ٦ باب۔ ⑧ مکابیون کی کتاب ۱٦ باب ⑨ مکابیون کی دوسری کتاب ۱۵ باب۔

[1] خدایا! یہ جو میں دیکھ رہا ہوں حالت بیداری میں ہے کہ عالم خواب میں؟!

اتنا بڑا حصہ ہمارے مخاطب پادری صاحب اور دیگر امریکن اور برٹش مشنوں کی بائبلوں میں سے گم ہے۔ اس موقع پر ہمیں پادری سلطان محمد خان صاحب کا ایک قول (ماخوذ از تفسیر کبیر) سامنے آتا ہے:

''جو کتاب بتواتر منقول ہو اس میں تغیر لفظ کی نہیں ہوسکتی۔'' (ص:۲۳۹)

اصول صحیح ہے:

ثابت ہوگا کہ فرقہ پروٹسٹنٹ (امریکن اور برٹش) کی بائبل متواتر نہیں ورنہ اتنا بڑا حصہ اس سے غائب نہ ہو جاتا۔ اس پر غور کرنا حضرات پوادر کا فرض اولین ہے۔

ناظرین کرام! پہلا درجہ ان کتابوں کی تالیف اور جمع کا ہے جس کا ذکر پہلے ہوا، دوسرا درجہ ان کی بقا کا ہے جس کا مختصر سا ذکر ابھی ہوا، تیسرا ہنوز باقی ہے۔

تحریف لفظی یا معنوی:

کچھ شک نہیں کہ ہمارے مفسرین اور دیگر اکابر علما میں سے بہت سے حضرات ان کتابوں میں تحریف معنوی کے قائل ہوئے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب تورات انجیل کی تفسیر غلط کرنے سے تحریف کرتے تھے جیسے آج کل کیا جاتا ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ مسیح موعود دمشق میں منارۂ بیضا کے قریب اترے گا۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد قادیان ہے (ازالہ اوہام) اور منارہ سے مراد منارۃ المسیح قادیان ہے۔

اس قسم کی تحریف سے پادری صاحب کو انکار نہیں۔ (سلطان ص:۲۳۸) آپ کو انکار ہے تو تحریف لفظی سے ہے۔ یعنی آپ کہتے ہیں کہ الہامی کتاب کا ایک شوشہ بھی تبدیل نہیں ہوسکتا، یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ اپنے دعوے کا ثبوت دینے سے پہلے ہم پادری صاحب کا پرزور دعویٰ نقل کرتے ہیں۔ جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''کلام اللہ اور انسان:

ہم یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ ہر ایک کلام یا کتاب جس کو ایک مرتبہ منجانب اللہ

تسلیم کرلیا جائے وہ از روئے عقیدہ بائبل و قرآن تحریف و تبدیل کے امکان سے باہر ہو جاتی ہے۔ کوئی فرد بشر خواہ کیسا ہی زور آور، ذی اقتدار کیوں نہ ہو کوئی ملت چاہے کس قدر آمادہ پر خاش و شر و ذی عداوت کیوں نہ ہو، ممکن نہیں کہ کلام الٰہی کو جو جہان کی ہدایت و روحانی ارتقا کی غایت کے لیے خدا کی صفات قدوسیت کی منشا کے موافق نازل ہوا، اور جس کی تبلیغ کے لیے انبیاء مبعوث ہوئے، اس کے ایک شوشہ یا نقطہ کو بدل سکے۔"

(سلطان التفاسیر، ص:۲۶۳)

تحریف لفظی کا ثبوت:

پادری صاحب کے اس دعوے کے بعد ہمارا فرض مؤکد ہو گیا کہ ہم آپ کو آپ کی مسلمہ الہامی کتاب میں ایسی تبدیلی دکھائیں کہ صاف صاف لفظوں میں تحریف ہو نہ کہ استنباط سے۔ پس انصاف کا ترازو ہاتھ میں رکھ کر انجیل متی کے حوالجات مندرجہ ذیل ملاحظہ فرمائیے:

"یسوع نے انھیں کہا اپنی بے ایمانی کے سبب کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تمھیں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوتا تو اگر تم اس پہاڑ سے کہتے کہ یہاں سے وہاں چلا جا تو وہ چلا جاتا اور کوئی بات تمھاری ناممکن نہ ہوتی۔ مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا و روزہ کے نہیں نکالے جا سکتے۔" (متی ۱۷: ۲۰، ۲۱)

جس بائبل سے ہم نے یہ اقتباس نقل کیا ہے وہ ۱۸۸۳ء کی مطبوع ہے۔ عربی بائبل مطبوعہ ۱۸۵۷ء منقولہ از نسخہ مطبوعہ ۱۶۷۱ء میں بھی یہ فقرہ پایا جاتا ہے۔

ناظرین! اس عبارت میں فقرہ زیر خط یاد رکھیں اور دوسری اناجیل سے اس کی بابت سنیں، لکھا ہے:

''کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر
بھی ایمان ہوگا، تو پہاڑ سے کہہ سکو گے کہ یہاں سے سرک کر وہاں چلا
جا اور وہ چلا جائے گا اور کوئی بات تمہارے لئے ناممکن نہ ہوگی۔''
(انجیل متی مطبوعہ برٹش اینڈ فارن سوسائٹی لاہور ۱۹۰۴ء)

اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں امریکن پریس لودہانہ کی مطبوعہ بائبل میں بھی یہ فقرہ نہیں ہے۔ اس اقتباس میں فقرہ مذکورہ زیر خط بالکل اڑا دیا گیا۔ لطف یہ ہے کہ وہ فقرہ انجیل متی مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے ۱۷ باب کا اکیسواں ہے، اور انجیل مطبوعہ ۱۹۰۴ء اور بائبل مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں فقرہ اکیسواں کا نمبر کتابت میں حذف کردیا، لیکن ذہن میں بحال رکھا۔ یعنی نمبر (۲۰) کے بعد (۲۲) لکھ دیا اور نمبر ۲۱ بالکل ندارد، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے کچھ اڑایا گیا ہے وہ نمبر (۲۱) ہے۔

دوسری مثال:

انجیل متی میں یوں مذکور ہے:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ آسمان پر ان کے فرشتے میرے باپ کا منہ جو
آسمان پر ہے ہمیشہ دیکھتے ہیں کیونکہ ابن آدم آیا ہے کہ کھوئے ہوؤں کو
ڈھونڈھ کے بچاوے۔ تم کیا سمجھتے ہو الخ
(انجیل متی در بائبل مطبوعہ ۱۸۸۳ء باب ۱۸۔ فقرہ ۱۰۔ ۱۱۔ ایضاً بائبل عربی مذکورہ باب ۱۸ فقرہ: ۱۰-۱۱)

اس اقتباس میں فقرہ زیر خط ذہن میں محفوظ رکھیں اور مندرجہ ذیل انجیلوں کا بیان سنیں۔ انجیل متی مطبوعہ ۱۹۰۴ء میں یوں مذکور ہے:

''میں تم سے کہتا ہوں کہ آسمان پر ان کے فرشتے میرے آسمانی باپ کا
منہ ہر وقت دیکھتے ہیں تم کیا سمجھتے ہو۔'' الخ

بائبل مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں بعینہ انجیل مطبوعہ ۱۹۰۴ء کی طرح مرقوم ہے۔ تلاش

کرنے سے اس قسم کے ثبوت بکثرت مل سکتے ہیں مگر ہم اپنا اور اپنے ناظرین کا زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے اس لیے خود اپنے مخاطب مدعی کو شہادت میں طلب کرتے ہیں کیونکہ ؎

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے شہادت تیری

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ پادری صاحب نے مسئلہ تحریف پر سیر کن بحث کی ہے، لیکن یہ عربی مقولہ بھی صحیح ہے ؎

ولن يصلح العطار ما أفسده الدهر ❶

اس لیے آپ نے جتنی اس میں طوالت دی ہے اتنے ہی الجھ گئے، ہم اس کا ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

سر دست ایک مقام نقل کرتے ہیں۔ آپ بڑی دیانت سے واقعات کا اظہار کرتے ہیں:

''بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاتب ایک لفظ کو لکھتا ہے اور اس کے بعد کی سطر کو لکھ کر پھر اس کی آنکھ دوبارہ اسی لفظ پر پڑ جاتی ہے اور پھر اسی سطر کو دوبارہ نقل کر لیتا ہے۔ مثلاً مرقس (۹:۴) کو (۱۵:۷) بعد کے دوبارہ نقل کر دیا گیا۔ مرقس (۴۸:۹) کو (۴۴:۹) اور (۴۶:۹) کے بعد سہ بارہ نقل کر دیا گیا۔''

(سلطان التفاسیر، ص:۳۶۱)

برہان:

ہم ان مقامات کی عبارات ناظرین کے سامنے لے آئیں پھر کچھ عرض کریں گے۔ مسیح فرماتے ہیں:

''جو کچھ اچھی زمین میں گرا وہ اگا اور بڑھ کے پھلا، بعض تیس گنا بعض ساٹھ

---

❶ زمانے کے بگاڑے ہوئے کو کوئی سنوار نہیں سکتا۔

اور بعض سو گنا، پھر اس نے کہا کہ جس کو سننے کے کان ہوں سنے۔''

(انجیل مرقس ۴:۹)

اس اقتباس میں عبارت زیر خط زیر بحث ہے، اسے یاد رکھیے اور دوسرا حوالہ سنیے:

''جو اس میں سے نکلتی ہیں وے ہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں اگر کسی کے کان سننے کے ہوں تو سنے۔'' (مرقس ۷:۱۵)

اس اقتباس میں فقرہ زیر خط کو پادری صاحب سہو کاتب کی وجہ سے مکرر کہتے ہیں مگر آج تک کل انجیلوں میں درج چلا آرہا ہے۔ پادری صاحب کا پیش کردہ دوسرا حوالہ ملاحظہ ہو۔

دوسرے کی بابت فرماتے ہیں: مرقس (۹: ۴۸) کو (۹: ۴۴ اور ۹: ۴۶)[1] کے بعد سہ بارہ نقل کردیا۔ اس مقام کی عبارت ملاحظہ ہو:

① ''تب فی الفور اس لڑکے کا باپ چلایا اور آنسو بہا کے کہا اے خداوند میں ایمان لاتا ہوں تو میری بے ایمانی کا چارہ کر۔'' (مرقس ۹:۲۴)

② ''اگر تیرا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلاوے تو اسے کاٹ ڈال کہ زندگی میں ٹنڈا داخل ہونا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ دو ہاتھ رکھتے ہوئے جہنم کے بیچ اس آگ میں جو کبھی نہیں بجھتی ہے ڈالا جائے، جہاں ان کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی، اور اگر تیرا پاؤں تجھے ٹھوکر کھلادے اسے کاٹ ڈال کیونکہ زندگی میں لنگڑا داخل ہونا تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دو پاؤں رکھتے ہوئے جہنم کے بیچ اس آگ میں جو کبھی نہیں بجھتی ڈالا جاوے۔ جہاں ان کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی، اور اگر تیری آنکھ تجھے ٹھوکر کھلاوے اسے نکال ڈال کہ خدا کی بادشاہت میں کانا داخل ہونا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ دو آنکھیں رکھتے ہوئے جہنم کی آگ میں ڈالا جاوے۔ جہاں ان کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی۔'' (مرقس ۹:۴۳)

[1] ۹: ۴۸ کو ۹: ۴۴ اور ۹: ۴۶ کے بعد درج کرنا ٹھیک نہ ہوگا اس کے برعکس درست ہوگا۔ پادری صاحب اس عبارت پر غور فرمائیں۔ [مؤلف]

برہان:

بغرض توضیح ہم تینوں مقاموں کی عبارت یکجا نقل کردیتے ہیں تاکہ ناظرین صحیح رائے قائم کرسکیں۔ پادری صاحب فرماتے ہیں اس عبارت میں جو یہ فقرہ ''جہاں ان کا کیڑا نہیں مرتا الخ'' آیا ہے یہ کاتبوں کے سہو سے دوبارہ نقل ہوگیا۔ پس ہم پوچھتے ہیں کہ جب کاتبوں کے سہو سے بے جا نقل ہوگیا اور کسی نے آج تک اس کی اصلاح پر توجہ نہ کی تو فرمایئے یہ تحریف بالزیادۃ ہے یا نہیں؟ حالانکہ ہر سال بڑے بڑے اہل علم مدبر جمع ہوکر بائبل اور بائبل کے تراجم کی اصلاح کیا کرتے ہیں۔ پس پادری صاحب کے دعوے اور ان مصلحین کی خاموشی سے ثابت ہوا کہ انجیل مرقس میں خود الہامی مصنف کے خلاف منشا تحریف بالزیادۃ ہوچکی ہے۔ ذلك ما كنا نبغ.

دوسری مثال:

پادری صاحب نے پہلی عبارت میں سہو کاتب کی مثالیں بتائی ہیں۔ انجیل مرقس میں وہ فقرات ملتے ہیں، مگر دوسری مثال جو پیش کی ہے وہ پائی نہیں جاتی۔

پادری صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''اور اعمال ۲۱:۳۱،۳۲، ۲۲:۲۶، ۲۳:۳۰ کو ۲۴:۶ کے بعد دوبارہ نقل کردیا گیا اور روم ۱۶:۲۰ کو ۱۶:۲۳ کے بعد نقل کردیا گیا۔''

(سلطان التفاسیر ص:۳۶۱)

برہان:

اس اقتباس میں جن مقامات کا پادری صاحب نے حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں:

① اور جب وے اس کے قتل کے درپے تھے فوج کے سردار کو خبر پہنچی کہ تمام یروشلم میں ہلڑ ہورہا ہے وہ اسی دم سپاہیوں اور صوبہ داروں کو لے کے ان پر دوڑا اور وے سردار اور سپاہیوں کو دیکھ کے پولیس کے مارنے کو آئے۔

(اعمال ۲۱:۳۱،۳۲)

② صوبہ دار یہ سن کے گیا اور سردار کو خبر دی اور کہا خبر دار تو کیا چاہتا ہے کیونکہ یہ آدمی رومی ہے اس نے کہا ہاں۔ (اعمال۲۲:۲۶)

③ جب مجھے اطلاع ہوئی کہ یہودی اس امر کی گھات میں لگے ہیں میں نے اسے جلد تیرے پاس بھیج دیا اور اس کے مدعیوں کو بھی حکم دیا کہ تیرے حضور اس پر دعویٰ کریں زیادہ سلام۔ (اعمال۲۳:۳۰)

ان تینوں مقاموں کی بابت پادری صاحب کا بیان ہے کہ اعمال (۲۴:۶) کے بعد کاتب نے سہواً ان کو درج کر دیا ہے اس لیے ہم (۲۴:۶) کو بھی نقل کرتے ہیں۔

④ ناصریوں کی بدعت کا ایک سردار پایا اس نے ہیکل کو ناپاک کرنے کا بھی قصد کیا اور ہم نے اسے پکڑا اور چاہا کہ اپنی شریعت کے موافق اس کی عدالت کریں (۲۴:۶) پر سلیس سردار آگے بڑی زبردستی کے ساتھ اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لے گیا۔ (۲۴:۸)

ناظرین! پادری صاحب کے بیان کے مطابق ہم نے پہلے تین مقاموں کے علاوہ چوتھے مقام کی عبارت بھی نقل کر دی ہے لیکن پادری صاحب کے دعوے کے مطابق پہلی آیتوں کو (۲۴) کی (۶) کے بعد ہم نے ملحق نہیں پایا۔ بقول پادری صاحب یہ حوالہ دوبارہ درج ہو کر پھر شائع ہوا اور شائع ہونے کے بعد نکالا گیا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کے رد و بدل کا کیا نام رکھیں؟ سردست ان شہادتوں کے بعد ہم پادری صاحب کا کلام نقل کرتے ہیں جو قول فیصل ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''کوئی فرد خواہ کیسا ہی زور آور ذی اقتدار کیوں نہ ہو ممکن نہیں کہ کلام الٰہی کو جو جہاں کی ہدایت وروحانی ارتقا کی غایت کے لیے خدا کی صفات قدوسیت کی منشا کے موافق نازل ہوا اس کے ایک شوشہ یا نقطہ کو بدل سکیں۔'' (سلطان التفاسیر، ص:۲۶۳)

عکس القضیہ:

پادری صاحب کے اس بیان کا عکس بالفاظ دیگر نتیجہ یہ ہے کہ جس کلام میں تبدیلی ہو جائے وہ خدا کی طرف سے نہیں۔ امید ہے پادری صاحب بھی اس نتیجہ کو صحیح جان کر آئندہ کو اناجیل یا صرف انجیل متی سے کلام اللہ ہونے کا اعتقاد اٹھا کر غیر مبدل کلام اللہ کو کلام منزل مانیں گے ؎

یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے
جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

پادری صاحب کی بے بسی:

پنجاب میں ایک حکیمانہ مثل ہے: ''گون بھناوے جوں بھاویں گلے ہون'' یعنی غرض مندی میں آدمی بڑے مشکل کام بھی کر لیتا ہے۔ پادری صاحب کو مقصود ہے بائبل کو غیر محرف ثابت کرنا، اس لیے آپ ایسے ایسے گواہوں کو گواہی میں پیش کرنے کی بھی جرأت کر رہے ہیں جو خود آپ کے اعتقاد میں بھی بے اعتبار ہیں۔ مگر چونکہ بخیال پادری صاحب ان بے اعتبار لوگوں کی بات بھی آپ کے دعوے کی قدرے مؤید ہے اس لیے آپ نے ان کو بھی پیش کرنے کی جرأت کی۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب قادیانی اپنی کتاب ازالہ اوہام میں لکھتے ہیں کہ ''اب اگر مسیح کو سچا نبی ماننا ہے تو اس کے فیصلہ کو بھی مان لینا چاہیے۔ زبردستی سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ ساری کتابیں محرف و متبدل ہیں۔ بلاشبہ ان مقامات سے تحریف کا کچھ علاقہ نہیں، اور دونوں فریق یہود و نصاریٰ ان عبارتوں کی صحت کے قائل ہیں۔ اور پھر ہمارے امام المحدثین حضرت اسماعیل صاحب اپنی صحیح بخاری میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کتابوں میں کوئی لفظی تحریف نہیں۔'' (سلطان التفاسیر، ص: ۲۸۵)

برہان:

ہم خوش ہیں کہ پادری صاحب نے مرزا صاحب کا قول پیش ہی نہیں کیا بلکہ پیش کرنے سے پہلے ان کی نسبت اظہار رائے بھی فرمایا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

''مسلمانوں کا سمجھدار طبقہ بھی بائبل مقدس کو تحریف سے بری سمجھتا ہے۔''

(سلطان التفاسیر ص:۲۸۲)

ان سمجھداروں میں سے ایک سمجھدار مرزا صاحب قادیانی آپ کو ملے ہیں، اس لیے ہم بھی انھی سمجھدار صاحب کا قول پیش کر کے پادری صاحب کی تسلی کرتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

''کئی جگہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ وہ کتابیں (مجموعہ بائبل) محرف مبدّل ہیں اور اپنی اصلیت پر قائم نہیں، چنانچہ اس واقعہ پر اس زمانہ کے بڑے بڑے محقق انگریزوں نے بھی شہادت دی ہے۔''

(چشمہ معرفت مصنفہ مرزا قادیانی، ص:۲۵۵)

پادری صاحب! آپ نے اپنے گواہ کو کیا سمجھا؟ یاد رہے جو آپ نے سمجھا وہ غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ گواہ ہر ایک کا گواہ بن سکتا ہے جو چاہو اس سے کہلوا لو کیونکہ یہ اس کی خاص صفت ہے ۔

معشوق ما بمذہب ہر کس برابر است
باما شراب خورد و بزاہد نماز کرد [1]

دیکھیے تو ادھر مسلمانوں کے سامنے حضرت مسیح کی تصدیق اور تعریف کرتا ہے ادھر مسیح کے دشمنوں (یہودیوں) کے سامنے یوں اظہار خیال کرتا ہے:

''مسیح کا چال چلن کیا تھا، ایک کھاؤ پیو، شرابی، نہ زاہد نہ عابد، نہ حق کا

[1] ہمارا معشوق ہر کسی کے مذہب میں برابر ہے، ہمارے ساتھ شراب پیتا ہے اور زاہد کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔

پرستار، متکبر، خود بین، خدائی کا دعویٰ کرنے والا۔‘‘

(مکتوبات احمدیہ طبع اول جلد۳ ص:۲۳، ۲۴)

ناظرین! ایسے ہر دلعزیز گواہ کو پادری صاحب کا اپنے مطلب کے لیے پیش کرنا یقیناً ان کی بے بسی پر دلالت کرتا ہے جو اس شعر میں درج ہے ۔

اس نقش پا کے سجدے نے یاں تک کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل چلا

دوسرا گواہ:

آپ کا دوسرا گواہ منشی امام الدین ہے جو کسی زمانہ میں منٹگمری میں منصف (سب جج) تھا۔ لوگ اس کو یہودی کہتے تھے۔ خود اس کی طرز تحریر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ پادری صاحب کی منقولہ تحریر میں جہاں آنحضرت ﷺ کا نام ذکر کرتا ہے ’’حضرت محمد صاحب‘‘ کے الفاظ سے ذکر کرتا ہے جو اسلامی اصطلاح کے مخالف ہے۔ اس کا مذہب تھا کہ تورات واجب العمل ہے۔ باوجود اس کے میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ پادری صاحب نے اس کی شہادت کو بے وجہ اپنے موافق اور ہمارے مخالف قرار دیا ہے، بلکہ یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ منشی مذکور کے مضمون سے سولہ صفحے تفسیر کے پادری صاحب نے ناحق ضائع کیے۔ کیونکہ منشی صاحب مذکور کا دعویٰ یہ تھا:

’’قرآن عربی میں جس قدر عزت اور شان تورات امام یعنی شرائع منزل من اللہ مندرجہ تورات کی بیان ہوئی ہے اس قدر تو اور کسی بھی کتاب کی بیان نہیں ہوئی۔‘‘ (سلطان التفاسیر، ص:۲۹۵)

برہان:

اس سے ثابت ہوا کہ منشی مذکور کے نزدیک تورات احکام منزلہ کا نام ہے جن کو وہ بار بار شرائع منزلہ کے نام سے ذکر کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو: سلطان التفاسیر (ص:

۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۶ تا ۳۰۹) وغیرہ۔ یہ دعویٰ ہمارے اعتقاد اور ہماری مذکورہ تحقیق کے کسی طرح مخالف نہیں۔ ہم نے خود گزشتہ اوراق میں بحوالہ عبارات منقولہ یہی لکھا ہے کہ مروجہ تورات ساری منزل من اللہ نہیں بلکہ منزل من اللہ اس میں درج ہے۔ منشی امام دین مذکور کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ پھر نہیں معلوم پادری صاحب نے منشی مذکور کا قول کیوں نقل کیا؟ شاید اس لیے کہ مرزا صاحب قادیانی بحیثیت شہادت اکیلے نہ رہ جائیں۔ اس لیے منشی صاحب کو مثنیٰ بنا کر یہ شعر پڑھاتے ہوئے مرزا صاحب سے ملا دیا ۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

پادری صاحب نے مسئلہ تحریف پر جی کھول کر لکھا ہے، جس طرح مرزا صاحب نے ''براہین احمدیہ'' کو بے ضرورت طول طویل لکھا تھا، اسی لیے مرزا صاحب قادیانی کی طرح تطویل میں ان سے بھی سہو ونسیان یا غلبہ حق ہوگیا۔ ناظرین کی آگاہی کے لیے ہم بتائے دیتے ہیں کہ ہم بارہا بتا چکے ہیں کہ موجودہ مجموعہ بائبل کو ہم مسلمان کتاب سماوی نہیں مانتے بلکہ اس میں بہت کچھ الحاق کے قائل ہیں۔ مسیحی لوگ اس تمام (مجموعہ) کو الہامی مانتے اور بشہادتِ قرآن مسلمانوں سے الہامی منواتے ہیں۔ مسلمان کہتے ہیں کہ جو احکام خدا نے حضرت موسیٰ کو دیے تھے وہی احکام کتاب سماوی موسومہ تورات ہیں ان کے سوا اِدھر اُدھر کی جملہ کتابیں سب الحاقی ہیں۔ ہم تو بارہا اس کا ثبوت موجودہ تورات سے دے چکے ہیں لیکن خدا کی تائید کا نظارہ قابل دید ہے کہ خود پادری صاحب بھی وہی بات مان گئے جو ہم عرض کرتے آئے ہیں۔ یعنی اصل کتاب وہی احکام ہیں جو حضرت موسیٰ کو خدا نے لکھوا دیے اور حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے حوالے کیے۔ ناظرین پادری صاحب کا قول بحوالہ موجودہ تورات بغور دیکھیں اور نتیجہ پائیں۔ فرماتے ہیں:

''جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام ہوئیں، تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھاتے تھے، فرمایا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو۔'' (استثناء ۳۱:۲۴تا ۲۶)

پس کتب مقدسہ قدس الاقداس میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ (خروج ۴۰: ۲۰، استثناء ۳۱: ۲۴، ۲۶ و۲ سلاطین ۲۲: ۸) اور ہر ساتویں سال لفظ بلفظ پڑھی جاتی تھیں۔ (یشوع ۸: ۳۵، استثناء ۳۱: ۱۰، ۱۳) علاوہ ازیں شاہانِ اسرائیل تخت نشینی کے بعد اپنے ہاتھ سے قدس الاقداس کے نسخہ کی نقل کیا کرتے تھے۔ (استثناء ۱۷: ۱۸) اور یہی قدس الاقداس کا نسخہ تاجپوشی کے وقت شاہان اسرائیل کے ہاتھوں میں رکھا جاتا تھا۔ (۲ سلاطین ۱۱: ۱۲۔ ۲ تواریخ ۲۳: ۱۱) (سلطان التفاسیر، ص:۲۲۲، ۲۲۳)

پادری صاحب کا یہ قول عیسائیوں اور مسلمانوں میں قول فیصل ہے۔ اب ہم یہ دکھاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو خدا کی طرف سے کیا ملا تھا اور انھوں نے کیا لکھایا؟ اس کا ثبوت ہم تورات ہی سے دکھاتے ہیں۔ لکھا ہے:

''تب اُس (خدا) نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خدا ہوں جو تجھ کو مصر کی زمین سے اور غلام خانے سے باہر لایا، میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لیے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا، تو انھیں سجدہ نہ کر نہ ان کی بندگی کر، کیونکہ میں خداوند تیرا غیور خدا ہوں جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلا ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک جو کہ میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں، اور ان میں سے جو میرے دوست ہیں اور میرے حکموں کو یاد رکھتے ہیں ہزاروں پر رحم کرتا ہوں، تو خداوند

اپنے خدا کا نام بے سبب مت لے، کیونکہ خداوند اس کو جو اس کا نام بے سبب لیتا ہے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔ سبت کے دن کو یاد کر تا کہ تو اسے مقدس جانے، جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم کیا ہے۔ چھ دن تک تو محنت کر اور اپنے سب کام کیا کر، پر ساتواں روز خداوند تیرے خدا کے سبت کا ہے، تو اس دن کوئی کام نہ کر، نہ تو نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرا بیل نہ تیرا گدھا نہ تیرا کوئی مواشی اور نہ مسافر، جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو تا کہ تیرا غلام اور تیری لونڈی تیری طرح سے آرام کریں۔ یہ بھی یاد کر کہ تو مصر کی زمین میں غلام تھا، اور وہاں سے خداوند تیرا خدا اپنے زور آور ہاتھ اور بڑھائے ہوئے بازو سے تجھ کو نکال لایا، اس لیے خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا کہ تو سبت کے دن کی محافظت کر۔

''اپنے باپ اور اپنی اماں کو عزت دے، جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے فرمایا ہے تا کہ تیری عمر کے دن بہت ہوویں، اور تا کہ اس زمین میں جسے خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے تیرا بھلا ہو۔ تو خون مت کر۔ تو زنا نہ کر۔ تو چوری نہ کر۔ تو اپنے ہمسائے پر جھوٹی گواہی نہ دے۔ تو اپنے ہمسائے کی جورو کو مت چاہ، تو اپنے ہمسائے کے گھر کی یا اس کی زمین کی اس کے غلام کی اس کی لونڈی کی اس کے بیل کی اس کے گدھے کی یا ہمسائے کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔''

یہی احکام ہیں جو حضرت موسیٰ نے لکھا کر بنی اسرائیل کو دیے جن کو پادری صاحب نے کتاب استثناء سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور تمام ہوئیں'' وغیرہ

سوال:

پادری صاحب! جو احکام حضرت موسیٰ نے لکھا کر بنی اسرائیل کے حوالے کیے تھے جن کو آپ نے خود بائبل کی کتاب خروج (۴۰: ۲۰، استثناء ۳۱: ۲۴) وغیرہ سے نقل کیا ہے کیا اس مجموعہ میں یہ فقرات بھی درج تھے:

''جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب کی صورت میں لکھ چکا اور تمام ہوئیں تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھائے تھے فرمایا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کر کے خداوند کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو۔'' (استثناء ۳۱: ۳۲)

اگر یہ فقرات اس مجموعہ میں سے نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو پادری صاحب آپ بتائیں ان فقرات اور ان جیسے باقی فقرات کثیرہ کو کتاب مقدس میں کیوں داخل کیا گیا اور آپ نے کیوں ان فقرات کو جدا کر کے اپنے دعوے کو محدود اور مشخص نہ کیا؟

پس ساری بحث کا موضوع یہی حصہ ہے۔ انہی احکام کو یہودی اور یہودیوں کے مقدس امام کتاب مقدس اور قدس الاقداس جانتے تھے، انھی کو بوقت رسوم قومیہ (تاج پوشی وغیرہ) ہاتھوں میں لیتے تھے۔ ان احکام میں باقی حصہ مروجہ تورات وغیرہ کا نہ ہوتا تھا۔ ہمارا انکار اس مجموعہ احکام سے نہیں بلکہ مروجہ تورات کے مجموعہ سے ہے۔ جس میں علاوہ احکام کے اور بہت کچھ ملایا گیا ہے۔

پادری صاحب آپ تھوڑی دیر الگ بیٹھ کر غور کریں تو آپ کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ آپ کے دعوے اور دلیل میں ''تقریب'' نہیں۔ دعویٰ الہام ساری بائبل خصوصاً مروجہ تورات کی بابت ہے، دلیل حصہ خاص کے متعلق ہے، دعویٰ عام ہے اور دلیل خاص جو کہ مستلزم مدعا نہیں۔

ناظرین! پادری صاحب نے مسئلہ تحریف پر بڑا وقت لگایا ہے جس میں سیر کن

بحث کی ہے۔ الحمدللہ کہ اس طول طویل تحریر میں ہمارے مطلب کی بھی چند باتیں کہہ گئے ہیں۔ جو یہ ہیں:

۱ ''یہ حق ہے کہ ہمارے پاس اس زمانہ (تالیف تورات) کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے جس کے ساتھ مقابلہ کرکے ہم یہ کہہ سکیں کہ اس زمانہ کے متن کے الفاظ اور موجودہ کتب میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' (سلطان التفاسیر، ص:۳۳۰)

۲ ''کوئی محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ عبرانی کتب مقدسہ حرف بحرف وہی ہیں جو ڈھائی ہزار سال پہلے رائج تھیں کیونکہ اختلافات موجود ہیں۔''

(سلطان التفاسیر، ص:۳۳۱)

یہ دو فقرے لکھ کر پادری صاحب مسیحیوں میں سرخرو رہنے کے لیے استثناء کرتے ہیں: ''لیکن ان اختلافات کی بناپر کوئی محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ (اختلافات) ایسے اہم ہیں کہ ان سے کتب مقدسہ کے مطالب و معانی میں عظیم فتور واقع ہوگیا ہے اور اب وہ اس لائق نہیں کہ ان پر اعتبار کیا جائے یا ان کو سند قرار دیا جائے۔''

(سلطان التفاسیر ص:۳۳۱، ۳۳۲)

برہان:

اہل دانش جانتے ہیں کہ کسی چیز کی نسبت یہ حکم لگانا کہ یہ اصل کے مطابق ہے، اصل کے موجود ہونے پر متفرع ہے، جب اصل موجود ہی نہیں تو کوئی کیسے مان سکتا ہے کہ اس نقل اور اصل میں فرق نہیں؟ خاص کر جب پادری صاحب کی شہادت ہے کہ ''ظالم بادشاہ اینٹی نے ۱۶۸ قبل مسیح میں حکم دیا کہ یہود کی کتب مقدسہ کو برباد کردیا جائے (امیکائی ۱:۵۶)۔'' (سلطان التفاسیر ص:۳۳۲)

پس مختصر یہ ہے کہ کتب مقدسہ کی عدم تحریف کا ثبوت آپ نے ایسا دیا ہے کہ کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں دے سکتا، یہ بات بالکل اس کے مشابہ ہے جو پنجابی نبی مرزا صاحب قادیانی نے اپنے صادق ہونے کی دلیل میں کہا تھا کہ ''مولوی ثناء اللہ

مجھ سے پہلے مرے گا۔"

جو نتیجہ اس دلیل کا ہوا وہی آپ کی ساری لمبی چوڑی تقریر کا ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم اس خصوص میں پادری صاحب کے شکرگذار ہیں کہ آپ نے ہمارا کام خود کردیا ؎

اے وقت تو خوش باد کہ وقت ما خوش کردی[1]

رکوع دہم:

﴿ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ [البقرة: ۸۳ تا ۸۶]

[1] تمہارا وقت اچھا ہو کہ تم نے ہمارا وقت اچھا کردیا۔

ترجمہ: اور سنو! اے حاضرین اولادِ یعقوب وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی سرائیل کو حکم دیا اور اس حکم پر عمل کرنے کا ان سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ، قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کرتے رہنا۔ ماں باپ کے ساتھ احسان یہ کہ ان کی خدمت خادمانہ حیثیت سے کرنا، یعنی خدمت کرتے ہوئے کسی طرح کی تعلی یا برابری کا خیال نہ کرنا، بلکہ ہمیشہ ان کے سامنے ادب اور تعظیم سے پیش آنا۔ باقی لوگوں سے یہ نسبت نہیں بلکہ جیسا مقتضاءِ حال ہو ویسا کرنا۔ اور سب لوگوں سے خوش کلامی کرنا اپنا ہم مذہب ہو یا غیر مذہب، سب کے ساتھ خوش اخلاق سے پیش آنا۔ اور نماز حسب تعلیم شریعت پڑھتے رہنا اور زکوۃ دیتے رہنا یہ احکام تم نے سن لئے اور پختہ وعدے کے ساتھ قبول کر لئے پھر تم اے بنی اسرائیل بجز چند لوگوں کے سب منہ پھیر گئے اور سچ تو یہ ہے کہ تم لوگ آج تک سچی تعلیم سے روگردان ہو۔ اور سنو! جب ہم نے تم سے وعدہ لیا جس کا مضمون یہ تھا کہ خبردار! اپنے بھائیوں کے خون نہ گرانا نہ اپنے بھائیوں کو لڑائی میں مغلوب کر کے اپنے وطن سے نکالنا۔ پھر تم نے اس حکم کی تسلیم کا اقرار کیا اور اب بھی تم اس امر کے گواہ ہو کہ واقعی تم سے وعدہ لیا گیا تھا۔ مگر نتیجہ اس کا بھی کچھ نہ ہوا پھر بھی تم اپنے اسرائیلی بھائیوں کو قتل کرتے ہو اور لڑائی کی حالت میں ان میں سے ایک فریق پر غلبہ پا کر اس کو اس کے گھروں سے باہر نکال دیتے ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم ان کے برخلاف ان کے دشمنوں کی گناہ اور ظلم میں امداد کرتے ہو جس سے ان کے دشمن زور پکڑ کر ان اسرائیلیوں کو کمزور کر کے قیدی غلام بنا کر لے جاتے ہیں پھر اگر وہ تمہارے اسرائیلی بھائی قید کی حالت میں تم سے امداد مانگنے کو تمہارے پاس آتے ہیں تو تم

ان کو اسرائیلی برادر اور ہم مذہب جان کر ان کا فدیہ بھی دے دیتے ہو۔ حالانکہ اگر فدیہ دینا تم پر فرض ہے تو ان کا وطن سے نکالنا بھی تو حرام ہے کیا پھر تم بعض حصہ کتاب الٰہی کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ یہ دو رنگی تم نے کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ پس جو تم میں سے ایسا کام کرے اس کی سزا دنیاوی ذلت ہے اور آخرت میں سخت ترین عذاب کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے نیک و بد کاموں سے بے خبر نہیں۔ یہ تو ہے تمہارا قومی واقعہ۔ اب سنو! خدائی فیصلہ کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے میں گویا خرید لی ہے اس لئے اب آخرت کی خیر وفلاح ان کے ہاتھوں سے نکل گئی پس نہ ان سے اس جرم کا عذاب ہلکا کیا جائے گا نہ کسی طرح سے ان کی مدد کی جائے گی۔

اب تک سورہ بقرہ کا دسواں رکوع مع ترجمہ درج ہو چکا ہے۔ اب اس کے متعلق حوالجات سابقہ دکھائے جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کو توحید کا حکم دے کر اس کی تعمیل کا وعدہ لیا تھا وہ مقام یہ ہے:

''پھر موسیٰ نے سارے اسرائیل کو بلایا اور انھیں کہا اے اسرائیل یہ شرعیں اور احکام سن رکھو جنہیں میں آج تمہارے کانوں تک پہنچاتا ہوں تاکہ تم انھیں سیکھو اور حفظ کرو اور ان پر عمل کرو۔ خداوند ہمارے خدا نے حورب میں ہم سے ایک عہد کیا۔ ① خداوند نے یہ عہد ہمارے باپ دادوں سے نہیں کیا بلکہ خود ہم سے۔ ② یعنی ہم سب جو آج کے دن جیتے ہیں، خداوند نے تمھارے ساتھ روبرو پہاڑ کے اوپر آگ میں سے کلام کیا۔ ③ اس وقت میں نے تمھارے اور خداوند کے درمیان کھڑے ہو کے۔ ④ خداوند کا کلام تم پر ظاہر کیا کیونکہ تم آگ کے سبب ڈر گئے تھے۔ ⑤ اور پہاڑ پر نہ چڑھے۔

تب اس نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خدا ہوں جو تجھ کو مصر کی زمین سے
اور غلام خانے سے باہر لایا۔ ⑥ میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے۔
⑦ تو اپنے لیے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر
یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا۔ ⑧ تو انھیں سجدہ نہ
کر نہ ان کی بندگی کر کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں جو باپ
دادوں کی بدکاری کا بدلا ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک
جو کہ میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں۔" (استثناء باب ۵ فقرات تا ۹)

برہان:

اس عبارت میں جتنے حصے پر ہم نے خط دیا ہے یہ حصہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ اسی لیے قرآن مجید نے اس کی تصدیق نہیں کی اسے چھوڑ کر پہلا حصہ مصدقہ ہے۔ نیز فرمایا:

"سن لے اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔" (استثناء ۶:۴)

نیز فرمایا:

"میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہو۔" (خروج ۲۰:۳)

ماں باپ کے متعلق ارشاد ہے:

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے۔" (خروج ۲:۱۲)

﴿ذَوِی الْقُرْبٰی﴾ سے احسان اور سلوک کرنے کا ذکر تورات میں ہمیں نہیں ملا اس لیے پادری سلطان محمد صاحب نے جو حوالہ دیا ہے وہ ہم ناظرین کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ یعنی استثناء (۵) کی (۱۸) "وہ (خدا) یتیموں اور بیواؤں کا انصاف کرتا ہے اور پردیسی سے ایسی محبت رکھتا ہے کہ اسے کھانا اور کپڑا دیتا ہے سو

تم بھی پردیسی سے پیار کرو۔''

اس اقتباس میں قریبیوں کا ذکر نہیں ۔ اسی طرح کتاب احبار ۱۸ باب میں بھی چند عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے منع رکھا ہے۔ یعنی سوتیلی ماں کی بیٹی، بہو، سالی وغیرہ، اس کو بھی ﴿اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی﴾ سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد ہم نے عیسائیوں کی فہرس انجیل (کلام اللہ) کو دیکھا تو اس میں صفر ہی پایا۔ باایں ہمہ ہم کہتے ہیں کہ حکم ضرور ہوگا، کیونکہ ضروری ہے مگر اہل کتاب کی غفلت سے یہ فقرہ حذف ہوگیا۔ ہم پادری صاحب کے مشکور ہیں کہ انھوں نے قرآن کی حکایت کے لیے محکی عنہ کی تلاش کی اور حکایت کو غلط قرار نہیں دیا، کیونکہ بعد تلاش جو کچھ انھوں نے پیش کیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس کو محکی عنہ کہا جائے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حکایت صحیح ہے اور محکی عنہ مفقود (محذوف) ہے۔

﴿قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا﴾ اس حکم کے لیے صریح الفاظ ہم کو نہیں ملے۔

پادری سلطان محمد خان نے کتاب واعظ کا صرف نام لیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''دانشمند کے منھ کی باتیں لطیف ہیں، پر احمق کے ہونٹھ اسی کو نگل جاتے ہیں، اس کے منھ کی باتوں کی ابتدا احمقی ہے اور اس کی باتوں کی انتہا فاسد ابلہی ہے، احمق بہت سی باتیں بناتا ہے، ہر آدمی نہیں بتا سکتا ہے کہ کیا ہوگا اور جو کچھ اس کے بعد ہوگا اسے کون کہہ سکتا ہے۔'' (واعظ ۱۱،۱۲)

برہان:

پادری صاحب اس کو آیت قرآنیہ کا مصداق قرار دیتے ہیں، مگر ہمیں اس کی تسلیم میں تأمل ہے۔ ہمارے گمان میں وہ فقرہ جس کی حکایت قرآن شریف نے کی ہے تورات سے گم ہوگیا۔ اللّٰہ أعلم

الصلوۃ:

نماز کی کیفیت جو اسلام میں ہے اس طرح کی تو نہیں ملتی محض عبادت کا ثبوت کتاب خروج وغیرہ سے ملتا ہے جس کی کچھ عبارت نقل ہوئی ہے، کچھ مندرجہ ذیل ہے:

''چاہیے کہ تم خداوند اپنے خدا کی پیروی کرو اور اس سے ڈرو اور اس کے کلموں کو حفظ کرو اور اس کی بات نانو تم اسی کی بندگی (عبادت) کرو۔''

(استثناء ۱۳:۴)

زکوۃ:

زکوۃ کی بابت بھی تفصیل نہیں ملتی۔ اتنا بالاجمال ہے کہ ''چھ برس زمین میں کھیتی کر اور اس سے جو پیدا ہو جمع کر، پر ساتویں برس اسے چھوڑ دے کہ پڑتی رہے تاکہ تیری قوم کے مسکین اسے کھاویں۔'' (خروج ۲۳:۱۰)

نیز مذکور ہے:

''زمین کی ساری دہ یکی (عُشر) خواہ زمین کے بیج کی خواہ درختوں کے میووں کی خداوند کی ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے۔'' (احبار ۲۷:۳۰)

یہ اور اس قسم کی جملہ زکوۃ پیداوار ارضی کی ہے دوسرے احوال کی نہیں۔

﴿لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ﴾ فعل نفی بمعنی نہی ہے، یعنی نہ بہائیو خون اپنے۔ مطلب یہ کہ آپس میں لڑ کر خون خرابہ نہ کی جیو۔ پادری سلطان محمد خان صاحب نے اس مضمون کا حوالہ کتاب پیدائش (۹ باب کی ۶) کا دیا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

''جو کوئی آدمی کا لہو بہاوے آدمی ہی سے اس کا لہو بہایا جائے۔ تو خون مت کر۔'' (خروج ۲۰:۱۳)

﴿تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ﴾ یہ یہودیوں کی ایک بد عملی کی حکایت ہے۔ پادری صاحب نے اس کا حوالہ زبور (۵۵ کی ۲۰) کا دیا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

''اس نے ان پر جو اس سے اختلاط رکھتے تھے اپنے ہاتھ ڈالے ہیں۔''

معلوم نہیں یہ کیا مضمون ہے اور کس کی طرف اشارہ ہے؟ بظاہر تو کلام بالکل مجمل ترین ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل میں تفرقہ ہو کر دو گروہ ہو گئے تھے اور آپس میں خوب لڑتے تھے۔ اس کے لیے تاریخ یہود کا حوالہ ہونا چاہیے۔ کسی الہامی کتاب سے بزور استنباط کرنے کی ضرورت نہیں۔

﴿تُفٰدُوْهُمْ﴾ اس کا حوالہ پادری سلطان محمد صاحب نے کتاب احبار (۲۵:۴۵) کا دیا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

''اس کے بیچے جانے کے بعد وہ چھڑایا جاسکتا ہے ہر ایک اس کے بھائیوں میں سے جو چاہے سو اس کو چھڑا دے۔''

ہمارے نزدیک یہ عبارت منقولہ حکم ہے فعل نہیں، اس لیے فعل کا ثبوت بھی تاریخ یہود میں ہونا چاہیے۔ اسموئیل سے لے کر ۲ تواریخ تک بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

﴿مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾ اس کا حوالہ پادری صاحب نے احبار (۲۵: ۲۵۔۲۸) کا دیا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

''اگر تیرا بھائی مسکین ہو اور کچھ اپنی ملکیت سے بیچے اور کوئی اس کے نزدیک کے رشتہ داروں میں سے آوے کہ اسے چھڑا لے تو وہ اس کو جسے اس کے بھائی نے بیچا ہے چھڑا لے۔''

اہل علم جانتے ہیں کہ یہ ایک حکم ہے۔ اس عبارت سے ﴿مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾ کا دعویٰ ثابت کرنا استنباطی درجہ ہے تصریحی نہیں۔ اس سے اچھا حوالہ خروج (۲۰:۱۷) کا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

''تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔''

مقام مسرت ہے کہ اس رکوع میں قرآنی حکایات کی پادری صاحب نے

تکذیب نہیں کی، بلکہ حکایت کو صحیح جان کر ان کا محکی عنہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہاں پادری صاحب نے اس رکوع کا اردو ترجمہ باقاعدہ اور بامحاورہ نہیں کیا۔ جس سے ہماری کوئی خاص غرض نہیں۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی نے اس رکوع میں اور تو کوئی بات قابل ذکر نہیں کی، صرف اتنا کیا کہ ﴿قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''اور کہا کرو واسطے ہدایت سب لوگوں کے اچھی کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب اللہ ضرور پڑھتے رہو۔''

کتاب اللہ پڑھنے سے انکار نہیں، اس حکم کی ضرورت سے انکار نہیں۔ ہاں بات یہ ہے کہ اس آیت کا ترجمہ یہ صحیح نہیں کیونکہ کتاب اللہ پڑھنے کے لیے ﴿اُتْلُ﴾ کا صیغہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہی آیا ہے: ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾۔ نیز اس کی صفت میں ﴿حُسْنًا﴾ نہیں آنا چاہیے۔ ﴿قُوْلُوْا﴾ کے معنی کہنے کے ہیں۔ ﴿حُسْنًا﴾ کے معنی ہیں اُحسن یعنی اچھی بات۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر دوسری جگہ یوں آئی ہے:

﴿قُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [الإسرا: ٥٣]

''میرے بندوں کو کہہ دو کہ وہ بات کہا کریں جو بہت اچھی ہو۔''

امرتسری مولوی احمد دین نے اپنے دماغی توازن کا ثبوت دیتے ہوئے اس رکوع میں بے موقع ایک مقامی بحث کو بری طرح ذکر کیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ امرتسر میں رسول اللہ ﷺ کے بحکم خدا اصل مطاع ہونے پر ان حضرت سے میری تحریری بحث ہوئی تھی۔ اصل مطاع کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ جس کے حکم کی دلیل کسی اور کے قول سے تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً کوئی عالم فتویٰ دے، اس سے سوال ہوسکتا ہے کہ آپ نے یہ حکم کہاں سے دیا؟ کوئی مجتہد استنباط کرے اس کی اصل

بھی تلاش کی جاتی ہے۔مگر رسول اللہ ﷺ کوئی حکم دیں تو اس کی دلیل تلاش نہیں کی جائے گی۔اس دعوے پر یہ آیت قرآنی پیش کی تھی:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٥]

اس آیت میں فیصلہ نبویہ کو بدل وجان مان لینے کا حکم ہے۔یعنی آپ کے فیصلے کی اپیل کسی اور جگہ نہیں ہوسکتی بلکہ مان لینا داخل ایمان ہے مگر یہ سب کچھ حضور علیہ السلام کو بوصف رسالت حاصل ہے بحیثیت ذات نہیں۔اس کے ساتھ ہم نے اصل مطاع بالغیر کی ایک مثال بھی دی تھی کہ بادشاہ اصل مطاع ہے مگر پریوی کونسل کے جج بھی ماتحت حکم بادشاہ اصل مطاع یعنی منتہائے سوال ہیں۔چونکہ ایسا ماننے سے حضور علیہ السلام کے احکام حدیثیہ کا ماننا بھی ثابت ہوتا ہے اور فریق ثانی حدیث نبوی کی حجیت سے منکر ہے، اس لیے انھوں نے اس اصول کے ماننے سے انکار کردیا، آخر مباحثہ مکمل ہوکر رسالہ کی صورت میں بنام ''اتباع الرسول'' شائع ہوگیا۔چونکہ مولوی احمد دین مذکور کے دماغ میں اس بحث میں کمزوری دکھانے کا خیال سمایا ہوا تھا اس لئے آپ نے بے موقع اس رکوع میں اس بحث کو ذکر کردیا۔آیت ﴿فَلَا وَ رَبِّكَ﴾ الخ کی تفسیر کے ماتحت یہ بحث کرتے تو ایک باموقع بات ہوتی لیکن ایسا کرنے سے ان کی دماغی کیفیت ثابت نہ ہوتی۔بہرحال آپ نے اس موقع پر جو فرمایا ہے آئندہ درج ہوگا۔

امرتسری احمدی تفسیر کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں جس میں مؤلف نے سورہ بقرہ کے دسویں رکوع میں اصلاً مطاع کی بحث کو داخل کردیا۔ہم نے تمہید میں لکھا تھا کہ اس بحث کا یہ موقع نہ تھا، مگر مؤلف نے اپنا دماغی توازن بتانے کو ایسا کیا۔یہ ہم نے اس لیے لکھا ہے کہ مؤلف موصوف نے رسول اللہ ﷺ کو مطاع بامر اللہ کہنے والوں

کو دیوانہ بتایا ہے۔ چنانچہ ان کی عبارت درج ذیل ہے:

''پھر مذکورہ بالا بے غلط کی جگہ منتہائے سوال کی اصطلاح قائم کی جاتی ہے۔ کیسا وہ شخص جو ابتلائی حالت میں رکھا گیا ہے اور اختیاری عقل و اجتہاد سے کام لیتا ہے؟ جسے شوریٰ کے ماتحت کام کرنے کا حکم ہے، وہ تمام وکمال کٹھ پتلی بھی نہیں ہے، ایسا بشر ہرگز ہرگز منتہائے سوال نہیں ہوسکتا۔

''ایسے نامنتہائے سوال بشروں کی تقسیم میں کوئی منتہائے سوال بھی سما سکتا ہے؟ جبکہ بے غلط اور منتہائے سوال ہونا خاصہ خداوندی ہے۔ اور خاصہ اگر دوسرے کو دیا جائے تو وہ بالغیر تو ہوگا لیکن خاصہ نہیں رہے گا۔ پس جو چیز خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے اس کی تقسیم بالذات وبالغیر میں کرنا، خدا تعالیٰ کے خاصہ کو مٹا دینا ہے۔ جب خاصہ کسی دوسرے کو دیا جاسکتا ہی نہیں تو وہ بالغیر کیسے ہوسکتا ہے؟

''حاکم دو قسم کا ہوسکتا ہے: ایک حاکم بالذات، دوسرا حاکم بالغیر۔ لیکن اصل حاکم یا احکم الحاکمین خاصہ خداوندی ہے۔ اس کی تقسیم ناجائز ہے۔ اسی طرح واجب بھی دو قسم کا ہوسکتا ہے: ایک واجب بالذات ، دوم واجب بالغیر۔ لیکن اصل واجب اور حقیقی واجب ہونا خداوند تعالیٰ کا ہی خاصہ ہے۔ اس لئے اس کی تقسیم محال ہے۔ اسی طرح مطاع بھی دو قسم کا ہوسکتا ہے: ایک مطاع بالذات، دوسرا مطاع بالغیر۔ لیکن اصل مطاع ہونا ذات باری کا خاصہ ہے۔ پس اصل مطاع کی تقسیم بالذات و بالغیر میں کرنا دیوانوں کا کام ہے۔ اصل مطاع وہ ہے جس کے علیم کل اور بے غلط ہونے کے سبب اس کے ہر قول وفعل کو کسی خارجی سند کے طلب کرنے کے بغیر صحیح اعتقاد کرنا ضروری ہو۔ یہ خداوند تعالیٰ کا خاصہ ہے، کوئی اور اس میں اس کے ساتھ شریک نہیں۔'' (تفسیر بیان للناس، ص:۵۳۶،۵۳۷)

برہان:

مؤلف مذکور نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''خاصہ خالق سے کوئی مخلوق موصوف نہیں ہو سکتی۔ بالکل صحیح ہے مگر آپ نے اپنی ''کیفیت خاصہ'' سے ہمارے معروضہ پر غور نہیں کیا جب کہ ہم نے صاف بتادیا کہ اصل مطاع دو قسم ہے، مطاع بذاتہ اور مطاع بغیرہ۔ ہم مجبور ہیں کہ منطقی اصطلاح میں اپنا مطلب واضح کریں۔ گو آپ کو تکلیف ہو۔[1]

اہل منطق بلکہ فلاسفہ بھی واجب کی دو قسمیں کرتے ہیں: ①واجب بالذات۔ ②واجب بالغیر۔ واجب بالذات خدا کو مانتے ہیں اور واجب بالغیر تمام مخلوقات کو، کیونکہ فلاسفہ کا اصول ہے کہ ''الشيء مالم يجب لم يوجد'' (کوئی شے جب تک واجب نہ ہو موجود نہیں ہو سکتی) جس طرح واجب دو قسم ہونے سے خاصہ خالق میں تغیر نہیں آتا اسی طرح اصل مطاع کو دو قسم کہنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ خرابی صرف دماغی ہے، جس کے علاج کا وقت نہیں۔

نوٹ: مطاع ہی پر کیا انحصار ہے، بہت سی صفات ایسی ہیں۔ ① حی بالذات خدا، حی بالغیر انسان وغیرہ۔ ② سمیع بالذات خدا، سمیع بالغیر کل حیوانات۔ ③ بصیر بالذات خدا، بالغیر سب حیوانات۔ ④ موجود بالذات خدا بالغیر تمام اشیاء، کہاں تک گنتے جائیں؟!

بس ہم ڈنکے کی چوٹ سے کہتے ہیں کہ اصل مطاع بالذات خدا ہے اور اصل مطاع بالغیر ذات رسالت ﷺ ہے۔ ثبوت کے لیے علاوہ آیت مرقومہ کے مندرجہ ذیل آیت پڑھیے:

---

[1] امرتسری مؤلف نے ایک مباحثہ میں منطقی اصطلاح سن کر کہا تھا کہ آپ نے مجھ پر پتھر ڈال دیا۔ اس طرف اشارہ ہے۔ [مؤلف]

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾ [الأحزاب: ٣٦]

''اللہ ورسول جب کسی امر کا حکم دیں تو کسی مسلمان مرد یا عورت کو ماننے نہ ماننے کا اختیار نہیں ہے۔''

اس آیت سے ہمارے دعوے کی صحت صاف مفہوم ہوتی ہے کہ اصل مطاع بالذات خدا ہے اور رسول بوصف الرسالت مطاع بامر اللہ ہے۔

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٤٨]

رکوع یازدہم:

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَ هُوَ

الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۝ وَ اِذْ اَخَذْنَا
مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ
اسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ
بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ۝ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ
خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝
وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ۝ وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَ مِنَ
الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ وَ مَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۝

[البقرة: ۸۷ تا ۹۶]

ترجمہ: یہ بالکل یقینی امر ہے کہ ہم (خدا) نے حضرت موسیٰ کو کتاب تورات دی جس میں چند احکام تھے جس کا مفصل ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کے بعد ہم نے کئی ایک رسول بھیجے یعنی حضرت داود، سلیمان، زکریا، یحییٰ علیہم السلام اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے معجزات دیے جو بحکم خدا ان کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے۔ اور ہم نے اس کو روح القدس کے ساتھ قوت دی کیا ہمارے بیان میں کچھ شبہ ہے؟ ہرگز نہیں کیا پھر بھی جب کبھی کوئی رسول ایسی اصلاحی تعلیم لے کر آیا جو تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے تم نے اس کے ماننے سے تکبر کیا پس نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا

اور ایک جماعت انبیاء کو تم قتل کرتے رہے لطف یہ ہے کہ ایسا کرنے والے دل میں کبھی نادم نہیں ہوئے بلکہ اس فعل قبیح کو مستحسن جانتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے دل بالکل محفوظ ہیں ان مدعیان الہام و وحی کی تعلیم وہاں نہیں پہنچ سکتی حقیقت میں یہ نہ تھی بلکہ خدا نے ان کے اعمال قبیحہ کی وجہ سے ان پر لعنت کر رکھی ہے بس اب یہ لوگ سچائی کو بہت کم مانیں گے دس بیس باتوں میں سے ایک دو مان لیں تو کیا مفید ہوسکتی ہیں یہ تو ہوئی ان کی حکایت ماضیہ، موجودہ حالت یہ ہے کہ جب ان کے پاس اللہ کی جانب سے ایک بڑی مستند کتاب (القرآن) آئی جو ان کے پاس والی کتاب تورات کے نزول کی تصدیق کرتی ہے تو اس لعنت کے اثر سے اس مستند کتاب سے بھی منکر ہوگئے حالانکہ اس سے پہلے دین الٰہی کی حفاظت کے لئے کافروں پر فتح چاہتے تھے خدا سے دعا مانگا کرتے تھے کہ ہمارے لئے کوئی والی اور ناصر دین پیدا کر پھر جب آ گیا ان کے پاس وہ ناصر دین الٰہی جس کو انہوں نے پہچان لیا تو اس سے منکر ہوگئے پس اللہ کی لعنت ہو ایسے کافروں پر جو بعد پہچاننے کے انکار کریں یاد رکھیں انہوں نے جو تبادلہ کیا ہے ان کا تبادلہ بہت برا ہے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو کفر کے ساتھ تبدیل کرلیا یعنی ہدایت چھوڑ کر گمراہی میں پھنس گئے۔ اس لئے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب (قرآن) کا انکار محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے سوا آسمانی کتاب کسی دوسرے کو کیوں ملے۔

(اہل کتاب کو رنج اس بات کا ہے کہ ان کے سوا کتاب کسی دوسرے کو کیوں ملی)

گویا اس بات پر ضد ہے کہ خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل کیوں اتارے پس اس برے خیال کی وجہ سے یہ لوگ غضب الٰہی

پر مزید غضب کے نیچے آ گئے اور ابھی ان کا انجام اور خراب ہے کیونکہ ایسے
کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے اور سنو! جب ان کو کہا
جاتا ہے کہ بھائیو! اللہ کی اتاری ہوئی کتاب قرآن پر ایمان لاؤ تو کہتے
ہیں ہم تو صرف اس کلام کو مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اس کے سوا
وہ ہر چیز سے انکار کر جاتے ہیں جن میں قرآن بھی داخل ہے حالانکہ وہ
قرآن حق ہے بلکہ ان کے پاس والی کتاب تورات کے الہامی ہونے کی
تصدیق کرتا ہے۔ تو اے رسول ان کو کہہ کہ اگر تم اپنی الہامی کتاب
کے ایسے معتقد ہو کہ اس کے سوا کسی اور چیز کو نہیں مانتے پھر تم اللہ کے
نبیوں کو پہلے زمانہ میں وقتاً فوقتاً کیوں قتل کرتے رہے۔ اگر سچے دل سے
مومن ہو تو جواب دو۔ سنو! مجھ سے بہت پہلے موسیٰ تمہارے پاس کھلے
معجزات لے کر آیا پھر بھی تم بنی اسرائیل نے اس کے بعد ایک مصنوعی
بچھڑے کو معبود بنالیا کچھ شک نہیں کہ تم اس وقت ظالم تھے ۔ تم نے
اس کی قدر نہ کی تو اب اس رسول کی کیا کرو گے۔ اور سنو! جب ہم نے
تورات پر عمل کرنے کا تم سے پختہ وعدہ لیا اور طور پہاڑ کو تم پر بلند کیا
حکم دیا کہ جو ہم نے تم کو تورات کی صورت میں دیا ہے اس کو قوت کے
ساتھ پکڑ لو ۔ یعنی دل و جان سے اس پر عمل کرو اور جو وقتاً فوقتاً حضرت موسیٰ
تم کو حکم دیں اس کو سنا کرو۔ وہ بولے صاحب جو کچھ ارشاد ہوا ہم نے سنا
اور بجائے فرمانبرداری کرنے کے ہم نے نافرمانی کی اور۔ اس کا ثبوت یہ
کہ ان کے کفر کی وجہ سے مصنوعی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں
گویا رچادی گئی ۔ تو اے رسول ان کو کہہ کہ تمہارا ایمان تم کو برا حکم دیتا
ہے اگر تم ایماندار ہو یعنی اگر تم میرا انکار مذہبی نقطہ نظر سے کرتے ہو تو

تمہارا مذہبی نقطہ نگاہ برا ہے اور اگر تم محض ضد سے ایسا کرتے ہو تو یہ اور بھی برا ہے۔ تو کہہ کہ سنو! اگر آخرت کا گھر یعنی نجات اللہ کے ہاں انسانوں میں سے صرف تمہارے ہی لئے ہے کسی اور کا حق نہیں، کیونکہ تم بزعم خود انبیاء کرام کی اولاد اور محبوب ہو تو پھر دنیا کے جھمیلے میں کیوں پھنستے ہو اگر تم اس بات میں سچے ہو تو خدا سے موت مانگو اور ہم بتائے دیتے ہیں کہ اپنے اعمال کی وجہ سے یہ لوگ ہرگز ہرگز موت نہ چاہیں گے۔ کیونکہ اپنے اعمال قبیحہ پر نظر کر کے جانتے ہیں کہ ہم مرے اور جہنم میں پڑے، مگر اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دراز مدت میں خدا کو بھول میں نہیں ڈال سکتے۔ بے شک اللہ بدکار ظالموں کو جانتا ہے۔ حیات دنیا کے ایسے خواہشمند ہیں کہ تو ان کو سب لوگوں سے زیادہ حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ دنیاوی زندگی کا خواہش مند پائے گا ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ اس کو ہزار سال کی عمر ملے حالانکہ لمبی عمر کا ملنا اس کو عذاب الٰہی سے نہیں چھڑا سکے گا۔ کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اعمال ناموں میں مرقوم ہے اور خدا تعالیٰ ان کے اعمال کو جو بھی یہ لوگ کرتے ہیں دیکھ رہا ہے۔

برہان:

پادری سلطان محمد صاحب نے اس رکوع کے ترجمہ میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ ان میں سے ایک دو غلطیاں ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

① بہت تھوڑے ایمان لاتے ہیں۔ (سلطان ص:۴۰۲) یہ ترجمہ ﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾ کا کیا ہے۔ یہ ترجمہ اس صورت میں صحیح ہوتا کہ "قلیل" مرفوع ہوتا، لیکن کلام اللہ میں مرفوع نہیں بلکہ منصوب ہے، لہٰذا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔

پادری سلطان محمد خان صاحب غالباً پادری عماد الدین کا تتبع کرتے ہیں اس لیے غلطی کر جاتے ہیں۔ پادری عماد الدین نے بھی اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''پس تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔''

② دوسری غلطی قابل ذکر یہ ہے کہ ''صرف خدا اپنی رحمت سے جس بندے پر کہ اس کو منظور ہو نازل فرمائے''۔ یہ ترجمہ ﴿اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ کا کیا ہے۔ پادری صاحب نے یہ خیال کیا کہ خدا پر لفظ ''صرف'' لانے سے فاعل میں حصر ہو جائے گا۔ لیکن یہ حصر یہاں موہم شرک ہے مثلاً کوئی کہے ''صرف پادری سلطان محمد نے تفسیر القرآن لکھی ہے۔'' اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ پادری تو بہت ہیں مگر تفسیر لکھنے والا ایک ہی ہے۔ ہاں ''صرف'' کو ﴿بَغْیًا﴾ کے ساتھ لگاتے تو صحیح ہوتا۔ یعنی محض سرکشی سے انکار کرتے ہیں۔

③ جس کو وہ خوب جانتے تھے۔ یہ ترجمہ ﴿مَا عَرَفُوْا﴾ کا غلط ہے۔ یہ ترجمہ ''کانوا یعرفون'' کا ہوسکتا ہے نہ کہ ﴿عَرَفُوْا﴾ کا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: ''جب ان کے پاس وہ کتاب آئی جسے وہ پہچان چکے ہیں۔''

نوٹ: ہم پادری صاحب کی طرح زود رنج نہیں کہ مخاطب کی ذرہ سی لغزش پر آپے سے باہر ہو جائیں اور کہہ دیں کہ ہمارے قابل خطاب نہیں۔ (النجات ۱۵/اکتوبر ۳۴ء ص:۲) نہ ہم قادیانیوں کی طرح ہیں کہ پادری سلطان محمد صاحب کی غلطیوں پر ان کو مرتد، جاہل جیسے مکروہ الفاظ سے یاد کریں۔ (الفضل ۱۵/اگست ۳۱ء) بلکہ ہمارا وہی اصول ہے جو ہر اہل علم کا ہے ''لکل جواد کبوۃ ولکل عالم ھفوۃ'' (ہر گھوڑا گرتا ہے اور ہر عالم بھولتا ہے۔)

اس رکوع میں روح القدس کا ذکر آیا ہے۔ چونکہ مسیحی عقائد میں روح القدس کسی فرشتے کا نام نہیں بلکہ تثلیث کا ایک اقنوم (حصہ) ہونے کی وجہ سے خود خدا

ہے۔ چنانچہ خود پادری صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''وہ (روح القدس) ذات الٰہی کا اقنوم ثالث یعنی خود خدا ہے۔''

(سلطان ص:۴۱۰)

اس لئے آپ نے اس امر پر خاص توجہ فرمائی ہے کہ قرآن سے ان کا مزعومہ روح القدس ثابت ہو جائے۔ کہیں کسی تفسیر کی تلاش ہورہی ہے، کہیں کسی صوفی سے ملاقات کی جارہی ہے، مگر قرآن شریف سے نہیں پوچھا جاتا کہ روح القدس سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اسی رکوع سے اگلے رکوع میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ٩٧]

''اے رسول! جبرئیل نے قرآن مجید تیرے دل پر نازل کیا ہے۔''

اس آیت میں قرآن اتارنے والا جبرئیل کو قرار دیا ہے۔ دوسری آیت میں بتبدیل الفاظ یوں فرمایا:

﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ [النحل: ١٠٢]

''اس قرآن کو روح القدس نے تمھارے پروردگار کی طرف سے اتارا ہے۔''

ان دونوں آیات کو ملانے سے صاف سمجھا گیا کہ قرآن کے محاورے میں جبرئیل اور روح القدس سے ایک ہی چیز مراد ہے، دگر ہیچ۔ ہمارا یہ ثبوت بنصوص قرآنی سن کر تو پادری صاحب یہ نہ کہیں گے:

''تمام مفسرین نے بلا تحقیق اور تدقیق اور بغیر کسی لغوی اور عقلی دلیل کے روح القدس سے جبرئیل سمجھا ہے۔'' (ص:۴۰۷)

کیونکہ ہم نے مفسرین کے قول کی دلیل قرآن شریف سے بتادی ہے۔

فاندفع ما قيل.

ناظرین! جس کتاب نے کھلے کھلے الفاظ میں فرمایا ہو:

﴿لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ﴾ [النساء: ۱۷۱]

''باپ بیٹا اور روح القدس تین معبود مت کہو۔ اس عقیدے کو چھوڑو تمھارے لیے بہتر ہوگا۔''

اس کتاب سے روح القدس بمعنی معبود ثابت کرنا کمال درجے کی جرأت ہے، جو پادری سلطان محمد خان بہادر ہی کے حصے میں آئی ہے۔ سچ ہے ؎

ترا دیدہ ورستم را شنیدہ
شنیدہ کے بود مانند دیدہ ❶

پادری صاحب نے حضرت عیسیٰ کے متعلق مرزا صاحب قادیانی کے اقوال میں اختلاف دکھایا ہے کہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ حضرت موسیٰ کے ماتحت نبیوں میں سے تھے۔ (براہین احمدیہ، ص:۳۲۹)

ایک اور کتاب میں لکھتے ہیں حضرت عیسیٰ ہرگز امتی نہیں وہ مستقل نبی تھے۔ (براہین جلد ۵) اس جگہ مرزا صاحب کے اقوال کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر محض اختلاف دکھانا مقصود ہے تو ہم بھی آپ کی تائید میں ایک بڑا وزنی اختلاف دکھا دیتے ہیں:

① مسیح خدا کا بڑا دائمی پیارا، دائمی محبوب، دائمی مقبول ہے۔
(تحفہ قیصریہ، مصنفہ مرزا ص:۲۲)

② مسیح کھاؤ پیو، شرابی، نہ زاہد، نہ عابد، متکبر، خود بین، مدعی الوہیت۔
(مکتوبات احمدیہ ''خطوط مرزا'' جلد ۳ ص:۲۳)

پادری صاحب! کچھ اور بھی چاہیے؟!

یہودی دار آخرت (نجات آخرت) اپنے لیے مخصوص جانتے تھے۔ اس رکوع

❶ تجھ کو دیکھا اور رستم کے متعلق سنا، سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے؟

میں ان کو چیلنج دیا گیا کہ اگر اس خیال میں سچے ہو تو موت مانگو تا کہ تم دنیاوی تکالیف سے چھوٹ کر دائمی راحت میں پہنچ جاؤ۔ پادری صاحب یہودیوں کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ دلیل تو ہمیں جچی نہیں کہ اگر یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی داخل ہوں گے تو خدا سے موت مانگ لیں، تا کہ جلد جلد جنت میں داخل ہوں کیونکہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے آگے یہی دلیل پیش کرے کہ اگر مسلمانی مذہب سچا ہے اور مسلمانی مذہب کے ہر ایک پیرو کے لیے جنت ہے، اور باقی مذاہب کے پیرو کافر اور جہنمی ہیں تو تم کیوں دنیا کے مصائب جھیل رہے ہو، کیوں طرح طرح کی تکالیف برداشت کر رہے ہو۔ خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمھیں فی الفور موت دے تا کہ دنیاوی جھمیلوں سے چھوٹ کر جنت کے مزے اڑاتے رہو، تو کیا مسلمان اس پر راضی ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔'' (سلطان، ص:۴۱۵)

برہان:

مجھے اگر کوئی ایسی دعوت دے تو میں ذاتی رائے سے بخوشی منظور کر لوں مگر عمل کرنے سے ایک امر مانع ہے۔ جس کا ذکر پادری صاحب کے کلام کے دوسرے حصے میں آتا ہے۔ پادری صاحب لکھتے ہیں:

''یہودیوں کے پاس اس دلیل کا بہت ہی زبردست جواب موجود ہے، وہ یہ کہ موت کی تمنا کرنا از روئے تورات مقدس سراسر ناجائز اور ممنوع ہے، کیونکہ خدا نے ہمیں اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہم بڑھیں پھولیں پھلیں اور دنیا کو آباد کریں۔ اور دیگر اقوام بلکہ روئے زمین کے لیے برکت کا باعث بنیں (پیدائش ۱:۲۸) عمر کی درازی خدا کی نعمت ہے۔ (خروج ۲:۱۲)

''اور کفرانِ نعمت سراسر گناہ ہے اس لئے ہم موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔''

(حوالہ مذکور)

برہان: تورات کے جس حوالے کا ذکر آپ نے کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''ان کو پیدا کیا اور خدا نے ان کو برکت دی اور خدا نے انھیں کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو'' الخ (پیدائش ۱:۲۸)

اس حوالے میں موت مانگنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ ایک عام انسانی حالت کا ذکر ہے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو تمنائے موت سے صاف الفاظ میں منع فرمایا گیا۔ چنانچہ حدیث صحیح کے الفاظ یہ ہیں:

"قال رسول الله ﷺ: لايتمنى أحدكم الموت، ولا يدع به من قبل أن يأتيه، إنه إذا مات انقطع عمله، وإنه لا يزيد المؤمن عمره إلا خيرا" [1] (مسلم و مشكوة باب تمني الموت)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی تم میں سے موت کی تمنا نہ کیا کرے، نہ موت کی دعا کیا کرے، پہلے اس سے کہ اس کو آئے، انسان جب مرجاتا ہے اس کی امید منقطع ہو جاتی ہے اور مومن کی عمر ہر حال میں اس کو خیر میں زیادہ کرتی ہے۔''

پادری صاحب! انصاف سے دونوں عبارتوں کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ تمنائے موت سے روکنے میں کون سی عبارت صریح بلکہ اصرح ہے؟ پھر آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ یہودی مسلمان کو کہے تو مسلمان جواب نہ دے سکے؟

نظرِ ثانی:

یہ ساری بحث اس صورت میں ہے کہ آیت کے معنی وہ کیے جائیں جو عام

[1] صحیح مسلم (٢٦٨٢)

رائے کے مطابق ہیں۔ اور اگر وہ معنی کیے جائیں جو اول المفسرین حضرت ابن عباس سے منقول ہیں تو نہ یہودی کا جواب صحیح ہوگا نہ آپ کی تائید۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کو آیت مباہلہ فرماتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر (مفسر) یہی اعتراض جو آپ نے یہود کی جانب سے کیا ہے نقل کر کے کہتے ہیں:

"أما علیٰ تفسير ابن عباس فلا يلزم عليه شيء من ذلك بل قيل لهم كلام نصف إن كنتم تعتقدون أنكم أولياء الله من دون الناس وأنكم أبناء الله وأحباؤه وأنكم من أهل الجنة ومن عداكم من أهل النار، فباهلوا على ذلك و ادعوا على الكاذبين منكم أو من غيركم" الخ

(تفسیر ابن کثیر ۱/۱۸۰، زیرآیت موصوفہ جلد اول مصری برحاشیہ فتح البیان ص:۲۱۹)

یعنی ابن عباس کی تفسیر پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ ان یہودیوں کو انصاف کی بات کہی گئی ہے کہ اگر اس بات کا اعتقاد رکھتے ہو کہ تم لوگ اللہ کے ولی ہو سب لوگوں کے ماسوا، اور یہ بھی تمھارا اعتقاد ہے کہ تم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہو اور یہ بھی یقین رکھتے ہو کہ تم ہی اہل جنت ہو اور تمھارے ماسوا سب جہنمی ہیں تو آؤ اس اعتقاد پر ہم سے مباہلہ کرلو اس مباہلہ میں جھوٹوں کی ہلاکت کی دعا کرو خواہ تم میں سے ہوں یا تمھارے غیروں سے۔"

ناظرین! اب یہ آیت آیت مباہلہ ہوئی محض یک طرفہ تمنائے موت نہ ہوئی۔ ان معنی سے تورات کا حوالہ مذکورہ بھی ان پر نہ لگے گا کیونکہ یہود سے محض موت کی تمنا کی خواہش نہیں کی گئی بلکہ جھوٹے کی تباہی پر مباہلہ چاہا گیا ہے۔ اب تو پادری صاحب دشمنان مسیح (یہود) کی حمایت نہ کریں گے۔

اس رکوع میں جو یہ لفظ آیا ہے: ﴿وَ لَمَّا جَآءَ هُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

اس کے ذیل میں امام رازی رحمہ اللہ نے اہل کتاب کی طرف سے ایک سوال پیش کر کے جواب دیا ہے اس لیے پادری سلطان محمد صاحب اس سوال کو قوی اور جواب کو ضعیف بتاتے ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''سوال بہت زبردست ہے لیکن جواب بہت کمزور ہے۔'' (سلطان ص:۴۱٦)

اس لیے ہم بھی اصل سوال و جواب پیش کر کے حقیقت حال واضح کرتے ہیں۔

المسئلة الأولى:

''یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہودی آنحضرت کی نبوت سے واقف تھے۔ اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تورات بر سبیل تواتر نقل ہوتی آئی ہے۔ لہٰذا یا تو یہ کہا جائے کہ آنحضرت کی تعریف بر سبیل تفصیل تورات میں موجود ہے یعنی یہ کہ آپ کی صورت یوں ہوگی، اور سیرت یوں ہوگی اور فلاں سال میں اور فلاں مکان میں آپ پیدا ہوں گے۔ اور یا یہ کہا جائے کہ آپ کی صفت اس طریق پر تورات میں موجود نہیں ہے۔ بس اگر صورت اول درست ہے تو گویا یہودیوں نے بحیثیت قوم تورات کی شہادت کو جان کر آنحضرت کی نبوت سے جھوٹ موٹ انکار کیا۔ لیکن یہ کس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اہل تواتر جھوٹ پر بالکل متفق ہو جائیں اور اگر آنحضرت کی صفت اس طرح نہیں تو تورات کے اوصاف سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت رسول ہوں۔ تو خدا نے یہ کس طرح کہا کہ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾

جواب:

''اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت کی صفت تورات میں اجمالی طور پر تھی، اور آنحضرت کی نبوت کو صرف ان اوصاف کی وجہ سے نہیں پہچان سکتے

تھے۔ لیکن ظہور معجزات کی وجہ سے یہ اوصاف موکد ہو گئے۔ لہٰذا خدا نے ان کی مذمت کی۔'' (تفسیر کبیر جلد اول ص:۴۰۶) (ایضا سلطان ص:۴۱۶)

برہان:

''معرفت'' کا مفہوم کلی مشکک ہے جس کا ادنیٰ درجہ مجمل علم سے حاصل ہوسکتا ہے۔ مگر امام ممدوح کی نظیر اس کے فرد کامل پر ہے اس لیے انھوں نے مجمل اخبار کے ساتھ معجزات کو بھی ملحق کر دیا۔ ورنہ ادنیٰ معرفت کے لیے مجمل پیش گوئی کافی ہے۔

سوال:

مسیحی لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح بزبان حضرت موسیٰ علیہ السلام، مسیح موعود تھے۔ وہی سوال جو امام رازی کی عبارت سے آپ نے نقل کیا ہے یہاں بھی چسپاں کر کے جواب دیجیے تاکہ مقابلہ کیا جائے کہ آپ کا جواب زور دار ہے یا امام موصوف کا؟

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھیے گا ذرہ دیکھ بھال کر

ناقص تحقیق:

ہماری تحقیق ناقص جو امام ممدوح کی تحقیق سے الگ ہے یہ ہے کہ ﴿مَا عَرَفُوْا﴾ سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ کیونکہ ﴿لَمَّا جَآءَ هُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ کی جزاء مذکور نہیں۔ ﴿وَكَانُوْا﴾ درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے آگیا ہے اس لیے دوبارہ اسی شرط کو بالفاظ دیگر اعادہ کر کے ﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا﴾ فرمایا اور ﴿كَفَرُوْا﴾ کو ان دونوں کی جزا بنا دیا۔ پس اب مضمون ہی الگ ہوگیا۔ یعنی یہودیوں نے کلام اللہ کو پہچان کر اس کا انکار کر دیا۔ یہ معنی کئی ایک آیات سے مؤید ہیں۔ فاندفع ما أورد

بارھواں رکوع:

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ
اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ وَ
مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ
وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ
اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا
مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا
لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ
اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۹۷ تا ۱۰۳]

ترجمہ: اے رسول تم کہہ دو کہ جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے یعنی اس کے

کام سے ناراض ہے کہ اس نے پیغام رسالت حضرت محمد ﷺ پر کیوں اتارا وہ یقیناً اپنا ہی کچھ کھوئے گا کیونکہ اس جبرئیل نے اس پیغام قرآن کو تیرے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے نہ کہ اپنے اختیار یا اپنی رائے سے تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں ہدایت اور خوشخبری ہے ایمانداروں کے لئے یہ تو ہے اس کتاب کا مضمون اس لئے جو کوئی اپنے وہم میں اللہ کا، فرشتوں کا اللہ کے رسولوں کا جبرئیل کا اور میکائیل کا دشمن ہے تو اس کی بھی خیر نہیں کیونکہ اللہ ایسے شریر کافروں کا دشمن ہے۔ بھلا قرآن کے آنے سے ان کو جبرئیل کی دشمنی کیوں سوجھی؟ یہ فعل تو ہمارا ہے۔ ہم (خدا) نے اے رسول! تمہاری طرف کھلے کھلے اور واضح احکام نازل کئے ہیں تاکہ تم لوگوں کو نیک و بد کی نصیحت کرو۔ خوش قسمت لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور بدکار لوگ ان سے انکار ہی کرتے ہیں ۔ان یہودیوں کا حال کچھ نہ پوچھو یہ تو اپنے مطلب کے بندے ہیں کہ وقت حاجت غلام، بعد انقضائے حاجت مفرور۔ کیا یہ بات کسی سے مخفی ہے کہ جب کبھی انہوں نے احکام کی اطاعت کا وعدہ کیا عملی صورت میں ایک فریق نے اس کو پھینک دیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر ان میں سے کسی دینی بات پر یقین ہی نہیں رکھتے ان کا یقین یہ ہے کہ مذہبی خیالات سب بناوٹی ہیں۔ اور آج کل کی بھی سن لو کہ جب ان کے پاس یہ رسول محمد عربی ﷺ اللہ کے پاس سے آیا جو ان کے ساتھ والی کتاب کے نزول کی تصدیق کرتا ہے تو بجائے طاعت کرنے کے ان کتاب والوں میں سے ایک جماعت (علماء) نے اپنی الٰہی کتاب کو پیٹھ پیچھے ایسا پھینک دیا یعنی نسیا منسیا کر دیا گویا جانتے ہی نہیں اور بجائے

کتاب اللہ کی پیروی کرنے کے ان خرافات باتوں کے پیچھے پڑ گئے جن کو
گمراہ کرنے والے بد عقیدہ بد اعمال لوگ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ حکومت
میں بطور وظیفہ اور بطور جھاڑ پھونک پڑھا کرتے تھے جس میں کفریات
بھرے ہوتے تھے۔ سلیمان کا نام سن کر یہ خیال پیدا نہ ہو کہ سلیمان بھی ان
کفریات کا قائل ہوگیا، نہیں سلیمان نے کفر کا کام نہ کیا تھا لیکن گمراہ
کنندوں نے جن کے بڑے ہاروت و ماروت [1] وغیرہ تھے انہوں نے کفر
اختیار کیا تھا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور مشہور کرتے تھے کہ یہ علم سحر
عراق کے مشہور شہر بابل میں دو فرشتے لائے تھے یعنی علم شریعت کی طرح یہ
بھی منزل من اللہ ہے حالانکہ وہ سحر بابل میں دو فرشتوں پر نہیں اترا تھا۔
بلکہ بغرض ترویج وہ ایسا کہتے تھے اور کسی شاگرد کو جادو نہ سکھاتے جب
تک یہ نہ کہہ لیتے کہ میاں ہم تو اس خرافاتی علم کی وجہ سے مبتلاء
معصیت ہیں تو اس علم کو سیکھ کر کافر مت ہو۔ یہ کہنا ان کا بھی بغرض مزید
اپنا اعتقاد جمانے کے لئے تھا تا کہ لوگ سمجھیں کہ پیر جی کو ذرہ بھی غرور نہیں۔
بس وہ لوگ ان سے وہ تعویذی علم سیکھتے جس سے وہ مرد اور عورت
میں جدائی کرا دیتے۔ یعنی اوباش لوگ اپنی شہوانی اغراض پوری کرنے کو ان
شیاطین سے استمداد کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جس کسی کو ضرر
دیتے وہ اذن الٰہی سے دیتے تھے یعنی اس کے قانون قدرت کے ماتحت
دیتے تھے خود موجد ضرر نہ تھے جیسے کوئی زہر کسی کو کھلا دے تو اس کا ضرر بھی
قانون قدرت کے ماتحت ہوتا ہے مگر فاعل ضرور مجرم ہوتا ہے، اسی طرح یہ لوگ
مبتلا گناہ ہوتے تھے، لیکن ضرر ان کلمات خبیثہ کا ماتحت قدرت ہوتا تھا وہ لوگ
ان سے (ایسا علم) سیکھتے جو ان کو ضرر دے اور نفع نہ دے۔ حالانکہ جان

[1] ہاروت و ماروت بدل من الشیاطین۔ فتح البیان [مؤلف]

چکے تھے کہ جو کوئی اس علم کو حاصل کرے اس کو آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اپنے نفسوں کو اس کے عوض عذاب میں پھنسا کر جو کچھ وہ حاصل کرتے تھے وہ برا تھا کاش وہ علم رکھتے یعنی علم پر عمل کرتے، علم رکھ کر عمل نہ کرنے والا فی الحقیقت بے علم ہے اور اگر وہ بجائے تعلیم سحر کے پختہ ایماندار بنتے اور یعنی مناکیر اور مناہی سے بچتے رہتے تو اس کا بدلہ جو اللہ کے ہاں سے ان کو ملتا وہ سب سے اچھا ہوتا کاش وہ جانتے ہوتے۔

پادری صاحب نے اس رکوع کے ترجمے میں کئی ایک غلطیاں کی ہیں۔ ترجمہ ان کا حاشیہ پر ہے [1] اور اغلاط درج ذیل ہیں:

[1] ترجمہ پادری صاحب: ''آپ ان سے کہئے کہ جو کوئی دشمن ہے جبرئیل کا سو اس نے اتارا ہے قرآن کو آپ کے دل پر خدا کے حکم سے جو تصدیق کرتا ہے آسمانی کتابوں کی جو اس کے سامنے موجود ہیں۔ اور راستہ بتانے والی اور خوشخبری دینے والی ہے ایمان داروں کے لئے (۹۷) جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے، سو اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ (۹۸) اور تحقیق ہم نے اتاری ہیں آپ کی طرف واضح دلائل جن سے کوئی انکار نہیں کرتا، مگر جو فاسق ہو۔ (۹۹) جب کبھی انہوں نے کوئی عہد باندھا تو انہی میں سے کسی نہ کسی فریق نے اس کو پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ (۱۰۰) اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی رسول آیا جو ان کی کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں تصدیق کرتا ہے تو ان اہل کتاب میں سے کسی نہ کسی فریق نے خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اس طرح کہ گویا جانتے ہی نہیں ہیں۔ (۱۰۱) اور پیروی کرتے تھے ان باتوں کی جن کا شیاطین سلیمان کی سلطنت میں چرچا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو جادوگری سکھاتے تھے، اور جو علم ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر بابل میں نازل ہوا، وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے تاوقتیکہ یہ نہ کہتے کہ ہم فتنہ ہیں۔ سو تو کافر مت ہو۔ سو ان میں سے بعضے لوگ ان دونوں میں سے ایسی سحر کی باتیں سیکھنے لگے جو شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈالتی تھیں۔ حالانکہ یہ جادوگر کسی کو جادو کے ذریعہ ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر خدا کے اذن سے اور ایسی باتیں سیکھ لیتے ہیں جو خود ان کو ضرر پہنچاتی ہیں اور ان کو نفع نہیں پہنچاتی ہیں۔ اور خود یہودی جانتے ہیں کہ جو شخص جادوگری اختیار کرے، قیامت میں ان کے لیے بہتری نہیں ہے، اور حقیقت میں بہت بری ہے، وہ چیز جس کے لیے وہ جان دے رہے ہیں۔ کاش ان کو اتنی سمجھ ہوتی۔ (۱۰۲) اور اگر وہ لوگ ایمانداری اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو خدا کے پاس ان کے لئے بہتر معاوضہ تھا۔ کاش یہ اتنی عقل رکھتے۔'' (سلطان التفاسیر ص: ۴۱۷، ۴۱۸)

۱ ''حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا'' ماضی جب حال ہو تو حرف ''قد'' کے ساتھ آتی ہے۔ ﴿مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ﴾ میں واؤ ہے قد نہیں۔

۲ ''بعضے لوگ ان ''دونوں میں سے'' ایسی سحر کی باتیں سیکھنے لگے'' یہ ترجمہ دو وجہ سے غلط ہے، ایک تو ''بعضے لوگ''۔ اور الفاظ ''دونوں میں سے'' خاص قابل غور ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعضے جادو سیکھنے والے لوگ ان دو میں سے تھے۔ مڈل اسکول کے لڑکے بھی جانتے ہوں گے کہ لفظ ''میں سے'' تبعیض کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے صاف سمجھا گیا کہ ان دو ہاروت ماروت میں سے ایک سیکھتا ہوگا۔ دوسرا سکھاتا ہوگا حالانکہ ﴿يُعَلِّمٰنِ﴾ فعل تثنیہ میں دونوں فاعل ہیں۔

۳ ''ایسی باتیں سیکھنے لگے جو شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈالتی تھیں'' یہ ''ڈالتی تھیں'' فعل مؤنث ہے۔ اور جس لفظ ﴿يُفَرِّقُوْنَ﴾ کا یہ ترجمہ ہے وہ مذکر ہے یعنی ﴿اَلنَّاس﴾۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''وہ لوگ ان (دونوں) سے ایسی باتیں سیکھتے جن کے ساتھ بیوی خاوند میں تفرقہ ڈالتے۔''

۴ ''اور ایسی باتیں سیکھ لیتے ہیں الخ'' اس لئے غلط ہے کہ آیت میں حکایت ماضی کی ہے اور ترجمہ ہذا میں زمانہ حال ہے۔

۵ ''قیامت میں ان کے لیے بہتری نہیں'' جس لفظ کا ترجمہ ''بہتری'' کیا ہے وہ ''خلاق'' ہے اس کا ترجمہ حصہ ہے۔ پس ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ ''یہ لوگ خود جان چکے ہیں کہ جو کوئی جادو کا کام کرے اس کے لئے قیامت میں کوئی حصہ نہیں۔''

۶ ''وہ چیز جس کے لیے وہ جان دے رہے ہیں'' اس لیے غلط ہے کہ ''دے رہے ہیں'' فعل ''حال'' ہے اور جس لفظ ﴿شَرَوْا﴾ کا ترجمہ ہے وہ ''ماضی'' ہے۔ اس کے آگے پیچھے سب حکایت ماضیہ ہے۔ ترجمہ کی غلطی کا اثر قرآن کی

ذات تک پہنچنے کا امکان ہوتا ہے اس لیے بعد علم ان کی اصلاح ضروری ہے۔

پادری صاحب نے اس رکوع میں بہت سا وقت اس بحث کے لیے صرف کیا ہے کہ ہاروت ماروت حسب روایت یہود (تالمود) آسمان سے اترے تھے اور ایک فاحشہ عورت پر فریفتہ ہو کر دنیا میں رہ گئے اور وہ فاحشہ آسمان پر تارا بن گئی وغیرہ۔ اس کا جواب دینا ہمارے ذمہ نہیں کیونکہ محدثین کے طریق پر یہ روایت ثابت نہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر (مفسر) کا قول ہے:

"قد روي في قصة هاروت وماروت عن جماعة من التابعين كمجاهد والسدي والحسن البصري وقتادة وأبي العالية والزهري والربيع بن أنس ومقاتل بن حيان وغيرهم، وقصها خلق من المفسرين من المتقدمين والمتأخرين وحاصلها راجع في تفصيلها إلى أخبار بني إسرائيل إذ ليس فيها حديث مرفوع صحيح متصل الإسناد إلى الصادق المصدوق المعصوم الذي لا ينطق عن الهوىٰ، وظاهر سياق القرآن إجمال القصة من غير بسط ولا إطناب، فنحن نؤمن بما ورد في القرآن على ما أراده الله تعالىٰ، والله أعلم بحقيقة الحال" (١/ ١٩٨)

"ہاروت وماروت کا قصہ ایک جماعت تابعین جیسے مجاہد اور سدی اور حسن بصری اور قتادہ اور ابو العالیہ وغیرہم سے مروی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اخبار بنی اسرائیل سے لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ کوئی حدیث مرفوع اور صحیح اور متصل اس باب میں وارد نہیں ہوئی۔ اور ہم ایمان لاتے ہیں اس قدر پر جو قرآن شریف میں اترا، اور جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔" (ابن کثیر)

اعتراض:

اس رکوع میں سب سے وزنی اعتراض پادری صاحب نے جو کیا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس یہودیوں کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ۔ تمام صحف مطہرہ کو پڑھ ڈالیے ان کی احادیث اور مفسرین کی کتابوں کو مطالعہ کیجئے آپ کو ایک جملہ بھی ایسا نہیں مل سکے گا جس کا یہ مفہوم ہو کہ یہودی یا یہودیوں کا کوئی فرقہ جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں۔'' (سلطان ص:۴۲۲،۴۲۳)

برہان:

میں کہتا ہوں اصل بات یہ ہے کہ معترض قرآن شریف کو قرآن کے الفاظ میں نہیں دیکھتے بلکہ جلدی میں قرآن مجید کو غیر معتبر روایات کے یا اپنے خیالات کے تابع کرتے ہیں۔

سنیے! قرآن شریف نے اس قول کو کسی فرقہ یا قوم کا قول قرار نہیں دیا بلکہ جملہ شرطیہ کے طور پر کہا ہے: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ [الأية] جس کا ترجمہ ہی بتلا رہا ہے کہ اس میں کسی فرقہ یا جماعت کی طرف اس خیال کو منسوب کرنا منظور نہیں بلکہ شرطیہ کلام ہے کہ جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہو۔

یہ نہیں فرمایا: ''قالت اليهود أو قالت طائفة من اليهود''

ہاں اب یہ سوال ہوگا کہ ایسا کہنے کی ضرورت کیا ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی روایات میں ایسا ملتا ہے کہ یہودیوں کے مدرسہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ گئے تو وہاں ایک شخص نے کہا جبرئیل ہمارا دشمن ہے۔[1] اس مقام پر دو صورتیں تھیں:

① ایک یہ کہ اس ایک شخص کے قول کو سب کے سر تھوپا جاتا۔ ایسا کرنا تو علاوہ بے

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۸۱)

انصافی کے زیادہ ثبوت طلب ہوتا۔

② دوم یہ کہ اس غلط خیال کو جملہ شرطیہ کی شکل میں ظاہر کیا جاتا۔ چنانچہ کمال احتیاط اور انصاف سے جملہ شرطیہ کی شکل میں اظہار ناراضگی کیا گیا۔

تمثیل:

علامہ عبدالکریم شہرستانی نے اپنی ملل میں لکھا ہے کہ کسی وقت شیعہ میں ایک فرقہ تھا جس کا یہ عقیدہ تھا کہ جبرئیل کافر ہے کیونکہ اس نے نبوت پہنچانے میں خیانت کی ہے، نبوت حضرت علی کا حق تھا، اس نے محض بد دیانتی سے محمد (ﷺ) کو دے دی۔ ''فکفروہ'' انھوں نے جبرئیل پر کفر کا فتویٰ لگایا۔[1]

آج کل کوئی سنی عالم وعظ میں کہہ دے کہ سب شیعہ یا ان میں کا کوئی گروہ جبرئیل کو خائن کہتا ہے تو اس پر سخت بار ثبوت ہوگا۔ اس لیے بطور مشروط کلام کے یوں کہیے کہ ''جو کوئی جبرئیل کو کافر کہے وہ خود کافر ہے۔'' تو ایسا کہنے والے سے یہ سوال نہ ہوگا کہ ایسا کہنے والا دنیا میں تو کوئی نہیں، اگر ہے تو بتاؤ؟ اگر کوئی شخص ایسا سوال کرے گا تو وہ سنی واعظ اس کو جواب دے گا۔ ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

نیچری معاصر:

مولوی احمد الدین امرتسری نے اس مقام میں جو مظاہرہ کیا ہے وہ قابل دید و شنید ہے۔ آپ نے ہاروت و ماروت کو ملکین سے ملا دیا ہے۔ یعنی حسب خیال یہود آپ کے نزدیک ﴿هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ﴾ ملکین سے بدل ہے۔ پھر ''ما'' کو حرف نفی کہہ کر ترجمہ مثبت کا کیا ہے جو فی نفسہٖ قابل دید ہے۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''اکثر یہود حضرت موسیٰ کو خدا سا جانتے تھے اور بالعموم نصاریٰ حضرت

---

[1] دیکھیں: الملل والنحل للشهرستاني (١/ ١٤٥)

عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ نصاریٰ کے نزدیک حضرت موسیٰ کی حکومت تمام ملائکہ پر تھی، اور یہود کے نزدیک فرشتے حضرت موسیٰ کے عجیب طور پر پیروکار تھے، ان کا خیال تھا کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء اپنے اختیار سے ملائکہ کو بلا لیتے، ان کے ساتھ صلاح مشورہ کر لیتے تھے اور اس لیے ان کی ہر بات وحی الٰہی ہوتی تھی۔ جب یہود و نصاریٰ نے قرآن پاک کا مذکورہ بالا بیان سنا تو انھوں نے کہا کہ اہل اسلام درحقیقت ملائکہ اور رسولوں کے دشمن ہیں اور ہاروت و ماروت کو جن کو ہم فرشتے سمجھتے تھے ان کے متعلق یہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ وہ دونوں جادوگر تھے۔ ﴿الْمَلَكَيْنِ﴾ میں ال عوض مضاف الیہ کا ہے۔ یعنی "علی ملکھم" یہود ہاروت و ماروت کو جو بابل میں دو جادوگر تھے فرشتے سمجھتے تھے اور کتاب اللہ کو چھوڑ کر ان کے منتروں کو یاد کرتے اور رٹتے تھے۔ جادو یقیناً باطل ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے باطل کو فرشتے نہیں لا سکتے۔ ایسے توہمات کو پھیلانے والے ضرور شیاطین تھے۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بابل میں یہود کے بناوٹی اور فرضی دو فرشتے ہیں۔ ہاروت و ماروت پر خدا کی طرف سے جادو نازل نہیں ہوا بلکہ وہ ادھر ادھر کے دوسرے شیاطین سے سیکھ کر جادوگر بنے تھے۔" (تفسیر بیان للناس ص: ۶۸۷)

برہان:

اس اقتباس میں دو فقرے قابل غور ہیں:

1. ﴿الْمَلَكَيْنِ﴾ میں (ال) عوض مضاف الیہ ہے۔
2. ما حرف نفی ہے۔ جس کی تائید مصنف کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوگی:

"شیاطین لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہود یہ بھی کہتے تھے کہ یہ جادو

بابل میں ہمارے دو فرشتوں ہاروت وماروت پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ حالانکہ یہ ان کے فرضی دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر شہر بابل میں نازل نہیں ہوا۔" (ص:٦٨٩)

برہان: یہ عبارت بھی صاف بتا رہی ہے کہ ﴿مَآ اُنْزِلَ﴾ میں ما نافیہ ہے۔ مگر ترجمہ تحت لفظ جو کیا ہے وہ بہت ہی قابل غور ہے۔ وہ یہ ہے:

﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ﴾ [البقرة: ١٠٢]

"حالانکہ سلیمان کافر نہیں تھا، ولیکن شیاطین (یعنی جادوگر) کافر تھے۔ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، حالانکہ وہ بابل میں ان کے دو (فرضی) فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کیا گیا تھا۔"

برہان: یہ ترجمہ نہ تو مصنف کی پہلی تمہید کے موافق ہے نہ قواعد عربیہ کے مطابق۔ کیونکہ ﴿وَ مَآ اُنْزِلَ﴾ معطوف ہے، جس کی دو صورتیں بتائی جاسکتی ہیں: معطوف علیہ اس کا یا تو ﴿مَا تَتْلُوْا﴾ ہے یا ﴿مَا كَفَرَ﴾۔ مگر مصنف موصوف نے اس کو "حال" بنایا ہے جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مثبت کی صورت میں "ما" موصولہ ہے اور مع اپنے صلہ کے مفرد کے حکم میں ہے، اور خبر اس کی کچھ نہیں۔ بغیر خبر جملہ نہیں ہوسکتا۔ جملہ اسمیہ ہو تو حال ہوسکتا ہے۔ اگر "ما" منفی معطوف اوپر ﴿مَا كَفَرَ﴾ کے ہے تو ترجمہ مثبت غلط ہے۔ بہر حال کسی طرح یہ ترجمہ اور تفسیر صحیح نہیں۔

اطلاع:

مصنف موصوف چونکہ سر سید احمد خان (نیچری) مرحوم کے اتباع سے ہیں اس لئے مضمون تو سارا ان کی تفسیر سے لیا مگر حق شاگردی ادا کرتے ہوئے اپنے قبضے میں

کرنے کے لیے ناحق اسے بگاڑ دیا۔ سر سید اس ﴿مَآ اُنْزِلَ﴾ کو مثبت کی صورت میں لے کر یوں ترجمہ کرتے ہیں:

”اور (یہودیوں نے) اس چیز کی (پیروی کی جس کی نسبت وہ کہتے تھے) کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر اتاری گئی ہے۔“

(تفسیر احمدی ص:۱۱۸)

تیرھواں رکوع:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ

اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۞ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ
اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ
هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرة: ١٠٤ تا ١١٢]

ترجمه: اے مسلمانو! تم ﴿رَاعِنَا﴾ [1] مت کہا کرو۔ گو تمہاری وہ مراد نہیں جو ان کم بختوں کی ہے پھر بھی کیا ضرورت ہے کہ ایسے کلمات بولو جن سے ان کی بیہودہ گوئی کا رواج ہو۔ اس لئے مناسب ہے کہ یہ چھوڑ دو اور ﴿اُنْظُرْنَا﴾ کہا کرو جو اسی کے ہم معنی ہے بہتر تو یہ ہے کہ جب تم رسول کی خدمت میں آؤ تو کچھ بھی نہ کہو بلکہ خاموش رہو اور سنتے رہا کرو اس لیے کہ بولتے بولتے انسان کو زیادہ گوئی کی عادت ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی نہ کبھی گستاخی کر بیٹھتا ہے جس کے سبب سے کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور کافروں کو نہایت دردناک عذاب ہوگا۔ بھلا یہ کیونکر نہ جلیں بھُنیں تمہاری تو دن بدن شوکت ہو اور یہ کتاب والے کافر اور مکہ کے مشرک ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ کی طرف سے کچھ بھلائی تم کو ملے اور

❶ ﴿لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ یہودی حضور اقدس (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اپنے بھڑکتے ہوئے غصہ سے جو شوکت اسلام کی وجہ سے ان کے دلوں میں جوش زن تھا آنجناب کو صریح لفظوں میں تو کچھ نہ کہہ سکتے پر کمینوں کی طرح ایک ایسا لفظ بولتے کہ جس سے عام مسلمان صاف معنی سمجھیں اور وہ اپنے دلی بغض کے مطابق کچھ اور ہی مراد لیں۔ چنانچہ انہوں نے ﴿رَاعِنَا﴾ کو اس مطلب کے لئے تجویز کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہماری طرف التفات فرمایئے اور اگر اس کو ذرا لمبا کر کے ''راعینا'' کہیں تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں ''خادم اور رکھی ہمارے'' وہ اسی طرز سے کہتے پس مسلمانوں کو یہ کلمہ کہنے سے منع کیا گیا اور اس کے بجائے ﴿اُنْظُرْنَا﴾ جو اسی کی مثل دیکھنے کے معنی میں ہے مقرر ہوا تا کہ ان کی بھی عادت چھوٹ جائے۔

یہاں معاملہ ہی دگر گوں ہے کہ تم روز افزوں ترقی پر ہو۔ اس لئے ان کو بجز دشنام دہی کے کچھ نہیں سوجھتا۔ پس گالیاں بکتے ہیں مگر یاد رکھیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے اس لئے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت خاصہ کے ساتھ مخصوص کر لیتا ہے کسی کا اُس پر نہ اجارہ ہے نہ زور کیونکہ اللہ بڑے فضل والا ہے ۔ ہمیشہ اپنے بندوں پر مناسب حال کرم بخشی کرتا ہے، یہ تو ان کی غلطی ہے کہ اسلام کی اشاعت کو اپنے لئے مضر جانتے ہیں کیونکہ ان کو اپنی قومی عزت (یہودیت) پر بڑا ناز ہے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام چونکہ ہماری قومیت کے برخلاف ہے، اس کو مٹا دے گا اس لئے اسلام کو کم درجہ جان کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی نشان قومی یا شخصی شرعی یا عرفی ہم تبدیل کریں یا بحالت موجودہ چند روز کے لئے اس کو پیچھے چھوڑ رکھیں تو پہلی صورت میں اُس سے اچھا لے آتے ہیں یا بصورت دیگر اس جیسا پس یہودیت کے آثار مٹنے سے اسلام ان کے اور سب کے حق میں بہتر ہوگا۔ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہے اور کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمینوں کی تمام حکومت اللہ ہی کو حاصل ہے وہ جو چاہے اپنی رعیت میں احکام جاری کرے اسے کوئی مانع نہیں۔ اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی والی ہے نہ مددگار ۔ جو اس کی پکڑ سے تم کو بچائے۔ تعجب ہے کہ تم لوگ ایسے زبردست مولا کے تابع فرمان نہیں ہوتے ہو۔ بلکہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے جو اس مولا نے محض تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے ایسے سوال کر کے وقت کھویا کرو۔ جیسے کہ آج سے بہت پہلے حضرت موسیٰ سے کئے گئے تھے کہ کفار کے بتوں کو دیکھ کر بنی اسرائیل جھٹ بول اٹھے کہ اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی خدا بنا دے جیسے ان کے لئے ہیں۔ اور یہ نہ

سمجھے کہ ہم تو انہیں بتوں کو چھوڑ کر اب اہل توحید بنے ہیں اور یہ عام دستور ہے کہ جو شخص کفر کو ایمان سے بدلے یعنی موحد بن کر پھر مشرک بنے تو جان لو کہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ۔کیا مسلمانو! یہ سن کر بھی تم انہیں کتاب والوں کی چال چلو گے؟ حالانکہ قطع نظر ان کی ذاتی خباثت کے تمہارے حق میں بھی خیر نہیں چاہتے بلکہ اکثر اہل کتاب بعد ظاہر ہونے حق بات کے بھی شخص اپنے حسد سے یہی چاہتے ہیں کہ بعد مسلمان ہونے کے بھی تم کو کافر بنا دیں پس ایسے لوگوں کا علاج تو یہ ہے کہ بالکل ہی انہیں چھوڑ دو اوران کا خیال بھی نہ لاؤ یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی اس کی مدد تم کو پہنچے اور تمہارا ہی بول بالا ہو۔ یہ تمہارے حاسد حسد سے مرتے رہیں۔ ہاں خدا سے ہر وقت بھلائی کی امید رکھو اس لئے کہ اللہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے ۔ایسے کام تو اس کے ہاں کچھ ان ہونے نہیں ہیں۔ پس اُسی پر بھروسہ کرو اور نماز ہمیشہ پڑھتے رہو اور زکوۃ بھی دیتے رہو اور (بھی) جو کچھ بہتری کے کام اپنے لئے آگے بھیجو گے ضرور ان کو اللہ کے ہاں پاؤ گے ۔ ہرگز ضائع نہ ہونگے نہ کسی منشی کی وجہ سے نہ کسی سپاہی کے سبب سے اس لئے کہ اللہ تمہارے کاموں کو خود دیکھ رہا ہے ۔

تعجب ہے ان یہود و نصاریٰ کے حال پر کہ تمہارے حسد میں باوجود آپس کی عداوت شدیدہ کے ایک ہو رہے ہیں۔ طرح طرح کے منصوبے باندھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جنت میں وہی جائے گا جو یہودی ہو یا عیسائی مگر مسلمان نہ ہو۔ یہ سب ان کی اپنے نفس کی خواہشیں ہیں اس پر کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بھلا آزمانے کو تو کہہ تو دے کہ اچھا اپنی دلیل تو لاؤ اگر اس دعوے میں سچے ہو۔ اس لیے کہ بلا دلیل تو کسی کی بھی سُنی نہیں جاتی ورنہ ہر ایک اپنی جگہ اپنا ہی گیت گا رہا ہے۔ ہم بتلائے دیتے ہیں

کہ کوئی ان کے پاس اس دعوے پر دلیل نہیں اور نہ یہ دعویٰ فی نفسہ صحیح ہے۔ ہاں جنت کے حقدار ہم بتلاتے ہیں جو کوئی اپنے آپ کو اللہ کے تابع کردے اور وہ اس تابعداری میں صرف زبانی جمع خرچ نہ رکھتا ہو۔ بلکہ نیکوکار فرمانبردار ہو۔ تو ایسے اشخاص کی نجات ہوگی۔ اور ان کی مزدوری اوراخلاص مندی کا بدلہ ان کے مولا کے پاس ہے ۔جس کا کسی طرح سے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم اٹھائیں گے ۔ پس چونکہ یہود ونصاریٰ بالکل اپنی خواہشوں کے غلام ہورہے ہیں جس طرف ان کی خواہش لے جائے اسی طرف چلتے ہیں۔ تو پھر کیونکر ان کو پہنچتا ہے کہ یہ دعوی کریں کہ سوا ان کے کوئی شخص بھی نجات کا مستحق ہی نہیں۔

برہان:

پادری سلطان محمد صاحب کی تفسیر یہاں تک پہنچ کر ان کا رسالہ کئی ہفتوں سے نہیں آیا۔ یاد دہانی کا جواب بھی نہیں پہنچا۔ موانع بخیر۔ ہم بھی وقفہ کرتے ہیں اور رفع موانع کے لیے دعا کرتے ہیں۔

نسخ پر بحث:

پادری صاحب نے اس رکوع کی تفسیر میں مسئلہ نسخ پر بحث کی ہے۔ پہلے سیوطی کی ''اتقان فی علوم القرآن'' سے نسخ کے متعلق بہت لمبی چوڑی تحریر نقل کی ہے۔ جس میں ممدوح نے نسخ کے معنی اور اس کی قسمیں اور علماء کے مذاہب وغیرہ نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد سرسید احمد خان مرحوم کی کتاب ''تبیین الکلام'' سے کچھ نقل کیا ہے۔ اس میں سرسید بھی نسخ کے قائل ہیں۔ اسی طرح مولانا عبدالحق دہلوی کی تفسیر حقانی سے کچھ نقل کیا ہے۔ علماءِ اسلام کے مختلف اقوال نقل کرکے پادری صاحب نے بطور نتیجہ کے جو کچھ لکھا ہے وہ تو ہم آگے لکھیں گے۔ پہلے ہم نسخ کے متعلق اپنی

تحقیق اور عقیدہ بتالیں۔

قرآن مجید کی آیت ﴿مَا نَنْسَخْ﴾ میں دو لفظ آئے ہیں۔ا۔ ننسخ۔۲۔ننس۔ کچھ شک نہیں کہ ان دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ ''نسخ'' بالکل ہٹا دینا۔ ''اِنساء'' جس کا مضارع ''ننسِ'' ہے کے معنی ہیں التواء کرنا، یعنی کسی حکم کو اگر مطلقاً اٹھا دیا جائے جو کسی خاص حالت میں جائز نہ ہو تو وہ نسخ ہے اور اگر کسی شرط سے کسی خاص حالت میں اس کی اجازت ہو تو بغیر اس شرط یا حالت کے وہ حکم ملتوی سمجھا جائے گا۔

ہم مانتے ہیں کہ قرآن مجید میں دونوں قسم کے احکام ہیں:

① نسخ کی مثال حکم صدقہ عند النجویٰ ہے: ﴿فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰكُمْ صَدَقَةً﴾ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کانا پھوسی کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ ''کانا پھوسی کرنے سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔'' جب اس کی غرض وغایت حاصل ہوگئی تو حکم منسوخ ہو گیا: ﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ الآیۃ۔

انساء کی مثالیں بکثرت ہیں: (ا) قومی ضعف کی حالت میں ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ ''ہاتھ مت ہلاؤ'' جو بوقتِ قوت حکم ﴿قَاتِلُوْا﴾ سے ملتوی ہے۔ آج ہندوؤں کے حق میں ﴿قَاتِلُوْا﴾ ملتوی ہے منسوخ نہیں۔ بوقتِ مرض حکم تیمّم سے حکم وضو ملتوی ہے۔ بوقت حیض حائضہ کو حکم صیام ملتوی ہے۔ بعد حیض حکم بحال ہے۔ ان احکام کا نسخ اور التواء عین حکمت پر مبنی ہے، مگر پادری صاحب اس سے منکر ہیں۔ لطف یہ ہے کہ انجیل قرآن سے متفق ہے مگر پادری صاحب متفق نہیں۔ چنانچہ آپ بڑی آن بان سے لکھتے ہیں:

''اگر آپ حوالات[1] بالا پر ایک غائر نگاہ ڈالیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا

---

[1] صحیح ''حوالجات'' ہے۔ [مؤلف]

کہ اس مسئلہ (نسخ) نے علماء اسلام کو کس قدر پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔[1] جس نے قرآن اور احادیث کو مد نظر رکھا ہے وہ نسخ کا قائل ہوگیا، اور جس نے مسیحیوں کے اعتراضات کو مد نظر رکھا ہے وہ اس سے منکر ہوگیا۔ لیکن جنھوں نے اس سے انکار کیا ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں صرف اعتراضات اور طعن و تشنیع سے بچنے کے لیے اپنی رائے پر قرآن شریف کی آیتوں کو توڑ موڑ کر ادھر سے ادھر چسپاں کر دیا ہے۔ وہ بھی اس طریقہ پر کہ پڑھنے والے کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔

''صحف مطہرہ میں اس مسئلہ کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو یہودی اس کے قائل ہیں اور نہ مسیحی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ ہم مسیحی مسئلہ تکمیل کے قائل ہیں، جس کو نسخ سے لگاؤ تک نہیں، میں ایک مدت تک اس پر غور کرتا رہا کہ مسئلہ نسخ اور تکمیل کو نزاع لفظی ثابت کروں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی'' (سلطان التفاسیر ص: ۴۸۸)

برہان:

علماء اسلام پریشان نہیں ہیں، ان کی اصطلاحات نہ سمجھنے والا پریشان ہوجاتا ہے کیوں ۔

سرمستاں منطق الطیر ست جامی لب ببند
جز سلیمانے نہ شاید فہم ایں گفتار را[2]

بعض علما نے قرآن مجید کی پانچ سو آیات کو منسوخ ٹھہرایا ہے لیکن ان کی اصطلاح میں نسخ کے معنی ازالہ حکم نہیں بلکہ تفسیر ہے۔[3] (اعلام حافظ ابن قیم)

---

[1] غالباً اس سے کم جتنا عیسائیوں کو مسئلہ تثلیث نے پریشان کیا۔ [مؤلف]
[2] جامی لب بند کیے پرندوں کی بولی میں سرمست ہے کہ شائد سلیمان کے سوا اس گفتگو کو کوئی نہ سمجھ سکے۔
[3] إعلام الموقعين (١/ ٣٥)

آپ نے جتنے اقوال متعلقہ نسخ نقل کیے ہیں اور ان کو پریشانی کا موجب بتایا ہے ان میں ایک یہ بھی درج کرلیں کہ قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہوگئیں۔ خیر یہ تو آپ کی پریشانی کا ایک نسخہ ہے، اصل بات یہ ہے کہ مسیحی لوگوں نے مسلمانوں کے اعتراضات سے تنگ ہوکر نسخ کی جگہ تکمیل کی اصطلاح ایجاد کی ہے۔ جس کی تفصیل مع جواب آگے آتی ہے۔ ہمارے مقابلے میں پادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ ''صحف مطہرہ میں مسئلہ نسخ کا مطلق ذکر نہیں ہے۔''

بس اب ہمارا فرض ہے کہ ہم انجیل ہی سے نسخ کا ثبوت دیں۔ حضرت مسیح نے بہت سے سابقہ احکام کو منسوخ کردیا، پس پادری صاحب بغور پڑھیں۔

پادری صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ تکمیل اور نسخ ایک نہیں۔ مگر آپ نے ان دونوں کی نہ تو تشریح کی ہے نہ ان میں فرق بتایا ہے، جو ان کا فرض تھا۔ لہٰذا یہ فرض بھی ان کی طرف سے ہم ہی ادا کریں گے۔ ان شاء اللہ

مسیحی لوگ انجیل کو تورات کی تکمیل کہتے ہیں، نسخ نہیں کہتے۔ پادری سلطان محمد صاحب نے بھی لکھا ہے کہ تکمیل اور نسخ ایک نہیں، مگر نسخ اور تکمیل کی جامع مانع تعریف نہیں کی۔ ہم ان دونوں کی تفسیر کرتے ہیں۔ مسیحی دوست غور سے پڑھیں۔

نسخ کی تعریف:

نسخ میں حکم سابق کا ازالہ ہوتا ہے یعنی منسوخ پر عمل نہیں رہتا اور تکمیل میں ازالہ حکم نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ماتحت جو ذرائع ہوتے ہیں وہ بھی روک دیے جاتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی﴾ ''زنا کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔'' اس کے علاوہ یہ ارشاد بھی ہے: ﴿يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (مومن اپنی آنکھیں نیچی رکھیں) اس حکم سے پہلا حکم ''نہی'' اٹھ نہیں گیا بلکہ پچھلا حکم پہلے کی تائید میں ہے تاکہ اس پر اچھی طرح عمل ہوسکے۔ مگر نسخ میں حکم منسوخ پر عمل نہیں رہتا۔ اس

لیے پادری صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ نسخ اور تکمیل میں نزاع لفظی نہیں۔

اب سنیے انجیلی نسخ! حضرت مسیح انجیل میں نسخ فرماتے ہیں:

''تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا کہ تو جھوٹی قسم نہ کھا بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لیے پوری کر''۔(متی ۳۵:۵)

اس کلام کے معنی یہ ہیں کہ پہلے لوگوں (یہودی وغیرہ) کو کہا گیا تھا کہ اگر اللہ کا نام لے کر قسم کھاؤ تو اس کو پورا کرو۔ مثلاً یہ کہو کہ ''خدا کی قسم میں کل تمہارا یہ کام ضرور کردوں گا۔'' تو اس کو پورا کردو یعنی قسم توڑو نہیں۔ اس کا نتیجہ صاف ہے کہ قسم اٹھانا اور حلف اٹھانا منع نہیں بلکہ اس کا توڑنا منع ہے۔ اب اس کا نسخ سنیے۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں:

''پر میں تمھیں کہتا ہوں کہ ہرگز قسم نہ کھانا''

اس ارشاد میں تو قسم کو منسوخ کیا گیا ہے کیونکہ اب اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔ عیسائی اس کو تکمیل کہتے ہیں جو صحیح نہیں ہے کیونکہ تکمیل میں اصل حکم پر بھی عمل ہوتا ہے جس کی مثال ہم بتا چکے ہیں۔

دوسری مثال ملاحظہ ہو:

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت''
(متی ۳۸:۵)

اس حکم کا مطلب صاف ہے کہ کوئی کسی کا دانت توڑ دے، بحکم حاکم وہ اس کا توڑ دے تو اس کا حق ہے۔ بلکہ شرعی حکم ہے۔ اب اس کا نسخ سنیے۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں:

''پر میں تمھیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا'' بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ (حوالہ مذکور)

اس ارشادِ مسیح نے پہلے حکم ''قصاص'' کو اٹھا دیا، اب اس کی کوئی صورت نہیں رہی، کیونکہ کوئی عیسائی حضرت مسیح اور موسیٰ علیہما السلام کے ان دونوں حکموں پر عمل نہیں

کرسکتا۔ تیسری مثال سنیے! حضرت مسیح فرماتے ہیں:

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا کہ اپنے پڑوسی سے دوستی رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔'' (متی ۵:۴۳)

اس حکم میں دشمن سے عداوت رکھنی کم سے کم جائز معلوم ہوتی ہے، یعنی دشمن کے گزند سے پرحذر رہنا سابقہ شریعت میں جائز تھا۔ اس کا ذکر کر کے حضرت مسیح فرماتے ہیں:

''پر میں تمھیں کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو۔'' (حوالہ مذکور)

یہ ارشاد مسیح سابقہ حکم ''دشمن سے دشمنی رکھنے'' کو اٹھاتا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک پر عمل ہوگا دوسرے پر نہ ہوسکے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسیح نے پہلے حکموں کو منسوخ کر دیا، یعنی ان پر عمل کرنا ممنوع قرار دیا، یہی نسخ ہے۔

کیا پادری صاحب! اب تو آپ کو صحف مطہرہ میں نسخ مل گیا؟ کیا سچ ہے ؎

نگاہ نکلی نہ دل کی چور زلف عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

سوال:

سردست ہم یہ تین مثالیں پادری صاحب کے غور کرنے کو پیش کر کے پوچھتے ہیں

١ کیا یہ صحیح ہے کہ ناسخ منسوخ میں نسبت تباین ہوتی ہے؟

٢ کیا یہ آپ کو مسلم ہے کہ موجبہ ضروریہ کی نقیض ممکنہ سالبہ ہوتا ہے؟

٣ کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ دائمہ مطلقہ کی نقیض مطلقہ عامہ ہوتا ہے؟

ان مسلماتِ منطق کے ماتحت احکام ثلاثہ سابقہ اور انجیلیہ میں کیا نسبت ہے؟

امید ہے کہ پادری صاحب ہماری پیش کردہ مثالوں پر غور کر کے نیز نسخ اور تکمیل میں فرق جان کر اپنی سابقہ رائے کو یوں تبدیل فرمائیں گے کہ ''صحف مطہرہ میں مسئلہ نسخ کا پتہ ملتا ہے'' اگر پتہ لگ جائے تو ہماری محنت کی داد دیجیے کہ ہم نے

ایک ایسی چیز آپ کو بتادی جو آج تک آپ کو نہ ملی تھی۔ سچ ہے ؎

میری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

چودھواں رکوع:

﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ
النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۞ وَ مَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا
اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي
الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ وَ لِلّٰهِ
الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ۞ وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۞ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ وَ
قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ
قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۞ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا
وَّ نَذِيْرًا وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۞ وَ لَنْ تَرْضٰى
عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى

اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ كَ
مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝ اَلَّذِیْنَ
اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ مَنْ
یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۱۳، ۱۲۱]

ترجمہ: یہود کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا کچھ ٹھیک نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا کچھ ٹھیک نہیں حالانکہ اپنے زعم میں یہ دونوں فریق اللہ کی کتاب یعنی تورات پڑھتے ہیں یہ تو بھلا تھے ہی ایسا ہی بے علم عرب کے مشرک بھی انہیں کی طرح بولتے ہیں کہ ہم ہی نجات کے حقدار ہیں سوائے ہمارے کوئی بھی نجات نہ پاوے گا جب تک کہ بُت پرستی نہ کرے گا ہرگز نجات نہ ملے گی۔ پس تم ان کے خیالات واہیات نہ سنو۔ اللہ ہی ان کے جھگڑوں میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ۔ جس کا فیصلہ آخری ہوگا۔ بھلا اور اختلاف تو ہوا سو ہوا اللہ کے ذکر میں بھی کسی کو اختلاف ہے؟ پھر کس منہ سے یہ کافر دینداری کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ مسلمانوں کو اللہ کے ذکر سے بھی روکتے ہیں۔ اور کون بڑا ظالم ہے ان لوگوں سے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کرنے سے روکتے ہیں اور ان کی خرابی میں کوشش کرتے ہیں ۔ اس لیے کہ جب ذکر والوں کو روک دیا تو پھر ان میں کون آئے گا خیر چند روزہ زور دکھالیں تھوڑے ہی دنوں بعد ان لوگوں کو قدرت نہ ہوگی کہ ان مساجد میں داخل ہوں ۔ کیونکہ اسلامی حکومت عنقریب ہونے والی ہے۔ مگر دل میں خوف زدہ ہوکر آئیں گے کہ کہیں کوئی موحد مسلمان ہم کو باہر نہ کردے۔ بلکہ دنیا میں ان کو ذلت اور رسوائی نصیب ہوگی اور قیامت میں بھی ان کو بڑا عذاب ہوگا ۔ اگر تم

کو اے مسلمانو! یہ کفار مکہ روکتے ہیں اور کعبہ میں نماز نہیں پڑھنے دیتے
تو کوئی حرج نہیں نماز ہر جگہ ہو سکتی ہے اس لئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ
ہی کا ہے پس جدھر کو منہ پھیرو گے وہیں خدا کی توجہ اپنے حال پر پاؤ
گے بے شک اللہ بڑی وسعت والا ہے ۔ اس کے ملک کی وسعت کسی دنیا
کے جغرافیہ میں محدود نہیں ہو سکتی پھر یہ بھی نہیں کہ کسی کے حال سے بے خبر ہو
یا بتلانے کی حاجت پڑے بلکہ بڑے ہی وسیع علم والا ہے اس نے تو ہر ایک
چیز کو ایک آن میں جان رکھا ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں جا سکتی تم
چاہے جنگل بیابان میں پڑھو خواہ دریا و ریگستان میں وہ سب کو جانتا ہے۔
تمہارے دلی اخلاص کے مطابق تم کو بدلہ دے گا۔ ان بے ایمانوں کے کہنے
سننے سے تم ملول نہ ہوا کرو۔ یہ تو خدا پر بھی بہتان لگانے سے نہیں رُکتے دیکھو
تو کیا کہتے ہیں کہ خدا نے بھی مثل ہمارے اپنے لیے اولاد بنائی ہے
کوئی کہتا ہے فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں کوئی کہتا ہے مسیح اور عزیر اللہ کے بیٹے
ہیں۔ حالانکہ وہ ان کی بیہودہ گوئی سے پاک ہے کوئی اس کا بیٹا بیٹی نہیں
بلکہ سب آسمان اور زمین والے اسی کے غلام ہیں یہ بھی نہیں کہ کوئی غلام
سرکشی کر سکے اور قہری حکم سے کسی طرح انکار کرے بلکہ سب کے سب اسی
کے آگے گردن جھکانے والے ہیں ۔ بھلا کیوں نہ ہو، وہ پاک ذات ایسی
قدرت والی ہے کہ آسمان اور زمین کو جو اپنی ہیئت اور مضبوطی میں اپنی نظیر
نہیں رکھتے۔ بلا نمونہ اسی نے بنایا ہے اور کمال یہ کہ جس وقت کوئی
چیز چاہتا ہے تو صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ مطلوب چیز فوراً
موجود ہو جاتی ہے اور بھلا تم ان کی باتوں سے ملال پذیر ہوتے ہو جو اتنا
بھی نہیں سمجھتے کہ ہم منہ سے کیا کہہ رہے ہیں آیا وہ امر ہو بھی سکتا ہے یا

ہماری ہی ندامت کا باعث ہے۔ سنو تو یہ بے علم ونادان عرب کے مشرک اپنی بے علمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ بھلا صاحب! یہ رسول جو خدا کی طرف سے آکر ہمیں سمجھاتے ہیں خدا ہی کیوں نہیں سامنے آکر ہم سے باتیں کرتا تا کہ ہم جلدی سے مان بھی لیں۔ یا کوئی ایسی نشانی ہمارے پاس آوے جس سے ہم جان جائیں کہ بے شک یہ سچا رسول خدا کی طرف سے ہے۔ اصل میں یہ ان کے بہانے ہیں ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کہا تھا کہ خدا ہم کو سامنے لاکر دکھاؤ تو ہم مانیں گے بغور دیکھا جائے تو اِن کے اُن کے دل بالکل ایک سے ہو رہے ہیں ایک ہی بیماری میں مبتلا ہیں، سو جو علاج ان کا ہوا تھا ان کا بھی وہی ہوگا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہر ایک شخص مرضی کے موافق نشانیاں مانگے اور پائے، اصل نشانی نبوت کی تو قائل کی صفائی ہے کہ اس کی حالت دیکھو کہ وہ کیسا ہے؟ آیا وہ دنیا ساز مکار ہے جنونی ہے یا کیا ہے؟ بے شک یہی نشانی مفید ہے سو ایسی ہم بہت سی نشانیاں ماننے والوں کے لئے بیان کر چکے ہیں جن کو ان باتوں کی تمیز ہے کہ نبوت کی بنا کن امور پر ہوا کرتی ہے سو بعد تلاش وہ تجھ میں ضرور پائیں گے اس لئے کہ ہم نے تجھ کو سچی ہدایت کے ساتھ بھلے کاموں پر خوشخبری دینے والا اور بُرے اطوار پر ڈرانے والا مقرر کر کے بھیجا ہے۔ اگر یہ نالائق تیری بات نہ مانیں تو تجھے ان کی طرف سے ہرگز ملال نہ ہو اس لئے کہ تجھے دوزخ والوں کے حال سے سوال نہ ہوگا کہ یہ کیوں دوزخ میں پہنچے۔ ہم جانتے ہیں کہ جتنے تیرے مخالف ہیں اکثر عنادی ہیں خاص کر اہل کتاب یہودی اور عیسائی جو اپنے آپ کو اہل علم جانتے ہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ ہرگز تجھ سے خوش نہ ہوں گے نہ یہودی نہ نصاریٰ یہاں

تک کہ تو ہی ان کے غلط مذہب کا پیرو بنے پس تو ان سے کہہ دے
کہ ہدایت تو اصل وہی ہے جو اللہ کے ہاں سے ہو نہ کہ تمہاری زٹلیات
کہ خدا نے اولاد بنائی اور اپنے بیٹے کو کفارہ کیا وغیر ذلك من
الخرافات. ایسے ہی لوگوں کی چال سے ہوشیار رہو اور اگر تو بھی فرضاً
بعد پہنچنے علم یقینی کے ان کی خواہش کے پیچھے چلا تو بس تیری بھی خیر
نہیں۔ سخت بلا میں تو مبتلا ہوگا تو اللہ کے ہاتھ سے چھڑانے والا نہ کوئی تیرا
حمایتی ہوگا نہ مددگار جو اس کی پکڑ سے چھڑا لے تجھے۔ ان کے انکار سے
کیوں ملال ہوتا ہے تیرے تابع تو ایسے لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب
(قرآن) دی ہے وے اس کو پڑھتے ہیں جیسا پڑھنا چاہئے۔ یہی لوگ
اس کو مانتے ہیں اور جو لوگ اس سے انکاری ہیں قیامت میں وہی ٹوٹا
پاویں گے۔ کیا ایسے عنادی بھی اس قابل ہیں کہ تو ان کو خوش کرنے کی فکر
کرے، ہرگز نہیں۔ خاص کر یہودی تو ایسی نرمی اور مداہنت سے زیادہ بگڑتے
ہیں، میں (خدا) نے جس قدر ان پر احسان کئے سب کو بھلائے بیٹھے ہیں۔''

برہان:

پادری صاحب نے اس رکوع کے ترجمے میں مندرجہ ذیل غلطیاں کی ہیں:

① ''یہود کہتے ہیں نصاریٰ کے دین میں کچھ بھی صداقت نہیں۔''

یہ ترجمہ اصل الفاظ کا نہیں بلکہ نصاریٰ کو دین سے الگ کیا گیا ہے۔ کسی بے عمل مسلمان کو کہا جائے کہ دینی حیثیت سے کسی بات میں نہیں ہے تو ایسا کہنے سے اس کی بے دینی کا ثبوت ہے نہ کہ دین اسلام کی تکذیب۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہمارے دعوے کا ثبوت ملتا ہے جہاں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَ

الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [المائدة: ٦٨]

''اے کتاب والو! تم کسی چیز پر نہیں ہو جب تک تورات اور انجیل اور ہر اس حکم پر عمل نہ کرو جو تمہاری طرف اترا ہے۔''

یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو بے عمل بتانا منظور ہے، ان کے دین کو بے حقیقت بتانا مقصود نہیں، جو پادری صاحب سمجھتے ہیں۔

② ﴿فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔'' ''وجہ'' کے معنی منہ کے بے شک ہیں مگر اس جگہ اور اس جیسے دوسرے مقامات میں خدا کا (منہ) مراد نہیں ہوتا بلکہ توجہ مراد ہوتی ہے۔ مطلب اس آیت کریمہ کا یہ ہے کہ تم لوگ جس طرف بھی منہ کر کے خدا کو پکارو اسی طرف خدا کی توجہ (بالقبولیت) پاؤ گے۔

③ ﴿وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''اللہ وسیع علم والا ہے۔''

یہ ترجمہ غلط ہے، کیونکہ آیت موصوفہ میں وسعت علم سے متعلق نہیں بلکہ وسیع اور علیم خبر بعد خبر ہے۔ وسیع الملک، وسیع الاختیار، علیم صیغہ مبالغہ ہے، یعنی بڑے اختیار والا۔

④ ﴿اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''خدا بیٹا رکھتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے: خدا نے اپنے لیے بیٹا بنایا۔

⑤ ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''اس کا ہے۔'' اتنا ہی کافی نہیں بلکہ صحیح ترجمہ یہ ہے: اس کی ملک ہے۔

⑥ ﴿اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''اور ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔'' یہ ترجمہ واو کا ہے۔ قرآن میں واو نہیں ''اَوْ'' ہے۔ صحیح ترجمہ یوں ہے: یا ہمارے پاس کیوں نشانی نہیں آتی۔

⑦ ﴿بَيَّنَّا﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''نشانیاں دکھا چکے ہیں۔'' یہ غلط ہے۔ صحیح اس طرح ہے: بیان کر چکے ہیں۔

۸ ﴿اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ”خدا کی راہ ہدایت کی راہ ہے۔“ صحیح یہ ہے: خدا کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔

اعتراضات:

پادری صاحب نے اس رکوع میں چند اعتراض کیے ہیں۔ سب سے اول وہ اعتراض کیا ہے جس کا اجمالی ذکر ہم نے پادری صاحب کے ترجمہ کی پہلی غلطی میں کیا ہے۔ یعنی پادری صاحب لکھتے ہیں:

”بے شک یہودی مسیحی مذہب کے قائل نہیں ہیں، لیکن یہ کہنا کہ مسیحی بھی یہودی مذہب کے قائل نہیں، غلط ہے۔ ہر ایک مسیحی کا یہ ایمان ہے کہ یہودی مذہب سچا مذہب ہے، ان کی کتاب ہماری کتاب ہے، ہم گرجوں میں جس طرح انجیل مقدس کی تلاوت کرتے اسی طرح ان کی کتابوں کی کرتے ہیں، البتہ ہم مسیحی یہودیوں کی قساوت قلبی کی مذمت کرتے ہیں کہ انھوں نے صحف مطہرہ کی کھلی شہادت کے باوجود ہمارے منجی کو قبول نہیں کیا۔ لیکن ان کا مذہب بالکل برحق اور ان کی کتابیں جن کو ہم عہد عتیق کہتے ہیں بالکل الہامی ہیں۔“ (سلطان التفاسیر ص:۴۹۱)

برہان:

چونکہ آپ نے ترجمہ ہی غلط سمجھا ہے اس لیے جو کچھ بھی اس پر بنا کریں گے غلط ہی ہوگا، کیوں؟ اس لیے کہ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج [1]

اصل مطلب وہی ہے جو ہم بتا آئے ہیں کہ یہودیوں کے دین کی تغلیط مقصود

[1] معمار نے جب پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی، تو تا ثریا دیوار ٹیڑھی ہی جائے گی۔

نہیں، بلکہ ان کی عملی تنقیص مراد ہے۔ ہاں پادری صاحب کا یہ کہنا غور طلب ہے کہ ہر ایک مسیحی کا ایمان ہے کہ یہودی مذہب سچا ہے۔ پادری صاحب کو یہودی مذہب سمجھنے میں غالباً غلط فہمی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہودی مذہب وہ ہے جو کتب الہامیہ میں مذکور ہے۔ نہیں بلکہ یہودی مذہب وہ ہے جو ان کے علم عقائد میں درج ہے، اس علم عقائد میں یہ جزء بھی داخل ہے:

''(معاذ اللہ) مسیح .... مولود، ملعون اور واجب القتل مقتول ہے۔''

کیا پادری صاحب ہمیں اطلاع دیں گے کہ ان کا یہ عقیدہ صحیح ہے اور ہر مسیحی کا مسلمہ ہے؟

اصل یہ ہے کہ پادری صاحب نے غور نہیں کیا۔ مذہب کا اول مخرج الہامی کتاب ہوتی ہے، مگر ثانوی درجہ میں زمانہ کے واقعات حاضرہ بھی داخل ہوجاتے ہیں۔ مثال کے لیے ہم ایک بڑے بہی خواہ مسیحیان کو پیش کرتے ہیں۔

مرزا صاحب قادیانی کی بابت مسلمانوں میں جو داخل خارج ہونے کی بحث جاری ہے آپ سے مخفی نہیں، کیونکہ قرآن و حدیث میں اثباتاً یا نفیاً موصوف کا ذکر نہیں۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ مذہب میں یہ کوئی چیز نہیں، لیکن آج جہاں کہیں احمدیت کا چرچا ہے وہاں محمدی اور احمدی مذہب میں مرزا صاحب قادیانی کو نفیاً یا اثباتاً دخل ہوتا ہے۔ یعنی محمدی مسلمان مرزا کی تکذیب داخل مذہب جانتے ہیں اور احمدی ان کی تصدیق داخل ایمان جانتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ جب تک کوئی مسلمان صریح طور پر مرزا صاحب کی مسیحیت موعودہ کا یقین نہ کرے مسلمان ہی نہیں کافر ہے۔ ادھر محمدی کہتے ہیں جو شخص ان کو مانے وہ کافر ہے۔

ٹھیک اسی طرح یہودیوں کی قساوت قلبی سے بمقابلہ عیسائی حضرات تکذیب مسیح داخل مذہب تھی، ادھر مسیحیوں کی غلطی کی وجہ سے الوہیتِ مسیح داخل ایمان ہوگئی۔

قرآن مجید چونکہ دونوں گروہوں کو راہ راست پر لانے کے لیے نازل ہوا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ ہر دو فریق کی غلطی کا اظہار کر کے دونوں کی راہ نمائی کرتا۔ اس لیے اگر ایک جگہ یوں کہتا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾

[المائدۃ: ۷۲]

''جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے وہ کافر ہیں۔''

تو دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [الزخرف: ۵۹]

''وہ مسیح ہمارا بندہ تھا ہم نے اس پر انعام کیے اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہادی بنایا۔''

پادری صاحب نے یہودیوں کی قساوت قلبی پر افسوس کیا ہے کہ انہوں نے صحف مطہرہ کی شہادت کو نہیں مانا۔ کاش پادری صاحب صحف مطہرہ کی شہادت پیش کر کے ناظرین کو فائدہ پہنچاتے۔ ہم تو سارے صحف مطہرہ میں ایک فقرہ بھی مسیحیوں کی تائید میں نہیں پاتے جس سے عیسائیوں کا عقیدہ بابت یسوع مسیح ثابت ہو سکے۔

ایک ضروری بات:

ہم پادری سلطان محمد خان صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ موقع پا کر صحف مطہرہ کی شہادات ناظرین تک پہنچائیں مگر وہی نہ ہوں جو پادری فنڈر اور پادری عماد الدین لکھ گئے ہیں۔ جن کی بابت یہ کہنا بجا ہے کہ ﴿لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ﴾ [الغاشیۃ: ۷]

پندرہواں رکوع:

﴿ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ
اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ
عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ
لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝ وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ
قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا
يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۝ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ
اَمْنًا وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ
وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ
السُّجُوْدِ ۝ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ
ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَ
بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ
اِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ رَبَّنَا وَ
اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا
مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝ رَبَّنَا
وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

[البقرة: ١٢٢ تا ١٢٩]

ترجمہ: اے بنی اسرائیل کے لوگو! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کیے کہ فرعون جیسے موذی سے تم کو چھڑایا اور تمام جہان کے لوگوں پر تم کو عزت دی کہ تم میں نبی اور رسول بھیجے پھر کیا میری شکر گذاری یہی کرتے ہو کہ میرے سچے رسول کو نہیں مانتے، بلکہ بجائے ماننے کے سب وشتم سے پیش آتے ہو۔ آخر ایک روز تو میرے سامنے آؤ گے۔ اب بھی اگر اپنی بہتری چاہتے ہو تو میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس دن کے عذاب سے بچ جاؤ جس میں کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ اور نہ اس سے بدلا لیا جاوے گا۔ اور نہ اس کو کسی کی سفارش ہی کچھ کام دے گی اور نہ ان مجرموں کو کسی زبردست کی طرف سے مدد پہنچے گی کہ ہماری پکڑ سے ان کو رہائی دلا سکے بلکہ سب کے سب اپنے ہی حال میں حیران سرگردان ہوں گے۔ تعجب ہے کہ تم نے اپنے بزرگوں کی اقتدا بھی چھوڑ دی اور ابراہیم (علیہ السلام) کی حالت کو بھی بھول گئے۔ جب کہ اس ابراہیم کو اس کے خدا نے چند باتوں کا حکم دیا پس اس بندہ کامل نے ان سب کو پورا کیا۔ پھر اس کے انعام میں خدا نے اسے کہا میں تجھ کو سب لوگوں کا امام اور پیشوا بناؤں گا۔ وہی لوگ نجات پائیں گے جو تیرے پیچھے چلیں گے وہ اپنے نیک ارادہ سے بولا یا اللہ! مجھے امام بنا اور میری اولاد میں سے بھی بعض بعض کو یہ رتبہ نصیب کر کہ وہ بھی مخلوق کی رہنمائی کریں کیونکہ اولاد کی لیاقت آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ خدا نے کہا بے شک تیری اولاد سے بھی یہ مرتبہ بعض لوگوں کو ملے گا مگر چونکہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں اس لئے ان میں بعض بدکردار بھی ہوں گے جو آپس میں ظلم وستم کریں گے پس ایسے ظالموں کو یہ میرا وعدہ نہیں پہنچے گا۔ ایسے اخلاص اور اطاعت کے سبب ہم نے ابراہیم کے نیک کاموں کو قبول کیا۔

پندرہویں رکوع کے عربی اور اردو الفاظ میں کمی بیشی ہوگئی ہے اس لئے اس کی اطلاع کرنے کو چند آیات مکرر لکھی جاتی ہیں:

﴿ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۞ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۞ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [البقرة: ۱۲۵، ۱۲۹]

ترجمہ: اور جب ہم نے ابراہیم کے بنائے ہوئے کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور بڑے امن کی جگہ بنایا اور عام طور پر حکم دیا کہ ابراہیم کی جگہ نماز پڑھو اور اس کی دعا کا کسی قدر ظہور تو اس کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا کہ ہم نے ابراہیم اور اس کے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو حکم بھیجا کہ میرا عبادت خانہ کعبہ جو تم دونوں نے بنایا ہے طواف، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجود کرنے والوں کیلئے ظاہری و باطنی نجاستوں سے صاف ستھرا رکھو۔ اس

پر بھی اس بندہ کامل نے پورا عمل کیا۔ اس کی اخلاص مندی کا ایک واقعہ اور
بھی سنو! جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے میرے مولا! اپنی مہربانی سے
اس شہر مکہ کو بڑے آرام کی جگہ بنا جس طرح اس کے ارد گرد لوٹ
کھسوٹ ہوتی ہے اس میں ایسا نہ ہو اور ابراہیم نے اپنے دل میں یہ سمجھا کہ
مثل سابق اب کی دفعہ بھی میری دعا فی الجملہ واپس نہ ہو جائے اسی لئے اس
نے بعد سوچ بچار کے ڈرتے ڈرتے یہ کہا کہ اس کے رہنے والوں کو جو
پختہ طور سے اپنے خدا کو مانیں اور پچھلے دن روز قیامت کے دن پر
یقین لاویں محض اپنی مہربانی سے عمدہ عمدہ میوے نصیب کر چونکہ یہ
درخواست ابراہیم کی کچھ ایسے مطلب کی نہیں تھی جو کسی قوم نیک یا بد سے
مخصوص ہو اس لئے کہ دنیا کا رزق حصہ رسدی سب کو ملتا ہے۔ اس لئے خدا
نے کہا ہاں بے شک ایمان داروں کو دوں گا۔ اور ان کے سوا کافروں کو بھی
دنیا میں کسی قدر نفع مند کروں گا ۔ پھر اس کے بعد ان کو عذاب کی جگہ
میں پھینکوں گا جو بہت ہی بری جگہ ہے ۔ یہ سن کر ابراہیم بہت خوش ہوا اور
اپنے کام میں مشغول رہا۔ بالکل کسی طرح سے اس کے دل میں کوئی ایسی
بات نہ آتی تھی جو اخلاص سے خالی ہو اور سنو! جب ابراہیم اور اس کا بیٹا
اسمٰعیل بیت اللہ عبادت خانہ کی بنیاد بحکم ربانی اٹھا رہے تھے تو اس
وقت بھی یہی کہتے تھے کہ اے ہمارے مولا! تو ہم سے اس کارِ خیر کو
قبول کر اس لئے کہ تو ہی ہماری باتیں سنتا ہے اور ہمارے دل کی آرزوئیں
جانتا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اپنی ترقی درجات کے لئے ہمیشہ دست
بدعا رہے کہ اے ہمارے مولا! ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا نہ صرف
ہم کو بلکہ ہم کو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو ضرور ہی اپنا

تابعدار رکھو اور اے ہمارے مولا! چونکہ ہم تیرے عاجز بندے ناقص العقل تیری رضا خود بخود دریافت نہیں کرسکتے جب تک تو ہی اپنی مرضی پر مطلع نہ کرے اسی لئے ہم عرض پرداز ہیں کہ تو ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتلا اور اگر اس بتلائے ہوئے میں کسی طرح کا ہم سے قصور واقع ہو تو ہم پر رحم فرما اس لئے کہ تو ہی بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے یہ دونوں باپ بیٹا نیک کاموں پر ایسے حریص تھے کہ علاوہ مذکورہ بالا دعا کے آئندہ کو بھی اپنی اولاد کے لئے درخواست کرتے رہے کہ اے ہمارے مولا! چونکہ بغیر کسی ہادی کے انسان کا ہدایت یاب ہونا مشکل امر ہے اس لئے گذارش ہے کہ تو ان لوگوں میں انہیں میں کا ایک رسول بھی پیدا کی جیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور تیری کتاب آسمانی کے احکام اور نیک اخلاق ان کو سکھادے اور اپنی صحبت موثرہ میں ان کو اخلاق ردیہ مثل شرک، کفر، حسد، بغض کینہ، کبر وغیرہ سے پاک صاف کرے تو ایسے بہت سے کام کرسکتا ہے۔ بے شک تو ہر کام پر غالب ہے جو چاہے کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کے بڑی حکمت والا بھی ہے جس کسی کو اس خدمت کے لائق سمجھے گا مامور کرے گا۔

اعتراض:

اس رکوع میں پادری پال صاحب نے صفحہ کے دو کالم بنا کر ایک طرف بائبل کے رسالوں کو ''صحف مطہرہ'' کے عنوان سے لکھا ہے، دوسری طرف ''قرآن مجید'' کا عنوان لکھا ہے۔ مگر غضب یہ کیا کہ سرخی تو ''قرآن مجید'' کی لکھی ہے اور بعض جگہ حوالہ حدیثی بلکہ محض کسی تفسیر کے الفاظ بھی لکھ دیے ہیں۔ مثلاً صفحہ (۴۹۷) پر لکھا ہے:

''فلما هاجر إبراهيم إلى الشام هاجر معه لوط''

أيضا ۴۹۶ تا ۵۰۱ پر ابوہریرہ کی ایک روایت مع ترجمہ لکھی ہے۔ حالانکہ اس

کے اوپر سرخی قرآن مجید لکھی ہے۔ پھر صفحہ (۵۰۵، ۵۰۶) پر تفسیر کبیر سے ایک عبارت لکھ دی۔ حالانکہ کالم پر سرخی قرآن مجید لکھی ہے۔ اس میں ہمارا تو کوئی حرج نہیں، اہل نظر میں ایسے مصنف پر بے انصافی یا بے سمجھی کا الزام عائد ہوتا ہے۔

قابل توجہ مسئلہ:

اس رکوع میں قابل بحث ضروری مسئلہ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے جس رسول کی بعثت کی بابت دعا کی ہے وہ کون رسول ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ؎

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

کیونکہ دونوں باپ بیٹا (حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام) کی اولاد سے سوائے ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی اور نہیں۔ صلی اللہ علیه وسلم

مفصل تحت آیت کریمہ۔ ان شاء اللہ:

﴿يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَ الْإِنجِيلِ﴾
[الأعراف: ۱۵۷]

امرتسری معاصر:

مولوی احمد الدین صاحب امرتسری نیچری مشرب اہل قرآن نے اس رکوع میں مسئلہ شفاعت کا ردّ کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''ان آیات میں نجات حاصل کرنے کے تمام ناجائز رستوں کی نفی کی گئی ہے اور دوسرے لوگوں کے بھروسہ اور ان کے آسروں کا خیال ہٹا کر صرف احکم الحاکمین پر ہی بھروسہ رکھنا سکھایا گیا ہے۔

''دوسرے عالم میں جب خدا تعالیٰ اصل عدالت کرنا چاہتا ہے اور سچ مچ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتا ہے، تو کیا ایسے وقت میں بھی کسی

کی سفارش کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیا خدا جیسے علیم الکل اور عادل حاکم کے دربار میں بھی کسی سفارشی کی ضرورت محسوس ہوسکتی ہے۔ کیا یوم الدین میں کسی اور کو بھی مالک بنایا جاسکتا ہے۔ کیا کسی کو خبر ہے کہ یوم الدین کسے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یوم الدین وہ ہے کہ جب کوئی نفس کسی نفس کے لیے کوئی اختیار نہیں رکھے گا اور کام سارے کا سارا اس دن اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوگا۔ (پ:۳۰:۷)

''کیا ﴿يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ وہ دن نہیں ہے جس دن ہر شخص اپنے نفس سے ہی جھگڑتا آتا ہے (یعنی نفسی نفسی پکارتا ہے) اور ہر شخص کو اس کے کاموں کا پورا پورا بدلہ دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ (پ۲۱:۱۴)

''کیا ایسے ہی دن میں کسی غیر خدا کی سفارش کی ضرورت ہے۔ کیا اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جس میں کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ الخ

''کیا اللہ تعالیٰ مومنوں کو اسی دن کے متعلق نہیں فرماتا کہ اے ایماندارو! اس دن کے آنے سے پہلے ہمارے دیے ہوئے سے خرچ کرو جس دن میں نہ کوئی (عملوں کی) خرید وفروخت ہوتی ہے۔ اور نہ کسی (انسان) کی دلی دوستی ہی کام آسکتی ہے۔ اور نہ کوئی (انسان) کسی کی سفارش کرسکتا ہے۔ اور کافر (ہی جو ایسے خیالات رکھتے ہیں، اپنی جانوں پر) ظلم کرنے والے ہیں۔ (پ۳:۲)

''قرآن مجید نے مومنوں کو مخاطب کر کے کبھی کسی انسانی شفیع کی کوئی امید نہیں دلائی، اور کہیں نہیں فرمایا کہ مومن آخرت میں کسی وقت بھی کسی شفیع کے متلاشی بنیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کافر لوگ پہلے ہی سے

شفیعوں کے قائل چلے آتے تھے اور ان پر بھروسہ رکھتے تھے اور ان کے متعلق کہتے تھے کہ ہمیں کیا پرواہ ہے جب کہ آپ جیسے ہمارے پشتی بان ہیں۔ کافر کہتے تھے: ﴿ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ﴾ [یونس:۱۸]
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ﴾ [الزمر:۴۳]
کافر لوگ آخرت میں شفیعوں کی تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ﴿فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا﴾ [الأعراف:۵۳]

''انھی کافروں کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا یہ تمھارے شفیع میرے اذن اور پسندیدگی کے بغیر سفارش کر سکیں گے۔ اگر میں نے انھیں اذن دیا ہے اور ان سے وعدہ کیا ہے۔ اور ان کی سفارش کو میں نے دل میں پسند کر لیا ہے تو بلاشبہ سفارش ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا تمھارے پاس ایسے اذن اور ایسے وعدہ کا کوئی ثبوت ہے۔ اگر ہے تو اسے پیش کرو، اور اگر میں نے کسی سے ایسا وعدہ کیا ہے تو اسے دکھلاؤ۔ جب میں کسی کو اپنے عدل کے ساتھ سزا دینے کا ارادہ کروں گا تو کیا کسی کو دخیل بنانے میں ان سے کوئی نفع حاصل ہو سکتا ہے، اور جب میں کسی معذور پر رحمت کرنا چاہوں تو کیا کوئی وہاں وعدہ سے مالک شفاعت بن سکتا ہے۔

''اس قسم کی آیات میں نفع اور مالکیت کا بھی اشارہ کیا گیا ہے، جو کسی صورت سے بھی ممکن نہیں۔ سورہ زخرف کے اخیر رکوع (پ۲۵:۱۳) میں فرمایا ہے کہ فرشتے جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں سفارش کا کوئی اختیار نہیں رکھیں گے اور کسی قسم کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔ آگے فرمایا کہ جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں وہ لوگ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ ہاں وہ خدا ہی شفاعت کا مالک ہے۔ جس نے تم کو سچی گواہی دے دی ہے کہ جن کو

یہ پکارتے ہیں ان میں سے کوئی بھی مالک شفاعت نہیں اور یہ کافر اسے اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ شفاعت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (پ۲۴:۲) خدا تعالیٰ کی رحمت ہی اس کی جناب میں معذور لوگوں کی شفاعت کرتی رہتی ہے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

نفس و شیطاں زد کریما راہ من
رحمت باشد شفاعت خواہ من [1]

''جن کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے ان کے لیے اللہ کی رحمت ہی شفیع ہے، جن کا نبیوں پر بھروسہ ہے وہ انھی کو شفیع سمجھنا چاہتے ہیں تو سمجھیں۔ لیکن وہ خود ہی انصاف کریں:

﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [الأنعام: ۸۱]

(تفسیر بیان للناس، ص:۱۹۷تا۲۱۷'')

امرتسری نیچری معاصر کا جواب بغور سنیے!

برہان: ہمارا بلکہ ہر مومن کا یہ اصل الاصول ہے کہ جو بات نص قرآن میں مذکور ہو اس کی تردید جائز نہیں، نہ ایسا کرنا کسی مومن بالقرآن کا کام ہوسکتا ہے۔ ہمارے خیال میں مسئلہ شفاعت جس خوبی سے قرآن شریف میں مذکور ہوا ہے، اگر اس میں اینچ پینچ نہ لگایا جائے تو بالکل صاف اور قابل قبول ہے، ہم نص قرآنی پیش کرکے پبلک کو اور ملائکہ کو اور خدا کو دکھانا چاہتے ہیں کہ منکرین حدیث، حدیث نبوی سے تو کھلے لفظوں میں منکر ہیں۔ قرآن شریف کو بھی اپنی مرضی کے ماتحت مانتے ہیں۔ خدا کرے ہمارے مخاطب ہماری پیش کردہ آیت کو بلا چوں و چرا مان کر ہمارا گمان غلط ثابت کردیں۔ سنیے!

ارشاد خداوندی ہے:

[1] نفس اور شیطان میری راہ زد کے ہوئے ہیں لیکن رحمت میری سفارشی ہوگئی ہے۔

﴿ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۹]

ترجمہ کرنے سے پہلے آیت موصوفہ کی ترکیب مقدم ہے۔ ﴿لَا تَنفَعُ﴾ فعل، ﴿الشَّفَاعَةُ﴾ فاعل، ﴿إِلَّا﴾ حرف استثنا ﴿مَنْ﴾ موصولہ، مستثنیٰ من المحذوف۔ تقدیر عبارت یہ ہے:

"لا تنفع الشفاعة أحدا إلا من أذن له الرحمان"

﴿لَهُ﴾ ظرف متعلق اذن کے ہے۔ پس ترجمہ ہوا:

"دار آخرت میں کسی ایک کو بھی سفارش فائدہ نہ دے گی مگر اس کو ضرور فائدہ دے گی جس کے لیے خدائے رحمٰن اجازت دے گا۔"

اس آیت نے صاف بتادیا کہ شفاعت سے نفع ہوگا اور ضرور ہوگا لیکن باذن اللہ۔ یہی معنی ہیں ان آیات کے جن کو ہمارے مخاطب نے بغیر غور وتدبر کے نقل کردیا ہے۔ "بلاشبہ شفاعت کا مالک اللہ ہے۔" پس آپ کا یہ کہنا:

"جن کا اللہ پر بھروسہ ہے ان کے لئے اللہ کی رحمت ہی شفیع ہے۔"

بالکل صحیح ہے لیکن اللہ کی رحمت کا ظہور بصورتِ شفاعت اسی طریق سے ہوگا جو پیش کردہ آیت میں مذکور ہے۔ آپ کا دوسرا فقرہ:

"جن کا نبیوں پر بھروسہ ہے وہ انھی کو شفیع سمجھنا چاہتے ہیں تو سمجھیں۔"

بظاہر غلط ہے۔ ہاں اس میں تھوڑی سی ترمیم کردی جائے تو صحیح ہوسکتا ہے۔ وہ ترمیم یوں ہے:

"جو نبیوں کو "باذن خدا" شفیع سمجھنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں۔"

اتنی ترمیم ہونے سے قرآن مجید کے موافق اور ہمارے قابل قبول ہوسکتا ہے۔ اللہ الموفق

قادیانی آواز:

مرزا صاحب قادیانی نے اس رکوع کی ایک آیت پر قبضہ کرنا چاہا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة: ١٢٦]
اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب امت محمدیہ میں بہت سے فرقے ہو جائیں گے تب آخر زمانہ میں ایک ابراہیم پیدا ہوگا اور ان سب فرقوں میں وہ فرقہ نجات پائے گا کہ جو اس ابراہیم کا پیرو ہوگا۔"

(اربعین ۳: ص ۳۲)

برہان:

مرزا صاحب کی اس ابراہیم سے مراد ذات خاص ہے۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے ؎

میں کبھی آدم کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں
نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار

(درثمین اردو)[1]

پس مطلب صاف ہے کہ اس آیت میں (بقول مرزا صاحب) موصوف کی طرف اشارہ ہے چونکہ ابراہیمی عہدہ منصب جلیل ہے اس کے لئے ثبوت بھی ہونا چاہئے۔ لہٰذا مرزا صاحب نے اس کے ثبوت میں چند الہامات لکھے ہیں جن میں سے بین الدلالۃ یہ ہے:

"لنحيينك حيوة طيبة ثمانين حولا أو قريبا من ذلك."

(حوالہ مذکور صفحہ مذکور)

یعنی ہم (خدا) تجھے (مرزا کو) ایک پاک اور آرام کی زندگی عنایت کریں

---

[1] در ثمین اُردو (ص: ١٢٣) نیز دیکھیں: براهین احمدیه (٥/ ١٠٣)

گے۔ اسّی برس یا اس کے قریب قریب یعنی دو چار برس کم یا زیادہ۔ (حوالہ مذکور)

یہ الہام ایک بین ثبوت مرزا صاحب نے اپنی ابراہیمی صفت اور منصب کے لیے دیا ہے۔ لہٰذا اسے دیکھنا ہمارا حق ہے کہ صادق ہوا یا نہیں۔ اس تحقیق کے لیے ہم کسی بیرونی شہادت کی طرف نہیں جاتے بلکہ باتباع سنت یوسفی خاندان ہی کے ایک گواہ بلکہ خود مدعی کو بھی گواہ پیش کرتے ہیں جو بقول ؎

مدعی! لاکھ پہ بھاری ہے شہادت تیری

سب سے زیادہ معتبر ہے۔ ان دو گواہوں سے مراد ایک خود مرزا صاحب مدعی ہیں۔ دوسرے فنافی المرزا حکیم نور الدین خلیفہ اول قادیان ہیں۔ ان دونوں کا بیان متفق ہے۔ حکیم نورالدین صاحب نے باعتبار کتاب البریہ مصنفہ مرزا صاحب موصوف کی عمر ۱۹۰۸ء میں، جو سنہ انتقال مرزا ہے، انہتر/۶۹ سال لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو: کتاب نورالدین بجواب ترک اسلام دھرمپال (ص: ۱۷۲) مطبوعہ فروری ۱۹۰۴ء۔

ناظرین کرام! مرزا صاحب کے الہام سے ابراہیمیت کا ثبوت جیسا کچھ ہوتا ہے آپ اسی ایک الہام سے معلوم کرسکتے ہیں۔ کہاں اسّی یا دو چار کم یا زیادہ؟ کہاں ستر سے بھی کم؟ پھر دعویٰ ابراہیمی منصب کا!!

لطیفہ:

ہماری تحقیق یہ ہے کہ (حسب تحریرات مرزا صاحب) موصوف کی کل عمر گیارہ سال ہوتی ہے۔ اس لطیفہ سے لطف حاصل کرنے کے لیے ہمارا رسالہ ''عجائباتِ مرزا'' ملاحظہ ہو۔[1]

سولہواں رکوع:

﴿ وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰھٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ اِذْ

[1] عجائباتِ مرزا (ص: ۱۸)

قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَ وَصّٰى بِهَاۤ
اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَ يَعۡقُوۡبُ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا
تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ
يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ قَالُوۡا
نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا
وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۝ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ لَهَا مَا
كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝
وَ قَالُوۡا كُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى تَهۡتَدُوۡا قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ
حَنِيۡفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝ قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ
اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ
يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰى وَ مَاۤ اُوۡتِىَ
النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَ نَحۡنُ لَهٗ
مُسۡلِمُوۡنَ ۝ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا وَ
اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ وَ هُوَ السَّمِيۡعُ
الۡعَلِيۡمُ ۝ صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً وَّ نَحۡنُ لَهٗ
عٰبِدُوۡنَ ۝ قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمۡ وَلَنَاۤ
اَعۡمَالُنَا وَ لَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ وَ نَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ۝ اَمۡ
تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطَ
كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ

كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۳۰ تا ۱٤۰]

ترجمہ: بتلاؤ تو ایسے بھلے آدمی ابراہیم کی راہ سے سوا احمقوں کے کون روگردان ہوگا جب کہ ہم نے اُس کو تمام لوگوں پر دنیا میں پسند کیا ہے اور آخرت میں بھی وہ نیک بندوں کی جماعت میں سے ہوگا۔ اگر اُس کی بزرگی میں شک ہو تو یاد کرو جب خدا نے اُسے کہا تھا کہ ہمیشہ میری تابعداری میں رہیو وہ فوراً بولا کہ حضور! میں اللہ رب العالمین کا مدت سے تابعدار ہو چکا ہوں۔ ناممکن ہے کہ اب اس دروازہ سے ہٹوں پھر وہ ایسا ہی رہا اور ابراہیم نے اور اس کی تاثیر صحبت سے اُس کے پوتے یعقوب نے اپنے بیٹوں سے وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لئے یہی توحید کا دین پسند کیا ہے پس تم مرتے دم تک اسی پر رہیو بلکہ اس[1] امر کے تو تم بھی گواہ ہو۔ یعقوب نے فوت ہوتے وقت اپنے بیٹوں سے بطور نصیحت اور آزمائش کہا تھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کروگے۔ جس سے اُس کی غرض یہ تھی کہ ان کے منہ سے نکلوا لوں کہ ہم صرف خدا کی عبادت کریں گے چنانچہ انہوں نے بھی اس کے منشا کے مطابق ہی کہا کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت کریں گے جو تیرا اور تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کا خدا ہے اور ہم تو اب بھی اُسی کے فرماں بردار ہیں یہ ایک جماعت کیسی بابرکت تھی جو اپنے وقت میں گذر

[1] ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ یہودیوں نے کہا کہ حضرت یعقوب نے فوت ہوتے وقت اپنے بیٹوں کو یہودیت کے قائم رکھنے کی وصیت کی ہوئی ہے آپ ہم کو یہودیت سے کیوں بدلاتے ہیں؟ ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ [مؤلف]

گئی صرف زبانی جمع خرچ کرنے والوں کا ان سے کیا علاقہ ان کی کمائی اُن کو نصیب ہوگی تمہاری کمائی تم کو ہے۔ تمہیں ان کے کیے سے سوال نہ ہوگا نہ ان کو تمہارے کیے کی پوچھ، تم ان سے علیحدہ، وے تم سے جدا۔ تعجب ہے کہ باوجود زبانی جمع خرچ کے یہ لوگ اپنے ہی کو ہدایت پر جانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری طرح کے یہودی یا عیسائی ہو جاؤ [1] اس سے ہدایت یاب ہو جاؤ گے گویا ان کے نزدیک سوائے یہودیت کے کوئی طریق درست نہیں تو کہہ دے کہ تمہارے زٹلیات تو ہم ہرگز نہ سنیں گے اور نہ ان پر عمل کریں گے بلکہ ہم تو حضرت ابراہیم یک رخ کے پیچھے چلیں گے اور اسی کی راہ ہم نے پکڑ رکھی ہے جو تمام نفسانی خواہشوں سے پاک وصاف ہو کر خدا کا بندہ ہو گیا تھا۔ اور وہ مشرک نہ تھا۔ جیسے کہ تم ہو۔ پس ہم تمہارے پیچھے چل کر مشرک بننا نہیں چاہتے۔ تمہارے ایسا کہنے سے اگر لوگوں میں یہ مشہور کریں کہ مسلمان توریت، انجیل کو خدا کا کلام نہیں مانتے تو تم بلند آواز سے کہہ دو کہ یہ الزام ہم پر غلط ہے سب سے پہلے ہم خدا واحد کو مانتے ہیں اور اس کتاب کو مانتے ہیں جو ہماری طرف اُتری اور اس کو بھی مانتے ہیں جو حضرت ابراہیم اور اس کے بڑے بیٹے اسمٰعیل اور چھوٹے بیٹے اسحاق اور اس کے پوتے یعقوب اسرائیل اور اس کی اولاد علیہم السلام کی طرف اتاری گئی۔

"اور خاص کر اس کلام کو مانتے ہیں جو کچھ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو خدا کے ہاں سے زندگی میں ملا تھا اور جو عموماً سب نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہم سب کو تسلیم کرتے ہیں اور بدل وجان قبول کرتے ہیں بڑی بات ہم میں یہ ہے کہ اللہ کے نبیوں میں تفریق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں

[1] ﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا﴾ یہود مدینہ اور نصاریٰ نجران دونوں مسلمانوں سے آکر جھگڑنے لگے اور ہر ایک اپنے مذہب کی طرف بلاتا تھا۔ ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ [مؤلف]

اور بعض سے انکاری ہوں جیسے تم حضرت مسیح اور سید الانبیاء محمد (علیہم السلام) سے منکر ہو اور ہم میں بفضلہٖ تعالیٰ یہ عیب بھی نہیں کہ ہم تمہاری طرح مطلب کے وقت خدا کے حکموں پر غیروں کو ترجیح دیں بلکہ ہم تو صرف اسی کے تابعدار ہیں پس بعد اس اظہار صریح کے اگر وہ تمہاری مانی ہوئی کتاب یعنی قرآن مجید کو مان لیں تو جان لو کہ ہدایت پر آگئے اور اگر حسب دستور قدیم اعراض کریں تو معلوم کرو کہ وے سخت ضدی ہیں اگر وے تجھ سے (اے رسول) کچھ اذیت کا قصد کریں تو پس خدا تجھ کو ان کی شرارت سے بچائے گا اس لئے کہ وہ تیرے مخالفوں کی سرگوشیاں اور باہمی مشورے سنتا ہے اور ان کے دلی عنادوں کو بھی جانتا ہے ان کا یہ بھی ایک داؤ ہے کہ اپنے مذہب میں لاتے ہوئے رنگ کے چھینٹے ڈالتے ہیں اور اس کو الٰہی رنگ کہتے ہیں اور عوام لوگوں کو اس دھوکہ سے کہ آؤ اس سچے رنگ سے اپنے کو رنگو دام میں لاتے ہیں سوتم ان کے جواب میں کہہ دو کہ تمہارا رنگ تو پھیکا بلکہ سرے سے کچھ بھی نہیں اصل رنگ اللہ کا ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ یعنی اس کے خالص بندے بن چکے ہیں۔ بھلا بتلاؤ تو اللہ سے کس کا رنگ اچھا ہے ؟ تمہاری طرح ہم زبانی جمع خرچ نہیں رکھتے۔ بلکہ ہم تو دل وجان سے اللہ کے حکموں کو مانتے ہیں اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں ۔

اب بھی اگر یہ اہل کتاب باز نہ آئیں اور اے رسول! تیری نبوت کو اس وجہ سے جھٹلادیں کہ تو بنی اسمٰعیل سے ہے اور ان کا خیال ہے کہ نبوت خاصہ بنی اسرائیل کا ہے۔ تو تو ان سے کہہ دے کیا تم ہم سے خدا کے فضل اور بخشش کے بارے میں جھگڑتے ہو ۔کیا نبوت کو اپنا ہی حق جانتے ہو اور ہم کو اس سے علیحدہ ہی رکھنا چاہتے ہو۔ بھلا تم میں کون سی ترجیح ہے حالانکہ بندگی میں ہم تم سب برابر ہیں۔ اور وہ ہمارا اور تمہارا سب کا مالک ہے اور اعمال میں بھی تم کو کسی قسم کی رعایت نہیں کہ اور کی کمائی تم کو مل جائے

بلکہ ہمارے اعمال ہم کو اور تمہارے اعمال تم کو جو کرے وہ بھرے، ہاں اگر غور کیا جائے تو قابل ترجیح بات ہم میں ہے کیونکہ ہم اس کے سب احکام کو مانتے ہیں اور ہم دل سے اسی کے اخلاص مند ہیں نہ کہ تمہاری طرح مطلب کے یار۔ غرض ہو تو خدا کے بن گئے، جب مطلب پورا ہوا تو پھر کون۔ یہ بھی تو ان سے پوچھو کیا تم بجائے چھوڑنے ان غلط خیالات کے یہ کہتے ہو کہ حضرت ابراہیم اور اس کے دونوں بیٹے اسمٰعیل اور اسحاق اور پوتا یعقوب علیہم السلام اور اس کی سب اولادیں تمہاری طرح یہودی یا عیسائی تھے۔ تو اے رسول! ان سے کہدے بھلا کیونکر ہم تمہاری باتیں مانیں کہ وہ ایسے تھے حالانکہ ہم کو خدا نے پختہ طور سے بتلایا ہے کہ ان بزرگوں کی یہ روش نہ تھی جو تم نے نکال رکھی ہے کیا تم خوب جانتے ہو یا اللہ خوب جانتا ہے۔ جی ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ حضرات ان جیسے نہ تھے مگر لوگوں کی شرم سے چھپاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بھی ایک قسم کی شہادت ہے اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو اپنے پاس سے اللہ کی بتائی ہوئی اطلاع کو چھپائے جو اس کے پاس ہو یقین جانو کہ خدا تم کو اس کتمان پر مواخذہ کرے گا۔ اس لئے کہ خدا تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ اصل پوچھو تو تم یہود و نصاریٰ کو ان بزرگوں سے کیا مطلب؟ یہ ایک جماعت پسندیدہ تھی جو اپنے اپنے وقت پر گذر گئی ان کی کمائی ان کو ہے اور تمہاری تم کو اور تم ان کے کئے سے نہ پوچھے جاؤ گے اور نہ وہ تمہارے کردار سے۔ تم ان سے اجنبی، وہ تم سے بیگانے، پھر بار بار ان کا نام لینے سے کیا فائدہ جب تک کہ ان کی تابعداری نہ ہو۔"

اعتراض:

رکوع نمبر (۱۶) پر پادری صاحب نے ایک چبھتا ہوا اعتراض کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بصیغۂ امر ﴿اَسْلِمْ﴾ اسلام لانے کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ یہ حکم

اس وقت ہونا چاہیے جس وقت ابراہیم مسلمان نہ ہوں۔ کیا ایسا وقت بھی ہے جس میں وہ مسلمان نہ ہوں؟ (سلطان التفاسیر ص:۵۱۸)

برہان:

جواب یہ ہے کہ صیغۂ امر دو طرح سے استعمال ہوتا ہے:

① انشاءِ فعل کے لیے۔

② استمرار کے لیے۔

مثلاً کسی بیٹھے کو کہا جائے: کھڑا ہو جا۔ یہ حکم انشاءِ فعل کے لیے ہے۔

③ کسی کھڑے کو کہا جائے: کھڑا رہ۔ یہ حکم استمرار کے لئے ہے۔

اردو اور فارسی میں ان دونوں موقعوں کے لیے الگ الگ صیغے ہیں۔ اردو کی مثال تو ابھی گذری ہے۔ فارسی میں صیغۂ امر پر لفظ ''مے ہے'' بڑھا دیا جاتا ہے: ① قائم باش۔ (۲) قائم مے باش۔

مگر عربی زبان میں صیغہ امر دونوں موقعوں کے لئے ایک ہی آتا ہے۔ جو قرینہ سے اپنے معنی بتا دیتا ہے۔ قرآن مجید سے شہادت لینا چاہو تو سنو!

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [سورة النساء: ١٣٥]

''اے لوگو! جو ایمان لا چکے ہو ایمان پر پختہ رہو۔''

اس تشریح کے بعد ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو جس وقت یہ حکم ﴿اَسْلِمْ﴾ ہوا تھا یقیناً آپ مسلم تھے۔ چنانچہ ان کا جواب بصیغہ ماضی ﴿اَسْلَمْتُ﴾ ہی بتا رہا ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے ابراہیم فرمانبرداری پر پختہ رہنا۔ حضرت ممدوح جواب میں عرض کرتے ہیں: حضور بندۂ پروردہ درگاہ تو عرصہ سے فرمانبردار ہو چکا ہے آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔

اس تشریح کے ساتھ پادری صاحب کا اعتراض یا سوال هباء منثورا ہو گیا۔

حنیف پر بحث:

دوسری بات آپ نے یہ کہی ہے کہ حنیف درحقیقت مسیحیوں کا ایک اصطلاحی لفظ ہے، جس کا اطلاق وہ راہبوں، زاہدوں اور پادریوں پر کرتے تھے۔ چنانچہ ہذیل (شاعر) کہتا ہے ؎

نصاریٰ یساقون لاقوا حنیفا

یعنی جس طرح عیسائی راہب کی ملاقات کے لیے جاتے۔ (ص:۵۱۹)

برہان:

پادری صاحب نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ کوئی لفظ اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہو کر کسی خاص اصطلاح میں استعمال ہونے سے اسی سے مخصوص نہیں ہو جاتا۔ اس کے متعلق کم سے کم کافیہ کی عبارت "فلا تضره الغلبة" کی شرح میں شارح کا کلام تو آپ کو یاد ہوگا کہ اسود اور ارقم جن معنی عام کے لیے موضوع ہیں، مروجہ معنی ان سے خاص ہیں بعینہٖ وہی نہیں۔[1]

ٹھیک اسی طرح حنیف کے معنی ہیں مائل الی اللہ۔ یہ معنی اس کے نصاریٰ کی ابتدا سے پہلے کے ہیں، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر، جو نصاریٰ سے پہلے تھے، بولا گیا۔

ناظرین کرام! اسی کی مثال ہے "مُسلم" جو آج کل محمدی دین کے ماننے والوں پر بولا جاتا ہے مگر اس کے اصلی معنی میں محمدیت داخل نہیں، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام بلکہ ان سے پہلے کے صلحاء پر بھی بولا گیا ہے۔ پس آپ نے یہ کہہ کر کہ حنیف نصاریٰ کے راہب کو کہا جاتا تھا کیا فائدہ سوچا؟ یہ غور نہ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بلکہ ان کے بعد قوم یہود پر کیوں یہ لفظ بولا گیا؟ غور سے پڑھیے!

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ﴾

[البينة: ٥]

---

[1] شرح الرضي علی الکافیة (١/ ١٢٧)

یعنی اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی عبادت اخلاص سے حنیف ہو کر کریں۔

اس آیت میں ساری یہودی قوم کو حنفاء بن کر عبادت کرنے کا ذکر ہے۔ ان حوالہ جات کے ہوتے ہوئے کون اہل علم کہہ سکتا ہے کہ پادری صاحب نے حنیف کی بابت جو لکھا ہے کچھ کارآمد اور مفید ہے؟ پادری صاحب خود ہی غور کریں ؎

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

اطلاع:

پادری سلطان محمد خان صاحب نے دو مہینوں سے تفسیر کی اشاعت بند کر رکھی ہے۔ کیونکہ رسالہ اشاعت کم ہے خرچ پورا نہیں ہوتا۔ آپ نے اعلان کیا تھا کہ مارچ اور اپریل دو ماہ یوپی وغیرہ کا سفر کر کے اشاعت بڑھائیں گے۔ اس لئے ہمارا ابھی اعلان ہے کہ پادری صاحب نے اگر تفسیر کی اشاعت کی تو ہم بھی خدمت کو حاضر ہو جائیں گے۔ والسلام خیر ختام

عبداللہ چکڑالوی کا نظریہ بابت حضرت ابراہیم علیہ السلام:

چکڑالوی اہل قرآن کی بابت ناظرین کو علم ہوگا کہ ان کو حدیث اور اہل حدیث گروہ سے ایک خاص قسم کی (گویا عاشقانہ) نسبت ہے۔ جس طرح مہجور عاشق بات بات میں موقع بے موقع معشوق کا گلہ کرتا رہتا ہے خواہ کوئی اسے سنے یا مجنون سمجھ کر نہ سنے، مگر بقول ؎

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم [1]

وہ اپنی کہے جاتا ہے اور دانا اسے معذور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کا کلام اس جگہ صرف سننے کے قابل ہے، خفا ہونے کے نہیں، کیونکہ وہ عداوتِ حدیث میں جنون کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام

[1] کوئی سنے نہ سنے میں اپنی گفتگو جاری رکھوں گا۔

کو موحد ان معنی سے لکھا ہے کہ وہ صرف کتاب اللہ المنزل کو مانتے تھے، اور ان سے شرک کی نفی ان معنی سے کی ہے کہ وہ حدیثوں کو مان کر اہل حدیث کی طرح مشرک نہ تھے۔ (جل جلالہ) آپ کے الفاظ جو قابل دیدوشنید ہیں آئندہ درج ہوں گے۔

گزشتہ سطور میں پادری صاحب سے فرصت پا کر مولوی عبداللہ چکڑالوی اہل قرآن کا ذکر کیا تھا، انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلام کے متعلق جو نکتہ آفرینی کی ہے وہ بہت ہی لطیف ہے۔ فرماتے ہیں:

''اگر بالفرض ابراہیم علیہ السلام سوائے کتاب اللہ کے کسی غیراللہ کی حدیث پر چلتے تو مشرک ہو جاتے، اور حال یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ کے ساتھ اور کسی کتاب یا قول کو شریک کرنے والے نہ تھے، اور یہ بھی تم ان کو کہہ دو کہ ابراہیم کی پیروی ہم اس طرح کرتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر یعنی قرآن مجید پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اور جو کتب ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کی گئی تھیں اور جو موسیٰ، عیسیٰ کو دی گئیں اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کے ہاں سے موہوب ہوئیں، ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں جانتے، اور ان کتابوں میں جو انبیاء کی طرف اللہ کے ہاں سے اتاری گئی ہیں، اس لئے کہ ہم خاص اسی ہی کے فرماں بردار ہیں۔ اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ابراہیم کا طریقہ وملت صرف یہی تھا کہ آپ خاص ما انزل اللہ یعنی محض کتاب اللہ المجید ہی کی پیروی کرتے تھے اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو بلاریب آپ مشرک بن جاتے، لیکن آپ ہر قسم کے شرک سے پاک ومبرا تھے، اور ہم مسلمانوں کو بھی یہی حکم ہے کہ ان کے طریقہ کی پیروی کریں یعنی ما انزل اللہ ہی پر عمل کریں ورنہ ہم بھی مشرک ہو جاویں گے، جب کہ ابراہیم سلام علیہ کی نسبت اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ اگر وہ

کتاب اللہ کے سوا کسی کتاب پر عمل کرتے تو مشرک ہو جاتے، پھر اور کسی کا کیا ذکر ہے۔

"کتاب اللہ کے مقابلہ میں انبیاء اور رسولوں کے اقوال و افعال یعنی احادیث قولی وفعلی وتقریری پیش کرنے کا مرض ایک قدیم مرض ہے، محمد رسول اللہ سلامؐ علیہ کے مقابل و مخاطب بھی قطعی اور یقینی طور پر اہل حدیث ہی تھے، کیونکہ ابراہیم ، اسمٰعیل ، اسحاق، یعقوب، موسیٰ، عیسیٰ، سلیمان وغیرہ وغیرہ رسل انبیاء سلامؐ علیہم کی احادیث قرآن مجید کے مقابلہ[1] میں پیش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء سلامؐ علیہم کی ایسی احادیث سے براءت ظاہر کی، دراں احادیث کو کفر اور شرک کہا اور رسول اللہ سلامؐ علیہ کو یہ تعلیم دی کہ تم ان کو جواب دو کہ میں ان مشرکانہ اقوال و افعال کا کیوں اتباع کروں مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ اگر میں شرک کروں تو میرے تمام عمل برباد ہو جائیں گے، جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

﴿وَاتَّبِعُوٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الآية) ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الزمر: ۵۵، ۶۵]

پس مطابق آیت ﴿وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ کے اس جگہ شرک سے خاص کتاب اللہ ہی کے ساتھ شرک کرنا مراد ہے اور اس جگہ اسی شرک کی ممانعت ہے پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے اسی طرح کسی اور

[1] مولوی عبداللہ چکڑالوی زندہ ہوتے تو ہم ان سے اس کا ثبوت پوچھتے کیا کوئی ان کا نام لیوا ہے جو اس دعویٰ کا ثبوت دے کہ زمانہ نزول قرآن کے منکر یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب قرآن کی تکذیب میں احادیث انبیاء پیش کیا کرتے تھے، ہمیں اس کا ثبوت نہیں ملا۔ ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ [مؤلف]

کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دین اسلام میں مانا جائے۔ خواہ فرضاً جملہ رسل و انبیاء کا قول یا فعل بھی کیوں نہ ہو، جس طرح مشرک فی العبادت موجب عذاب ہے اسی طرح مطابق ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (پ ۷ و پ ۱۲ ع ۱۴، ۱۵) اور ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ اور ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴾ کے شرک فی الحکم، یعنی مسائل دین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا باعث ابدی ودائمی عذاب ہے۔ افسوس ہے کہ شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں۔'' (ترجمۃ القرآن ص: ۹۷، ۹۸)

ناظرین کرام! یہ ہے وہ عشق جو مجنوں کو لیلیٰ سے تھا جو جنون کے درجے تک پہنچ جانے کے سبب جنگل کی ہرنیوں کو بھی لیلیٰ سمجھ کر پوچھتا ہے ؎

بالله يا ظبيات القاع قلن لنا
أليلاي منكن أم ليلىٰ من البشر

''جنگل کی ہرنیو! قسم کھا کر بتاؤ کہ لیلیٰ تم میں سے ہے یا انسانوں میں سے؟''

مولوی صاحب کو حدیث اور اہل حدیث سے چونکہ کمال درجہ کا بغض تھا اس لیے ہر قسم کی برائی ان کو انھیں میں نظر آتی تھی۔ کیوں ؎

نظروں میں میری تو ایسا سمایا
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

امرتسری معاصر:

امرتسری معاصر نے آیہ کریمہ ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''سو اگر یہ اس کی مثل کو مانیں جیسے تم نے مانا ہے تو انہوں نے ہدایت پالی۔''

(بیان للناس ص: ۲۳۷)

برہان:

یہ ترجمہ عربی علم ادب اور قرآنی محاورے کے خلاف ہے۔ ایسے موقع پر مثل کا لفظ تحسین کلام کے لیے ہوتا ہے۔ عرب کا مشہور شاعر امرؤ القیس کہتا ہے۔

إلى مثلها يرنو الحليم صبابة
إذا ما اسبكرت بين درع ومجول ❶

قرآن مجید میں بھی یہی محاورہ ہے۔ غور سے سنیے!

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

خدا کی مثل جیسا یعنی خدا جیسا کوئی نہیں۔

پس معاصر موصوف کا ترجمہ عربی علم ادب بلکہ خود قرآن مجید کے خلاف ہے۔

اطلاع:

چونکہ پادری سلطان محمد خان صاحب کی طرف سے تفسیر القرآن کا مضمون تین مہینوں سے نہیں آیا، اس لیے سر دست دونوں صفحات اکمل البیان کو دیے جاتے ہیں تا کہ یہ جلد ختم ہو۔ (اہلحدیث امرتسر ۲۷/ صفر ۱۳۵۴ھ مطابق ۳۱/ مئی ۱۹۳۵ء ص: ۱۱) ❷

---

❶ ایسی محبوبہ کی طرف سمجھدار آدمی بھی محبت سے جھکتا ہے جب اوڑھنی اور دوپٹہ لے کر سیدھی ہوتی ہے۔ (دیوان امرؤ القیس، ص: ۵) اس شعر میں مثل کا لفظ زائد ہے۔

❷ مراجعہ تمام شد۔ اسعد اعظمی۔ یوم الجمعۃ. ۳/ محرم ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۰/ دسمبر ۲۰۱۰ء

ضربات المؤمنين على هفوات المسلمين

دفاعِ سُنّت

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

